فتح مبین

بار سوئم	مارچ ۱۹۹۲ء
تعداد اشاعت	ایک ہزار
مطبع	بک پرنٹرز، لاہور
باہتمام	مینجنگ ٹرسٹی، امامیہ مشن
کتابت	فیاض اینڈ سنز ۔ مچھلی مارکیٹ اُردو بازار ۔ لاہور
قیمت	قیمت ایک سو بیس روپے

ناشر
مکتبہ امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ
محافظ پلازہ، ۲۸ ۔ نیو انار کلی، لاہور

انتساب

اپنے بھائی اور محسن

الحاج السید ابو محمد صاحب جے پی

صدر شیعہ اثنا عشری جماعت بمبئی

کی خدمت میں

جن کی محبت اور شفقت کا سہارا

پاکر میں یہ کتاب مکمل کر سکا

از

ذاکر حسین فاروقی

عرض ناشر

ہماری انمول پیش کش "فتح مبین" کا تیسرا ایڈیشن آپ کے زیر نظر ہے۔ فاضل قلمکار ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی ایم اے۔ پی ایچ ڈی کی ذات گرامی علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ وہ امامیہ مشن پاکستان کے ان خاص قلمی معاونین میں سے ہیں جو ہمیشہ بے لوث قلمی اعانت فرماتے رہتے ہیں۔ ہمیں ممدوح کے دو عظیم شاہکار "دینیات" (پانچ حصوں میں) اور "تشہید اعظم" شائع کرنے کی سعادت حاصل ہے۔

کچھ عرصے سے ہم یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں کہ پاکستان میں ایک نیا فتنہ بڑی تیزی کے ساتھ پروان چڑھ رہا ہے جو بنی امیہ کی حمایت میں تحریری اور تقریری "جہاد" میں مصروف ہے۔ کسی بھی شخص کو جبر و اکراہ کے ساتھ اس کے عقیدے سے باز نہیں رکھا جا سکتا ــــــ خاندان بنی امیہ کے ثنا خوانوں کو اس کام کی جزا و سزا تو بارگاہ ایزد متعال سے عطا ہوگی، لیکن اس بات کا قلق ضرور ہوتا ہے کہ بنی امیہ کے مدح خواں تحقیق کے نام پر تاریخ کو مسخ کر کے پیش کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہیں۔ ہم سرکار محمدؐ و آل محمدؐ کے نام لیوا ہونے کی وجہ سے یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ تصویر کا صحیح رخ بھی پیش کرتے رہیں تاکہ گمراہی نہ پھیلنے پائے۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے روایت و درایت کے ساتھ بنی امیہ کے مقابلہ میں آل محمدؐ کی فتح مبین کو قلم کی پوری توانائیوں کے ساتھ اس دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے کہ آل محمدؐ کے کردار کی عظمت و لازوال فتح کا اقرار کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا۔ آپ یقیناً اس کتاب کو پڑھ کر محظوظ ہوں گے۔

ناشر
سید انصار حسین نقوی
ایم۔ اے

پیش لفظ

آل رسولؐ کا دربار بہت بڑا دربار ہے۔ میں نے اسی دربار میں حاضر ہو کر معرفت و بصیرت کی بھیک مانگی، جو کچھ بطور ارباب نظر کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ یہ فیض ہے اسی سرکار کا۔ اس میں میرا کوئی کارنامہ نہیں!

مجھے اپنی کوتاہیوں اور کم علمی کا اعتراف ہے اس لئے میں قارئین سے بصد ادب یہ درخواست کروں گا کہ میری غلطیوں سے چشم پوشی فرمائیں اور اگر کوئی کام کی چیز مل جائے تو بارگاہ آل رسولؐ میں میرے لئے شفاعت کی دعا فرمائیں۔

نیاز کیش:

غلام قلمان علی

ڈاکٹر حسین فاروقی

ایم اے پی ایچ ڈی

اسلام کی جدوجہد کرنے پر تیار تھے اور نہ رجعت پسندوں کے مقابلہ میں لب کشائی کی جرات رکھتے تھے۔ یہ طبقہ ابو موسیٰ اشعری اور ان کے امثال کا تھا جو کھڑے رہنے کے مقابلہ میں بیٹھنے کو، اور بیٹھنے کے مقابلہ میں لیٹنے کو اور لوہے کی تلوار کے مقابلہ میں لکڑی کی تلوار کو ترجیح دینے لگے تھے۔

۴۔ زر پرست اور مفاد پرست طبقہ جسے حق و باطل کی کسی اصولی کشمکش سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ان کو صرف اپنے ذاتی اقتدار اور حصول دولت سے دلچسپی تھی۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اسلام کا کیا حشر ہوتا ہے۔ ان کی ساری جدوجہد کا مرکز خود ان کی ذات تھی۔ طلحہ و زبیر وغیرہ اسی طبقہ کے لوگ تھے جن کو کوفہ اور بصرہ کی گورنری حاصل نہیں ہوئی تو وہ اس کا لحاظ کئے بغیر کہ دمشق کے گوشوں سے اسلام کے خلاف ایک زبردست طوفان اٹھ رہا ہے۔ امیرالمومنینؑ کے مقابلہ میں صف آرا ہو گئے۔ ان کا یہ اقدام بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ ان کو اسلام کی زندگی اور موت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور ان کی ساری سرگرمیوں کا محور خود ان کا ذاتی اقتدار اور نفع تھا۔

۵۔ اسلامی انقلاب کے دشمن رجعت پسند عناصر جو پرانے جاہلی نظام کو واپس لانے کے خواہش مند تھے اور امیر معاویہ کی سرکردگی میں شام کو اپنا سب سے طاقتور مورچہ بنا چکے تھے، امیر معاویہ وہی بزرگ تھے جو بدر و احد و احزاب وغیرہ میں اپنے والد ابوسفیان کے ساتھ پیغمبر اسلامؐ کے مقابلہ میں صف آرا ہو چکے تھے اور اسلامی تحریک انقلاب کو مٹا ڈالنے کا وہی جذبہ اپنے دل کے اندر رکھتے تھے جو خود ان کے والد اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد کے دلوں میں موجزن تھا۔

خلافت عثمانی کا خاتمہ ہوتے ہی رجعت پسند اور انقلاب دشمن طبقہ کے سامنے

عرضِ ناشر

اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان اللعین الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی اشرف الانبیاء والمرسلین شفیع المذنبین وخاتم النبیین سیدنا ومولانا ابی القاسم محمد وآلہ الطاہرین ؏

نسلِ انسانی کی تاریخ معرکۂ حق و باطل کی تاریخ ہے۔ [illegible] کی تاریخ پیچھے [illegible] ہے [illegible] اور [illegible] لئے [illegible] عبرت بنا رہا ہے بلکہ اسی کے نتیجے میں [illegible] کے لیے [illegible] حق و باطل کی [illegible] ایک [illegible] اللہ [illegible] مصائب کا سامنا کرنا پڑا [illegible] توڑے گئے جن [illegible] گردش پر ہو جاتی ہے [illegible] چمک دمک، خدم و حشم [illegible] عساکر کی ہیبت و سطوت، [illegible] شمشیروں کی آتش [illegible] ظلم و جور کے [illegible] اور اکثریت کا زور [illegible] حاصل رہا۔ خالص مادی اعتبار سے ان دونوں متحارب قوتوں میں ایک عظیم فرق موجود رہا اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کے ٹکراؤ کی تاریخ کبھی صحیح روشنی میں نہیں لکھی جا سکی۔ [illegible] کبھی [illegible] نہیں کئے جا سکے اور نسلِ انسانی ان حقائق سے کبھی پورے طور پر آگاہ نہیں ہو سکی۔ جو اس عظیم ٹکراؤ کے نتیجے میں اسے معلوم ہونا چاہیے تھے۔

[illegible] حسین [illegible]

[illegible]

مورخین کی اس غلطی سے نسل انسانی کو بے حد نقصان پہنچا۔ اگر وہ ایک ذرا سی باریک بینی سے کام لیتے اور حق کی فتح مبین کا ادراک کرتے ہوئے اس کا اعلان کر دیتے تو شاید نسل انسانی کی تاریخ آج سے بالکل مختلف ہوتی اور دنیا وہ نہ ہوتی جو آج ہے۔

جب لوگ یہ دیکھ لیتے کہ حق والے اقلیت میں رہتے ہوئے بے سرو سامانی کی زندگی بسر کرتے ہوئے دولت و عساکر کی قوتوں سے محروم رہتے ہوئے سلطنت کے جاہ و جلال سے بے پروائی برتتے ہوئے مادی وسائل اور ظاہری اسباب جنگ کے اعتبار سے بے حد کمزور ہوتے ہوئے ہر معرکہ میں باطل کو دندان شکن شکست دیا کرتے ہیں۔ اس کے غرور اور طنطنہ کو خاک میں ملا سکتے ہیں تو ان میں حق پسندی کے عزائم ابھرتے' سچائی پر قائم رہنے کی ہمت پیدا ہوتی' اعلیٰ اقدار انسانی کی خاطر قربانیاں دینے کی قوت ابھرتی اور باطل کے مقابلہ میں سینہ سپر رہنے کی وہ طاقت موجود رہتی جس کے نتیجہ میں دنیا سے باطل کا وجود ہی ختم ہو جاتا۔ لیکن نسل انسانی کا پرانا دشمن شیطان بھی اس خطرے سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر عام انسانوں نے یہ حقیقت جان لی کہ مٹھی بھر بے سرو سامان انسان محض عزم و ہمت کے سہارے بار بار باطل کو شکست دے چکے ہیں تو تمام انسان پوری جرات کے ساتھ حق کے پرچم تلے متحد ہو جائیں گے اور اس اتحاد انسانی کے نتیجہ میں دنیا سے باطل یا شیطنت پرستی کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ اس لئے شیطان نے انسانوں کو یہ یقین دلانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ فتح کے پرچم ہمیشہ باطل کے نام پر لہرائے جاتے ہیں۔ قوت' سطوت' عظمت' شوکت اور دولت صرف باطل کے خزانہ میں نظر آتی ہیں۔ حق ہمیشہ ذلت و مسکنت کا شکار رہتا ہے۔ حق پسند صرف مرنے یا تباہ ہونے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا مقسوم صرف شکست اور بربادی ہے اور کامرانی و ظفرمندی کے پرچم صرف باطل کی فضاؤں میں اڑتے نظر آتے ہیں۔ شیطان جانتا تھا کہ یہ واہمہ وجود میں آ جانے کا فائدہ یہ ہو گا کہ عام انسان یا تو اپنی کمزوری

اور بزدلی کے نتیجہ میں معرکہ حق و باطل سے دور رہیں گے اور یا پھر خوف یا طمع کے نتیجہ میں باطل کے کیمپ میں جمع ہو جائیں گے۔ بدقسمتی سے شیطان اس منصوبہ میں کامیاب رہا اور مورخین نے باطل کی فتح ظاہری کے جو نقشے مرتب کئے حق کی پامالی کا جس انداز میں ماتم کیا۔ شیطانی قوتوں کے جاہ و جلال کی جو تصویر کشی کی۔ اس کے نتیجے میں شیطان کا مقصد پورا ہو گیا۔ باطل کی ظاہری فتحمندی ایک حقیقت ابدی کے طور پر تسلیم کر لی گئی اور اس کے نتیجہ میں عام انسانوں میں حق پسندی کی جو قوتیں ابھرنا چاہیے تھیں اور جن پر نسل انسانی کے مستقبل کا انحصار تھا وہ سب کے فنا کے غاروں کی نذر ہو گئیں۔ باطل کی ظفریابی اور اس کے ظاہری شکوہ کے تصور نے انسانوں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دی اور حق کی حمایت کا جذبہ اتنا کمزور ہو گیا کہ آج کے ترقی' روشنی' اور علم کے دور میں بھی اس کے ابھرنے کی امید بہت کم نظر آتی ہے۔ ہم یہ تماشا آئے دن دیکھا کرتے ہیں کہ حق کی حمایت میں ایک کلمہ بھی زبان سے ادا کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوا کرتا ہے اس لئے کہ انسانون کے لاشعور میں بات جم چکی ہے کہ حق کی حمایت کا نتیجہ تباہی' بربادی اور ناکامی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے ذہنوں میں یہ عقیدہ پختہ ہو چکا ہے کہ ظاہری کامرانی صرف باطل کا مقسوم ہے اور اگر انہوں نے باطل کی طاقتوں کا مقابلہ کرنا چاہا تو انسان کا وہی عبرتناک انجام ہو گا جو حق پرستوں کا ہوتا رہا ہے۔ اس تصور نے حق کے باب میں ان کی ہمتوں کو پست' ان کے دلوں کو چھوٹا اور ان کے قلوب کو مضمحل کر دیا ہے۔ ان کے دلوں میں یہ بات راسخ ہو چکی ہے کہ طاقت ہمیشہ باطل کا ساتھ دیتی ہے اور اس طاقت کا مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے اور یہی ہے وہ چیز جو دنیا کی تباہی کی اصلی جڑ کہی جا سکتی ہے۔ اسی تصور کا یہ نتیجہ ہے کہ آج دنیا پر باطل کا پرچم لہرا رہا ہے اور حق مقہور و پسماندہ نظر آتا ہے۔ باطل پرستوں کے مقابلہ میں حق پرستوں کی کسی جمعیت کا تیار کرنا حد درجہ دشوار ہو چکا ہے اور اگر کسی گوشہ سے حق کی آواز بلند بھی ہوتی ہے تو

اسے آسانی سے دبا دیا جاتا ہے۔ حق کی یہ پامالی نتیجہ ہے تاریخ کے غلط مطالعہ کا۔ مورخین کے غلط اندازوں کا اور نسل انسانی کے اس غلط اور تباہ کن تصور کا کہ فتح ظاہری باطل کا مقسوم ہے اور پامالی و نامرادی حق کا مقدر رہ!

اس سلسلہ میں ایک مزیدار حقیقت سامنے آتی ہے۔

انسان فطرتاً حق پسند ہوا کرتا ہے اور چاہے خوف یا طمع اسے باطل کے پرچم تلے جمع کردے لیکن اس کا دل اور اس کا ضمیر ہمیشہ حق کی پاسداری پر مجبور کرتا ہے۔ وہ چاہے لاکھ گناہ میں مبتلا ہو لیکن نیکی کی عظمت سے انکار نہیں کرتا۔ ہزار برائیاں کرتا رہے لیکن اچھائیوں کی خوبی کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے جسے وہ تبدیل نہیں کرسکتا۔ یہ اس کا مزاج ہے جسے بدلنے پر وہ مطلق قادر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باطل کی ظاہری شان سے مرعوب ہو جانے کے باوجود اس کے دل کے کسی گوشہ میں یہ تمنا ضرور موجود رہتی ہے کہ حق ظفرمند و کامران ہو۔ وہ حق کو مقہور اور پامال دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ باطل کو کامران و سربلند قرار دیتے ہوئے اسے ایک فطری تردّد اور ہچکچاہٹ سی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی فطرت اسے پسند نہیں کرتی کہ وہ جھوٹ کو سچ کے مقابلہ میں، گناہ کو نیکی کے مقابلہ میں، برائی کو اچھائی کے مقابلہ میں فضیلت عطا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں مورخین باطل کی ظاہری شان سے مرعوب ہو کر اس کی فتح کا اعلان کرتے رہے وہیں اپنی انسانی فطرت سے مجبور ہو کر ان کو حق کی فضیلت اور برتری کی بھی ایک راہ نکالنا پڑی چنانچہ انہوں نے ایک نیا نعرہ ایجاد کیا اور وہ یہ تھا کہ:

حق و باطل کے ہر معرکہ میں جہاں ظاہری فتح باطل کو نصیب ہوئی وہیں "باطنی فتح" حق کے حصہ میں آئی"۔

"باطنی فتح" کا یہ نعرہ محض اس لئے ایجاد کیا گیا کہ مورخ کا دل اور اس کی فطرت

حق کو پامال اور شکست خوردہ قرار دینے پر تیار نہیں تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح کھینچ تان کے ہی کیوں نہ سہی حق کی کامیابی کا پرچم بھی لہرا دیا جائے اور باطل کی ظفرمندی ایک ظاہری حقیقت سہی لیکن باطن کی ایک پُراسرار نقاب اوڑھا کے حق کو بھی کامیاب و کامران قرار دیا جائے۔ اور اس طرح اپنی فطرت کو تسکین دے لی جائے۔

مورخین یہ جانتے تھے کہ ان کا یہ نعرہ ایک طفل تسلی' ایک خوش آیند خواب اور ایک دل خوش کن معمہ ہے لیکن چونکہ یہ نعرہ ان کی فطرت سے قریب تر تھا اور اس کے نتیجہ میں حق کی فضیلت کا انسانی جذبہ تسکین پاتا تھا۔ اس لئے وہ باطل کی ظاہری اور حق کی باطنی فتح کا راگ ہمیشہ الاپتے رہے اور یہ بات اتنی مرتبہ کہی اور سنی گئی کہ آج بچہ بچہ کی زبان پر یہی بات ہے کہ معرکہ حق و باطل میں جہاں باطل اپنی مادی قوتوں کے سہارے ظاہری کامیابی حاصل کرتا ہے وہیں حق باطنی طور پر کامران و منصور ہوا کرتا ہے۔

ہم اس سلسلہ میں صرف اتنا ہی عرض کرسکتے ہیں کہ یہ ایک واہمہ ہے جو محض فطرت انسانی کی تسکین کے لئے تراشا گیا ہے ورنہ دو متحارب قوتوں کا بیک وقت کامیاب ہونا ایک کا ظاہری طور پر اور دوسری کا باطنی طور پر عقلی اور منطقی طور پر قطعاً محال ہے۔

جنگ میں صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک فریق غالب ہو اور دوسرا مغلوب اور دوسرے یہ کہ جنگ غیر فیصلہ کن طریقہ پر ختم ہو جائے۔ ہر دو فریق کا کامیاب ہونا محال ہے لیکن مورخین عین اسی محال عقلی کے تسلیم کرنے کی دعوت دیا کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ جہاں باطل کی ظاہری فتح کو ایک حقیت ثابتہ کے طور پر تسلیم کیا جائے وہیں حق کو کسی پراسرار اور نامعلوم طریقہ پر فتح باطنی کا تمغہ عطا کرکے پلہ برابر کر دیا جائے۔ باطل کی کامرانی ایک سائنٹیفک حقیقت کے طور پر مانی جائے لیکن

چونکہ حق کو شکست خوردہ قرار دیتے ہوئے ایک ندامت اور کوفت سی محسوس ہوتی ہے اس لئے اس کے نام کے ساتھ بھی ایک غیر مرئی اور غیر محسوس فتح کا لیبل چسپاں کر دیا جائے۔

اگر حقیقت پر نظر ڈالی جائے "باطنی فتح" ایک حرف بے معنی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، فتح صرف ایک ہی قسم کی ہوتی ہے اور وہ ظاہری ہوتی ہے۔ فتح وہی ہے جو نظر آئے، دیکھی جائے، محسوس کی جائے، جسے ہر دیکھنے والی آنکھ فتح قرار دے، نہ یہ کہ وہ غیر مرئی ہو، غیر محسوس ہو، عالم اسرار یا عالم روحانیت کی کوئی ایسی عجیب کیفیت ہو جسے صرف فلسفے کے زور اور منطق کی قوت سے ثابت کیا جاسکے جو حکماء و علماء کی ژرف نگاہوں کی مرہون کرم ہو۔ حقیقت کی دنیا سے دور صرف ذہن کے نکتہ رس گوشوں میں وجود رکھتی ہو اور جسے دنیا کی نگاہوں سے دور صرف خوابوں کے جزیرہ میں ساکن قرار دیا جائے۔ اگر اس طرح محض فلسفیانہ نکتہ آرائیوں پر فیصلہ کا انحصار کر دیا جائے تو دنیا کی ہر فتح کو شکست اور ہر شکست کو فتح قرار دیا جاسکتا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ فتح و شکست کا مفہوم ہی دنیا سے معدوم کیا جاسکتا ہے!

"فتح باطنی" کے حرف لایعنی کو معنی خیز بنانے کے لئے جو بات بڑے شد و مد سے کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ حق پرستوں کے ظاہری طور پر شکست کھا جانے کے باوجود ان کے اصول باقی رہے اور باطل ان کے اصولوں کو مٹانے میں کامیاب نہیں ہوا، اسی کو باطنی فتح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو باطل کی "فتح باطنی" کا اعلان بھی اسی شد و مد سے کیا جاسکتا ہے جس کا مظاہرہ حق کی فتح باطنی کے سلسلہ میں ہوا کرتا ہے۔ اس لئے جہاں حق کے اصول نہیں مٹے وہیں باطل کے اصول بھی فنا نہیں ہوئے۔ اگر حق کے نقوش قائم رہے تو باطل کا تصور بھی باقی رہا۔ اگر باطل کی قوتیں حق کو محو نہیں کر سکیں تو حق بھی باطل کو ناپید کرنے سے قاصر رہا۔ ایسی حالت میں اگر حق کے

اصولوں کا دنیا میں باقی رہنا حق کی فتح باطنی ہے تو باطل کے اصولوں کی بقا باطل کی فتح باطنی قرار دی جانے چاہیے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حق کی "فتح باطنی" سے یہ مراد ہے کہ باطل حق کو مٹا دینا چاہتا تھا اور وہ اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوا تو اس کے جواب میں یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ حق کا مقصد بھی باطل کو فنا کر دینا رہا ہے اور وہ بھی اپنے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس لئے کہ اگر حق کو مقصدی اور باطنی فتح نصیب ہوئی تو اسی حد تک باطل کی فتح باطنی سے بھی انکار محال ہے۔

اس صورت میں باطل کا پلہ حق کے مقابلہ میں یقیناً گراں معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ باطل کی فتح ظاہری تو ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ رہی باطنی فتح، یعنی اصولوں کی بقاء —— تو اس معاملہ میں حق اور باطل مساوی الرتبہ نظر آتے ہیں۔ حق کو تو صرف باطنی فتح کا مالک قرار دیا جاتا ہے لیکن باطل کو ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی فتح حاصل ہوتی نظر آتی ہے جس سے اس کا پلہ قطعاً گراں ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فتح میں ظاہری اور باطنی کا فلسفیانہ امتیاز ان لوگوں کو تو مطمئن کر سکتا ہے جو حقیقت کی دنیا سے دور، خوابوں کی دنیا میں زندگی بسر کرنے کے قائل ہوئے ہیں لیکن حقیقت پسند اور صاحب فکر انسان اس تفریق پر مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ان کے نزدیک فتح صرف وہ ہے جو دیکھی اور پرکھی جا سکے جس کے ثبوت کے لئے صرف واقعہ بیان کر دینا کافی ہو۔ فلسفہ کی امداد ضروری نہ ہو، جسے ایک عام آدمی بھی فتح قرار دے سکے۔ علماء کی نکتہ آرائیوں میں اس کا وجود تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔

اگر باطنی، اصولی یا مقصدی فتح کے اس فلسفہ کو تسلیم کر لیا جائے جو آج بڑے شد و مد سے بیان کیا جاتا ہے تو فتح مکہ کو جسے قرآن پاک نے فتح مبین قرار دیا ہے صرف فتح ظاہر قرار دینا پڑے گا اور ابو سفیان کے لئے یہ دعویٰ کرنا حق بجانب ہو گا کہ اسی جنگ میں

اسے "باطنی اور مقصدی" فتح نصیب ہوئی۔ اس لئے کہ بالآخر اس کی نسل نے اسلام کو اپنا کھلونا بنا کر دنیائے عرب کی فرمانروائی حاصل کر لی اور جن "اصولوں" کے لئے ابو سفیان جنگ کرتا رہا تھا وہ پیغمبر اسلامؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی دنیا پر غالب آ گئے۔ ظاہر ہے کہ ابو سفیان کے اس دعوی کو کوئی سلیم العقل انسان ایک لمحہ کے لئے بھی قبول نہیں کر سکتا اور فتح مکہ کے فتح مبین ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ یہ بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ فتح باطنی دراصل کوئی معنی نہیں رکھتی اور یہ لفظ محض اس لئے تراش لیا گیا ہے کہ باطل کی فتح ظاہری کا اعلان و اعتراف کرنے سے جو ذہنی و روحانی کرب محسوس ہوتا تھا۔ اسے حق کی ایک خیالی فتح کے دل خوش کن تصور سے دور کر دیا جائے اور اگر حق کی فتح مبین کا اعلان نہ کیا جا سکے تو کم از کم پلہ مساوی ضرور کر دیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ حق اور باطل میں جب بھی تصادم ہوا تو حق کو ہمیشہ ظاہری فتح نصیب ہوئی۔ فتح مبین ـــــ اور تاریخ پر اگر ایک ذرا بھی گہری نظر ڈالی جائے تو اس واہمہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے کہ ظاہری فتح باطل کو حاصل ہوا کرتی ہے!

حقیقت یہ ہے کہ حق کی علمبرداری کے فرائض ہمیشہ انبیاء اور اوصیاء علیہم السلام نے انجام دیے ہیں اور یہ وہ ذوات مقدسہ تھیں جو عقل و حکمت ربانی کی امین تھیں ان کی عقل عام عقول بشری سے کہیں افضل اور انکی حکمت و تدبیر عام انسانی فہم سے کہیں برتر تھی، ان کا ہر فعل عقل و حکمت پر مبنی ہوتا تھا اس لئے وہ کسی ایسی جنگ کا آغاز نہیں کر سکتے تھے جس کا انجام شکست ہو اس لئے کہ شکست اور ناکامی ـــــ خواہ اسے فتح باطنی کہہ کے اس کی شان میں کتنی ہی قصیدہ خوانی کیوں نہ کی جائے ـــــ کسی حالت میں اچھی چیز نہیں کہی جا سکتی۔ صاحبان عقل اسی وقت لڑتے ہیں جب وہ اپنی طاقت اور حریف کی قوت کا اندازہ لگا کے یہ یقین کر لیتے ہیں کہ فتح کا سہرا نہیں کے سر رہے گا اور

دشمن لاکھ طاقتور نظر آئے لیکن ان کے مقابلہ میں ضرور مغلوب رہے گا۔ شکست کھانے کے لئے لڑنا نہ تو عقلمندی ہے اور نہ خیر۔ ایسی حالت میں علمبرداران حق 'امنائے حکمت ربانی اور قدرت کے مقرر کردہ قائدین نسل انسانی کے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ایسی لڑائیاں لڑیں جن میں شکست لازمی ہو یا کم از کم ایک عام انسان کو مغلوب و مقہور نظر آئیں۔

اور باطل پرستوں کے زیر اثر مرتب کردہ تاریخیں خواہ کچھ کہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ حق اور باطل' سچ اور جھوٹ میں جب بھی ٹکراؤ ہوا ہے تو فتح مبین ہمیشہ حق پسندوں کے ہاتھ رہی ہے۔ باطل کو ہمیشہ ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا ہے اور باطل کی فتح ظاہری کے جو افسانے مشہور کردیئے گئے ہیں وہ ہوا در ہوا سے زیادہ نہیں ہیں۔

قرآن پاک نے جو حقائق و معارف کا گنجینہ اور حکمت و بصیرت کا خزانہ ہے نسل انسانی کو اس حقیقت سے بڑے خوبصورت انداز میں روشناس کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :-

جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا

"حق آیا اور باطل مٹا' بے شک باطل مٹنے والا ہے"۔

یہ ایک عظیم تاریخی حقیقت ہے جسے قرآن پاک نے پیش کیا ہے لیکن افسوس کہ باطل کی ظاہری فتح کے غوغائے باطل نے ہماری نگاہیں اس حقیقت تک نہیں پہنچنے دیں اور حق کی جس فتح مبین کی جانب قرآن پاک نے ہمارے ذہنوں کو موڑنا چاہا تھا وہ ہماری نگاہوں سے آج تک روپوش ہے۔

قرآن نے حق کی فتح کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ انتہائی واقعیت پر مبنی ہے اور جن لوگوں نے تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ اس کلام الٰہی کی تصدیق کرنے پر مجبور ہیں۔

ہم اس سلسلہ میں چند تاریخی شواہد پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے یہ حقیقت واضح

ہو جائے گی کہ حق کو ہمیشہ ظاہری فتح نصیب ہوئی اور حق کبھی اس کا محتاج نہیں رہا کہ اس کی نام نہاد شکست پر باطنی فتح کا لیبل چسپاں کر کے اسے مرہون منت کیا جائے۔

تاریخ انسانی میں حق اور باطل کا سب سے پہلا ٹکراؤ اس دن ہوا جس دن شیطان نے آدمؑ کی خلافت ظاہری کو چیلنج کیا۔ ادھر آدمؑ کے جسد خاکی میں نفخ روح ہوا ادھر معرکہ حق و باطل آراستہ ہوا اور اس معرکہ کا جو انجام ہوا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ آدمؑ اور شیطان دونوں جنت سے نکلے لیکن اس عالم میں کہ شیطان کی گردن میں ابدی لعنت کا طوق اور اس کے سینہ پر "رجیم" کا تمغہ آویزاں تھا۔ اس کے برعکس آدمؑ کے فرق مبارک پر خلافت ارضی کا تاج جگمگا رہا تھا۔ دوش پر ردائے حکومت جلوہ بار تھی، نبوت کی مہر انگشت مقدس کی زینت تھی، رسالت کا جلال جبین انور سے نمایاں تھا اور مسجود ملائکہ ہونے کا شرف آپ کی عظمت کا نقیب تھا۔ اس ظاہری اختلاف سے قطع نظر بھی کر لیجئے تب بھی اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ شیطان اپنے مقصد میں قطعاً" ناکام رہا۔ ملائکہ نے آدمؑ کو سجدہ کیا اور اس باب میں شیطان کا اعتراض بزم قدس میں تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس آدمؑ کامیاب رہے۔ مسجود ملک بھی قرار پائے۔ خلافت الٰہی کے امین بھی مقرر ہوئے اور زمین کی بادشاہی بھی ان کو حاصل ہو کے رہی۔ یہ تھی حق کی فتح مبین جس سے کسی صاحب عقل کے لئے انکار محال ہے۔

حق اور باطل کا دوسرا ٹکراؤ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں ہوا۔ ایک طرف اکیلے نوحؑ تھے اور دوسری جانب پوری قوم، ایک سمت انتہائی کمزور اقلیت اور دوسری طرف بے پناہ اکثریت، حق کا پرستار ایک اور باطل کے شیدائی لاکھوں۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا اس ٹکراؤ کا؟ یہی کہ طوفان کی ایک موج نے باطل کا سفینہ غرق کر دیا اور کشتی نوحؑ نجات و سلامتی کے مظہر قرار پا گئی۔ سارے باطل پرست نذر اجل ہو گئے اور دنیا پر حق پسندوں کا راج اس شان سے قائم ہوا کہ نوحؑ آج تک آدم ثانی کے لقب سے

یاد کیے جاتے ہیں۔

اسے فتح مبین نہیں کہا جائے گا تو پھر اور کیا کہا جائے گا؟

حق اور باطل کا تیسرا ٹکراؤ سرزمین نینوا پر ہوا جہاں باطل کے پاس حکومت کا جلال بھی تھا' عساکر کا شکوہ بھی تھا' خزائن کی قوت بھی تھی' اکثریت کی طاقت بھی تھی۔ پجاریوں اور کاہنوں کے اثرات بھی تھے اور ان کے مقابلہ میں ایک تن تنہا حق پرست تھا جو ترانہ اور شیرانہ انداز میں باطل کو دعوت مبارزت دے رہا تھا۔ باطل کی انتہائی کاوش یہ تھی کہ حق کی آواز کچل دی جائے اور حق ساری دنیا پر چھا جانے کے لئے مچل رہا تھا۔ مقابلہ ہوا۔ باطل کی قوتوں نے ابراہیمؑ کے لئے آگ تیار کی لیکن حق پر آنچ نہیں آنے پائی۔ نمرود کی خدائی حرف باطل کی طرح فنا ہو گئی اور ابراہیمؑ نے نہ صرف یہ کہ سرزمین نینوا پر توحید کا پرچم لہرا دیا بلکہ آس پاس کے علاقوں میں بھی وحدانیت اور صداقت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ عرستان میں ان کے بڑے صاحبزادے اسمٰعیلؑ ان کی تحریک کے نقیب قرار پائے۔ شام میں اسحاقؑ نے ڈیرے ڈال دیئے اور سدوم میں لوطؑ ان کے مشن کے محافظ مقرر ہوئے۔ پورا جزیرہ نمائے عرب حق کی تحریک اور حق کی فتح کا مرکز بن گیا اور یہ مرکز اس شان سے بنا کہ آج جبکہ نمرود اور اس کے ساتھیوں کا کوئی نشان سطح ارض پر موجود نہیں ہے۔ ابراہیمؑ کا تعمیر کیا ہوا مکان ان کی تحریک توحید کا سب سے تابناک اور درخشندہ نشانی تسلیم کیا جاتا ہے۔

مصر کی سرزمین پر حق و باطل میں جو تصادم ہوا وہ تاریخ اسلامی میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ ایک طرف فرعون تھا اور حکومت کا طمطراق مصری قوم تھی اور اس کے ترقی یافتہ علوم و تمدن' سلطنت کا زعم تھا اور دولت کا غرور اور دوسری سمت ایک کمبل پوش اور بوریہ نشین مجاہد حق تھا جو ہر قسم کے ظاہری ساز و سامان سے مبرا تھا فرعون بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھنے اور اپنی ربوبیت تسلیم کرانے پر مصر تھا اور موسیٰؑ

بنی اسرائیل کو آزاد کرانے اور اس جھوٹی ربوبیت کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ ٹکراؤ ہوا اور انتہائی سخت ہوا۔ نمرود سے بڑھ کر فرعون کو ایک اور طاقت نصیب تھی اور وہ تھی علم اور سحر کی قوت، لیکن جس طرح ابراہیمؑ کے ہاتھوں نمرود کو شکست ہوئی اسی طرح موسیٰؑ کے ہاتھوں فرعون غرق دریائے ضلالت ہوا۔ مصری سلطنت ختم ہو گئی اور سرزمین شام پر بنی اسرائیل کی حکومت قائم ہو گئی۔ حضرت موسیٰؑ کی یہ فتح مبین کسی "باطنی" پردہ کی محتاج نہیں ہے۔ یہ کھلی ہوئی ظاہر اور روشن فتح تھی، ایسی فتح جو صرف حق کے لئے مقسوم ہے۔

سرزمین فلسطین پر حق اور باطل میں ٹکراؤ ہوا۔ اب مقابلہ اور زیادہ سخت تھا۔ رومی سلطنت اور یہودی قوم دونوں مسیحؑ کے مقابلہ میں صف آراء تھیں۔ سلطنت، اکثریت، طاقت، دولت، علم، مذہب غرض کیا تھا جو باطل کے قبضہ میں نہ تھا اور اس کے مقابلہ میں تھا ایک کمزور اور نہتہ اللہ کا سچا بندہ۔ ٹکراؤ ہوا اور خوب ہوا۔ ایک طرف تلوار تھی اور دوسری جانب محبت۔ نتیجہ جو کچھ ہوا وہ دنیا پر آشکار ہے۔ یہودی ذلیل ہوئے۔ قیصر کی نسل مسیحؑ پر ایمان لانے پر مجبور ہوئی اور خود مسیحؑ کو یہ عزت و عظمت نصیب ہوئی کہ آج دنیا کے ایک ارب سے زیادہ عیسائی اور ایک ارب سے زیادہ مسلمان ان کا نام سنتے ہی ادب سے گردنیں خم کر دیا کرتے ہیں۔

فاران کی چوٹیوں سے حق کا آوازہ بلند ہوا تو پورے عرب میں ہل چل مچ گئی۔ قریش کی خونچکاں تلواریں نیاموں سے ابل پڑیں۔ عرب سورماؤں کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ خیبر کے یہودی ہوں یا تبوک و نجران کے نصاریٰ مکہ کے بت پرست ہوں یا نجد کے صائبین، سب ایک محاذ حق کے مقابلہ میں صف بستہ ہو گئے۔ مقابلہ ہوا اور بار بار ہوا۔ نتیجہ جو نکلا وہ قرآن کے الفاظ میں انا فتحنا لک فتحا مبینا کی تصویر تھا، قریش کی تلواریں کند ہو گئیں، یہودیوں کی سازشیں ناکام ہو گئیں، دشمنوں نے ہتھیار ڈال دیئے

اور پورا جزیرہ نمائے عرب توحید کے ان نعروں سے گونجنے لگا جس کی بازگشت سے آج سارا عالم گونج رہا ہے۔

حق و باطل کے معرکوں کی یہ محض چند مثالیں ہیں جن میں سے ہر ایک میں حق کو فتح مبین حاصل ہوئی ہے۔ ایسی ہی اور دوسری سینکڑوں مثالیں انبیاء کے مجاہدات سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ جن سے یہ ظاہر ہو گا کہ فتح مبین ہمیشہ حق کا مقسوم ہے اور ناکامی و نامرادی باطل کی تقدیر، لیکن ہم ان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے اس لئے کہ یہ چیز ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہمارا مقصد تو صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ حق و باطل کی کشمکش کے سلسلہ میں ہمارے ذہنوں میں جو تصور بٹھا دیا گیا ہے حق کی پامالی اور باطل کی ظاہری سربلندی کا جو واہمہ ہمارے لئے شیطان نے تیار کر دیا ہے اور شیطنیت و الوہیت کے ٹکراؤ کے متعلق جو غلط فہمیاں عوام میں پیدا ہو گئیں ہیں ان پر سے پردہ اٹھا دیا جائے اور اس حقیقت کو بر افگندہ نقاب کر دیا جائے کہ:۔

فتح مبین ہمیشہ حق کے ہاتھ رہتی ہے۔

باطل ہمیشہ مغلوب اور ناکام رہتا ہے۔

باطل کی ظاہر اور حق کی باطنی فتح دراصل کوئی معنی نہیں رکھتی اس لئے کہ باطل کو دراصل کسی قسم کی فتح نصیب نہیں ہوتی۔ فتح صرف حق کو حاصل ہوتی ہے اور یہ فتح اتنی کھلی ہوئی اور روشن ہوتی ہے کہ اس سے انکار ہر سلیم العقل انسان کے لئے محال ہے۔

آل رسولؑ کا مجاہدۂ حق

حضرت سرور کائنات فخر موجودات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آنکھ بند ہوتے ہی باب نبوت بند، وحی ربانی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور بنیائے طاہرین کے شاندار مجاہدات حق کا دور اختتام کو پہنچا، لیکن شیطنت اور الوہیت کی جنگ ختم نہیں ہوئی یہ جنگ جاری رہی اور آج بھی جاری ہے اس لئے کہ شیطان نے ابھی تک شکست تسلیم نہیں کی ہے اور حق کے مقابلہ میں اس کی سرگرمیاں آج بھی اسی زور و شور سے جیسے کہ دور نبوت میں جاری تھیں۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا دنیا پر ایک عظیم احسان یہ ہے کہ آپ نے شیطانی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی آل پاک ہمارے درمیان چھوڑی، جس نے دورِ معدلت گستر نبوت کے بعد حق کی قوتوں کی قیادت فرمائی اور جس کے فیوض و برکات و تعلیمات کی روشنی میں آج بھی حق کے پرستار شیطان اور اس کی قوتوں کا دلیرانہ مقابلہ کر رہے ہیں۔

آل رسولؑ کے مجاہدات کی تاریخ انتہائی شاندار اور تابناک ہے لیکن ملت اسلامیہ کی اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان مجاہدات پر کبھی صحیح روشنی میں نگاہ نہیں ڈالی جاتی اور حق کی خاطر ان ذوات مقدسہ نے جو سعی و جہد فرمائی ہے اس پر دشمنوں کی تو خیر، دوستوں کی نگاہ بھی بہت کم جاتی ہے۔

اس حقیقت کو سبھی بیان کرتے ہیں کہ چمنستان اسلام کی شادابی آل رسولؑ کی مرہون کرم ہے۔ زلف ایمان کو اگر کسی نے سنوار تو وہ یہی بزرگوار تھے اور دین حنیف

اگر آج زندہ ہے تو انہیں ذوات مقدسہ کے دم سے ہے' لیکن اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود آئمہ آل رسولؐ کے حالات کی تحقیق اور ان کے عظیم کارناموں کے متعلق تفکر و تعقل پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ ان کی تحریک کو سمجھنے' ان کے انقلاب آفرین و فکر انگیز اقدامات کے صحیح اسباب و علل کو معلوم کرنے اور تاریخ اسلام میں ان کے حقیقی کردار اور موقف کا پتہ چلانے پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی اور یہی وجہ ہے کہ ان کی عظمت کے ہزاروں گوشے ایسے موجود ہیں جو آج تک پردۂ اخفا میں ہیں اور اسلامی تاریخ میں ان کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہے اس پر عوام تو رہے الگ خود خواص کی نگاہیں بھی نہیں پہنچ سکی ہیں۔

کیا ستم ہے کہ آل رسول سے عشق و ارادت کا دعویٰ رکھنے والے بھی آل رسولؐ کے حالات پر غور و فکر نہیں کرتے اور ان کی تلاش و تحقیق مناظرہ بازی سے آگے نہیں بڑھتی' یہی وجہ ہے کہ آئمہ اہل بیتؑ کے متعلق اچھی اور عالمانہ تصانیف بہت کم بازار میں آتی ہیں اور جو کتابیں لکھی بھی جاتی ہیں ان میں وہی فرسودہ اور پامال باتیں ملتی ہیں جو اب تک ہزاروں مرتبہ کہی اور لکھی جا چکی ہیں۔ ذہنی اور فکری انحطاط کا یہ دردناک نظارہ ہمارے لئے حد درجہ تکلیف دہ ہے اور اس کے نتیجہ میں خود مذہب اہل بیت کو جو نقصان پہنچ رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

چونکہ ذاکری کے نقطہ نظر سے اہل بیت کو مظلوم' مقہور' پامال' بے دست و پا' مجبور' بے بس اور ناکام ظاہر کرنا حد درجہ مفید ہے اور اس کے نتیجہ میں مجلس میں گریہ بھی خوب ہو جاتا ہے اس لئے ہمارے واعظین آل رسولؐ کی زندگی کے انہیں پہلوؤں کو ابھارتے اور اجاگر کرتے ہیں جن سے یہ ذوات مقدسہ زیادہ سے زیادہ ناکام' محروم اور ستم رسیدہ معلوم ہوتی ہیں۔ دوسرے پہلوؤں پر نہ تو غور و فکر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے اور نہ زور بیان صرف کیا جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ عوام میں یہ

احساس پیدا ہوتا جارہا ہے کہ آل رسولؐ کی زندگی حسرت و نامرادی اور اشک و آہ کی ایک طولانی داستان ہے۔ مظلومی و پامالی درد انگیز اور الم آفرین کہانی ہے۔ ایک افسانہ ماتم، ایک تاریخ درد و غم ہے اور اس اعتبار سے عوام کے لئے قطعاً" ناقابل تقلید ہے۔ اس لئے کہ انسان فطری طور پر نامرادی اور غم سے دور رہنا چاہتا ہے اور کسی ایسے انسان کی تاسی قبول نہیں کر سکتا جس کی زندگی ہمہ درد و ناکامی ہو۔ عوام جب یہ دیکھتے ہیں کہ آئمہ آل رسولؐ کو بہ جرم حق پرستی ہمیشہ ناکامی، تکلیف اور غم کا سابقہ رہا تو خود ان کا فطری جذبہ حق پرستی مضمحل ہو جاتا ہے اور ان کے دلوں میں لازمی طور پر یہ خیال ابھرتا ہے کہ حق پرستی کا نتیجہ ایک ناکام زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر کہ عوام کی اکثریت ایک ناکام، شکست خوردہ اور پامال زندگی پر قناعت نہیں کر سکتی۔ چند اصولوں کی خاطر زندگی کی ہر نعمت کو خیرباد کہہ دینا اور مرقع الم بن کر زندگی بسر کرنا چاہے فلسفیانہ طور پر کتنا ہی بلند تر اصول انسانیت ہو لیکن عوام کے لئے عملی چیز نہیں ہے۔ ایسی حالت میں جب آل رسولؐ کو ایک ناکام اور شکست خوردہ عنصر کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام ان کی تقلید و تاسی کا تصور ترک کر دیتے ہیں۔ چنانچہ عملاً یہی ہو رہا ہے اور ہمارے عوام کا کردار دن رات آل رسولؐ کا ذکر سنتے رہنے کے باوجود جو کچھ ہے وہ ہمارے اس دعوے کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ آل رسولؐ کے مصائب نہ بیان کئے جائیں یا ان کی مظلومی کی داستان میں کوئی کمی کر دی جائے اس لئے کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارے آئمہ کے مصائب کا تذکرہ دراصل نسل انسانی کی معراج کا تذکرہ ہے۔ اعلیٰ اقدار انسانی کا تذکرہ ہے۔ انسان کی اخلاقی و روحانی بلندی کا تذکرہ ہے اور اس کے نتیجہ میں حقانیت کا آفتاب اس شان سے چمکتا ہے کہ باطل کی ظلمتیں کافور ہو جاتی ہیں۔ آل رسولؐ کے مصائب کا ذکر صبر و تحمل، ایثار و فداکاری، خلوص و للہیت، شرافت و ضبط نفس اور سچی حق پرستی پیدا

کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں احیائے دین ہوتا ہے۔ حقیقت اسلام جلوہ فگن ہوتی ہے۔ رسول اللہ کے پیغام کی اشاعت ہوتی ہے اور آنسوؤں کے سیلاب میں سارے گناہ خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں آل رسولؐ کے مصائب ضرور بیان ہونا چاہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے مجاہدۂ دینی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی نظرانداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ ان سے بھی اہل بیت علیہم السلام کی سیرت کے بہت سے نقوش ابھرتے ہیں اور حق و باطل کی اس کشمکش میں جو خود ہماری زندگی کے ہر لمحہ میں جاری رہتی ہے ہمیں ایک نیا عزم، ایک نئی ہمت، ایک نیا ولولہ جہاد اور استقامت علی الحق کا ایک نیا درس ملتا ہے۔ ہمیں آل رسولؐ کی کامرانیوں کی داستان بھی عوام کے سامنے پیش کرنا چاہیے اس لئے کہ جہاد حق و باطل میں ان کی ہر فتح ہمارے لئے زندگی کا ایک نیا پیغام ہوگی۔ صبر و استقامت کا ایک نیا درس ہوگی۔ عزم و ہمت کی ایک نئی تعلیم ہوگی اور اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آئے گی کہ حق پر مر مٹنے والے ہمیشہ کامران و بامراد ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی فتح مبین کا نمونہ ہوتی ہے۔ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ ان کی زندگی بھی کامیاب ہوتی ہے اور ان کی موت بھی کامیاب۔ حقیقی عزت اور سربلندی انہیں کے لئے ہوتی ہے۔ ابدی نعمتوں سے وہی سرفراز کئے جاتے ہیں اور جہاں آخرت میں ان کے مراتب اعلیٰ ہوتے ہیں وہیں خود اس دنیا میں بھی سچی اور پائیدار فوز و فلاح انہیں کے حصے میں آتی ہے۔

ہم مانتے ہیں کہ آل رسولؐ کی مقدس زندگیوں کا ایک حصہ مصائب و آلام میں بسر ہوا لیکن یہ مصائب ہی دراصل ان کی کامیابی و کامرانی کا ذریعہ بنے۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ ہر مقصد کے حصول کے لئے انسان کو سعی و جہد کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس سعی و جہد کے دوران میں اسے مصائب اور تکالیف سے گزرنا پڑتا ہے۔ کوئی مقصد بغیر تکلیف و سعی حاصل نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مقصد جتنا بلند ہوتا ہے مراد جتنی

اعلیٰ ہوتی ہے، مطلوب جتنا گراں قدر ہوتا ہے محنت اور تکلیف بھی اسی درجہ کی ضروری ہوا کرتی ہے۔ آل رسولؐ کے مقاصد انتہائی بلند تھے اس لئے لازماً ان کو عظیم مصائب اور صبر آزما تکالیف کا سامنا کرنا پڑا لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان کی قربانیاں رائیگاں گئیں۔ ان کے مصائب بے نتیجہ ثابت ہوئے؟ ان کی محنت و تکلیف بے سود تھی اور وہ ان مقاصد کے حصول میں کامیاب نہیں ہوئے۔ جن کے لئے ان کو قربانیاں پیش کرنا پڑ رہی تھیں؟ ظاہر ہے کہ اس قسم کا دعویٰ کرنے کی کسی کو مجال نہیں ہو سکتی اس لئے ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ جہاں آل رسولؐ کو عظیم ترین مصائب کا سامنا ہوا وہیں انہوں نے عظیم ترین کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آل رسولؐ کی حقیقی عظمت بھی اسی چیز میں پوشیدہ ہے کہ انہوں نے عظیم مقاصد کے لئے عظیم قربانیاں پیش کیں اور بالآخر ان مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوئے۔ جن کا حصول ان ناساعد حالات اور اس ہمت شکن ماحول میں بڑے سے بڑے انسان سے بھی ممکن نہیں تھا۔

میرا شکوہ بس اتنا ہے کہ ہمارے واعظین جہاں آل رسولؐ کے مصائب بیان کرتے ہیں وہیں وہ ان عظیم کامرانیوں پر بہت کم روشنی ڈالتے ہیں جو ان صبر آزما تکالیف کے نتیجہ میں اہل بیتؑ کو نصیب ہوئیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جب آئمہ، آل رسولؐ جہاد حق میں عظیم قربانیاں پیش کرتے رہنے کے باوجو حسرت و نامرادی کا شکار رہے تو پھر عام انسان اس مجاہدہ میں شمولیت اختیار کر کے کون سی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں؟ اس سے ان کا عزم حق پرستی مضمحل اور ان کی ہمت شکستہ ہو جاتی ہے اور وہ اس جہاد حق میں جرأت مندانہ طریقہ پر حصہ لینے سے گریز کرنے لگتے ہیں جس پر دین کی بقاء، انسانیت کی فلاح، ملت کے ارتقاء اور دنیا کے فوز و فلاح کا انحصار ہے۔ اس کے برعکس اگر آل رسولؐ کے مصائب کے تذکرہ کے ساتھ ہی ان کی کامرانیوں اور فتح مندیوں کا ذکر بھی جاری رہے تو اس سے عوام میں حق پر مرمٹنے کا

عزم تازہ ہوگا اور وہ حق کی خاطر قربانیوں کا عظیم اور پیش قرار انجام لینے کے بعد خود ہر قربانی پیش کرنے پر آمادہ نظر آئیں گے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے آئمہ اسی حکمت ربانی کے امین اور اسی تدبیر الٰہی کے حامل تھے جو انبیاء کی ذوات مقدسہ میں جلوہ گر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح انبیاء نے حق و باطل کے ہر معرکہ میں فتح مبین حاصل کی۔ اسی طرح آئمہ آل رسولؐ نے بھی ہر ٹکراؤ میں مکمل فتح حاصل فرمائی۔ وہ حق کے جیتے جاگتے پیکر بلکہ مجسم حق تھے اور حق کو بہ نص قرآنی ہمیشہ فتح نصیب ہوتی ہے اس لئے ان کو بھی ہمیشہ فتح و کامرانی نصیب ہوئی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کامیابیوں کی مفصل روداد دنیا کے سامنے پیش کی جائے اور ان حق نما حضرات کی سعی و جہد کی ایک مکمل تصویر عوام کے سامنے لائی جائے لیکن یہ کام بہرحال علماء کا ہے اور وہی اسے کماحقہ انجام دے سکتے ہیں۔ راقم الحروف نہ تو عالم ہے اور نہ اس عظیم موضوع پر قلم اٹھانے کا اہل۔ اس کا مقصد اس مقالہ سے صرف اتنا ہے کہ ارباب ملت کو آل رسولؐ کی سیرت طیبہ پر ایک نئے نقطہ نظر سے غور کرنے کی دعوت دے دے اور بس —— اور اگر وہ اپنی اس کاوش میں کچھ بھی کامیاب ہو گیا تو اس کو اپنے لئے سرمایہ نجات تصور کرتے ہوئے مطمئن ہو جائے گا۔

☆——☆☆——☆

اسلام ــــــ ایک انقلابی تحریک

اسلام کے علاوہ سارے مذاہب چند عقائد و عبادات اور چند مراسم اور اخلاقی ضابطوں کا مجموعہ ہیں۔ پیغمبر اسلام روحی لہ الفدیا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بعثت سے قبل ساری دنیا میں یہ تصور عام تھا کہ مذہب چند عقائد اور چند مراسم کا نام ہوا کرتا ہے اور جو شخص ان عقائد پر ایمان رکھتا ہے اور چند مراسم انجام دے لیتا ہے وہ پکا مذہبی آدمی ہوتا ہے۔ اپنی عمل زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کو مذہب کی گرفت سے آزاد تصور کیا جاتا تھا۔ سیاست' معاش' تعلیم' تہذیب اور تمدن وغیرہ سے مذہب کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ان امور میں ہر شخص خود اپنے پسندیدہ تصورات کی پیروی کے لئے آزاد تھا۔

لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مذہب کے نام سے جو چیز دنیا کے سامنے پیش کی وہ اس سے بالکل مختلف تھی۔ آپ نے جہاں دنیا کے سامنے چند عقائد و عبادات پیش فرمائے وہیں انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ایک مکمل قانون بھی پیش فرمایا اور اس "آزادی" کو بالکل سلب کر لیا جو انسانوں کو حاصل تھی۔ آپ نے دین کے نام پر دراصل ایک عظیم انقلابی تحریک کا آغاز فرمایا۔ ایسی انقلابی تحریک، جو ماضی کے تمام آثار باطلہ کو مٹا کے حیات انسانی کو نئی اور اعلیٰ اخلاقی و روحانی اقدار پر منظم کرنا چاہتی تھی۔ جو سیاست' معاش اور تمدن کے ہر شعبہ پر حاوی تھی اور ان میں سے ہر معاملہ میں انقلاب آفریں اصلاحات وجود میں لانا چاہتی تھی جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو نظام الٰہی کے مطابق استوار کرنا چاہتی تھی' جو انسانی حاکمیت کے ملعون تصور کو ختم کر کے زمین پر

اللہ کی بادشاہت قائم کرنا چاہتی تھی اور جو ایک ایسی اخلاقی، روحانی اور ذہنی فضا پیدا کرنا چاہتی تھی جس میں انسان منشائے الٰہی کے مطابق وہ تمام ترقیاں حاصل کر سکے، جو خلیفۃ اللہ فی الارض کے شایان شان کہی جا سکتی ہیں۔

حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس عظیم روحانی انقلابی تحریک کے حقیقی قائد اعظم تھے۔ آپ نے یہ تحریک شروع فرمائی تو جس شخص نے سب سے پہلے اس تحریک کو اس کے سارے عناصر و مضمرات کے ساتھ قبول کیا اور اسے پروان چڑھانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دینے کا وعدہ کیا وہ ایک نوجوان تھا ـــــ علی مرتضیٰ۔

اس بلند فطرت، بلند حوصلہ، بلند ہمت اور بلند نظر نوجوان نے جس کی فطرت میں شبنم کی لطافت اور سنگ و آہن کی صلابت ایک ساتھ سموئی ہوئی تھی اسلامی تحریک کے قائد اعظم کی آغوش میں تربیت پائی تھی اس لئے وہ اپنے قائد کے افکار و نظریات سے کماحقہ آگاہی رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا قائد اس وقت کے مروجہ نظام کے کن اجزاء سے اختلاف رکھتا ہے اور حصول کامیابی کے بعد کس قسم کا نظام نو قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس تحریک کے سارے خدوخال جانتا تھا اور اپنے قائد کی مزاجی ساخت کو بھی خوب پہچانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کس قسم کے حالات میں اس کا قائد کیا طرز عمل اختیار کرے گا۔ اس نے اپنے قائد کے مزاج، اس کے طریقہ کار، اس کے انداز فکر اور اس کی سیرت کے سارے نقوش کی اشاعت کو اپنے قلب و روح کا جزو بنا لیا تھا۔ اور اسے اس تحریک سے اتنی گہری دلچسپی، اتنا والہانہ عشق اور ایسی سچی محبت ہو گئی تھی کہ وہ جیتا تھا تو اس تحریک کی کامیابی کے لئے اور مرنا چاہتا تھا تو اس کی بقاء کے لئے ـــــ یہ تحریک اس کے جسم و جان کا ایک جزو بن چکی تھی۔ اس کی ہر سانس اس عظیم تحریک کے لئے وقف تھی اور وہ اس کی کامیابی کے لئے اپنے قائد کے اشارہ پر دنیا کی بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے پر تیار تھا۔

تحریک اسلامی کا قائد اعظم بھی اس حقیقت کو خوب جانتا تھا اسے اس نوجوان کی عظیم صلاحیتوں اور اس کی اعلیٰ فطری استعدادوں کا بھی خوب احساس تھا۔ وہ اپنے شریک نور کے جذبہ فداکاری، خلوص اور مستقل مزاجی سے بھی کماحقہ آگاہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہی نوجوان آگے چل کر اس کے مشن کو کامیاب بنائے گا۔ اس لئے کہ ــــــ

جہاں تک اس تحریک کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا تعلق ہے یہ نوجوان ایک بے مثل عالم، ایک بے نظیر حکیم، ایک عدیم المثال خطیب، ایک بلند پایہ انشاء پرداز اور ایک بے پناہ معلم اخلاق و روحانیت کی حیثیت سے قطعاً اس کا اہل ہے کہ وہ اس تحریک کو دنیا کے سامنے پیش کرے۔

جہاں تک اس تحریک کو دشمنوں کے مقابلہ سے بچانے اور مخالفین کی دست برد سے محفوظ رکھنے کا تعلق ہے یہ نوجوان ایک عدیم النظیر جرنیل اور ایک مافوق الفطرت سپاہی کی حیثیت سے اس کی پوری اہلیت رکھتا ہے کہ تحریک مدافعت کی ذمہ داریاں اسی کے سپرد کی جائیں۔

اور

جہاں تک اس تحریک کے پھیلاؤ اور اس کی بقاء کا تعلق ہے اس نوجوان میں ایثار، قربانی، فداکاری اور جان سپاری کے وہ جوہر موجود ہیں کہ وہ اپنا اور اپنے گھرانے کا خون دے کر بھی اس تحریک کی جڑوں کو مستحکم اور اس کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کر سکتا ہے!

پیغمبر اسلامؐ نے اپنی تحریک کا آغاز ایک دعوت سے کیا جسے تاریخ اسلام میں "دعوت ذوالعشیرہ" کہا جاتا ہے۔ اس دعوت میں مکہ کے تمام اکابر موجود تھے۔ پیغمبرؐ نے ہاشمی سرداروں کے سامنے اپنی تحریک پیش کی تو بزم میں سناٹا چھا گیا' چہروں پر وحشت برسنے لگی اور پیغمبرؐ کی تقریر کا جواب ایک طویل خاموشی سے دیا گیا۔ اس طلسم سکوت کو جس شخص نے توڑا وہ یہی نوجوان تھا جس نے بڑے شیرانہ انداز میں انتہائی بے جگری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعظم قریش کے سامنے بڑے صفائی کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ وہ اس تحریک کو پروان چڑھانے میں جان کی بازی لگا دے گا اور بڑی سے بڑی طاقت سے مرعوب نہ ہوتے ہوئے اس عظیم روحانی تحریک کو پروان چڑھانے میں جان کی بازی لگا دے گا اور بڑی سے بڑی طاقت سے مرعوب نہ ہوتے ہوئے اس عظیم روحانی تحریک کو آگے بڑھانے میں پوری پوری مدد دے گا۔

پیغمبر اسلامؐ نے بھی بچی تلی قدر شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس بزم میں علیؑ کو اپنا وصی' وزیر اور خلیفہ مقرر کر دیا' اس لئے کہ آپ یہ جانتے تھے کہ اسلامی انقلاب سے جو گہری شیفتگی' جو بچی ارادت علیؑ کو ہے' نیز جو اعلیٰ قائدانہ صلاحیتیں علیؑ میں موجود ہیں وہ کسی دوسرے انسان میں ممکن نہیں ہیں۔ آپ کا یہ تاریخی اعلان دراصل ایک مہر توثیق تھی جو علیؑ کی قیادت پر اس وقت ثبت کی جا رہی تھی جب علیؑ کی حیثیت ایک کمسن بچہ سے زیادہ نہیں تھی۔ اس سے جہاں علیؑ کی بے پناہ عظمت ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہیں پیغمبر اسلامؐ کی مردم شناسی کا بھی یہ اعلیٰ نمونہ ہماری نگاہوں کے سامنے جلوہ فگن ہوتا ہے کہ آپ ایک دس بارہ سال کے بچہ کو دیکھ کر اس کے مستقبل کا کیسا صحیح اندازہ فرمانا جانتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے علیؑ کی جن عظیم صلاحیتوں کی جانب دعوت عشیرہ میں اشارہ فرمایا تھا وہ دور رسالت میں پورے شباب کے ساتھ جلوہ افگن

ہوئیں۔ دنیا نے دیکھا کہ علیؑ اتنے بڑے عالم ہیں کہ نبیؐ ان کے باب ... العلم ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔ اتنے عادل ہیں کہ اقضاکم علیا کا فرمان صادر ہو رہا ہے' اتنے بڑے مبلغ ہیں کہ پورا یمن ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر رہا ہے۔ اتنے سرفروش ہیں کہ عمرو بن عبدود کے مقابلہ صف آرا ہیں۔ اتنے بہادر ہیں کہ عرب کا بڑے سے بڑا سورما ان کے نام سے کانپ رہا ہے۔ دعوت تحریک میں اتنے پیش پیش ہیں کہ سورۂ برات کی تبلیغ انہیں سے متعلق ہے۔ اتنے جان سپار ہیں کہ اپنے قائد کی جان بچانے کیلئے شب ہجرت چار سو ننگی تلواروں کے سائے میں آرام کر رہے ہیں اور تحریک اسلامی کے سارے رموز کے اتنے عالم ہیں کہ پیغمبرؐ کے بعد مسلمانوں کی نگاہیں انہیں کی جانب اٹھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اسلامی تحریک سے سچی دلچسپی رکھتے تھے وہ رسولؐ کی زندگی میں ہی علیؑ کو مستقبل کا قائد اور پیغمبرؐ کا جانشین تسلیم کرنے لگے تھے۔ سلمانؓ' ابوذرؓ' عمارؓ اور مقدادؓ وغیرہ سب اسی مکتب خیال کے افراد تھے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ بزرگوار اسلامی تحریک انقلاب کے سچے فدائی' حقیقی پرستار اور صف اول کے رکن نہیں تھے؟

اسلامی تحریک آگے بڑھی تو دنیا کی ہر انقلابی' عوامی اور عظیم تحریک کی طرح اس تحریک میں بھی ہر قسم کے لوگ شامل ہو گئے۔ ذاتی صفات سے قطع نظر اجتماعی طور پر ہم ان لوگوں کو چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:۔

۱۔ پہلا طبقہ ان سچے انقلابیوں پر مشتمل تھا جو پرانے غیر الٰہی اور جاہلی نظام کو مٹا کر اس کی جگہ پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات کے مطابق وہ نیا نظام زندگی قائم کرنے کے خواہش مند تھے جسے الٰہی یا اسلامی نظام زندگی کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جو پرانے جاہلی نظام سے نفرت رکھتا تھا اس لئے جہاں تک اس نظام کے مٹا دینے کا تعلق تھا وہ پورے جوش اور ولولہ کے ساتھ پیغمبرؐ کے

ساتھ رہا۔ رہا اس جاہلی نظام کی جگہ ایک نیا اور صالح نظام قائم کرنے کا سوال، تو اس طبقہ کو اس معاملہ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ انصار کا بڑا حصہ اسی طبقہ سے متعلق تھا۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جہاں تک پرانے نظام کو مٹا دینے کا سوال تھا انصار ہمیشہ سرفروشی کا مظاہرہ کرتے رہے لیکن سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آنکھ بند ہوتے ہی جب نئے نظام کی صورت مرتب کرنے کا سوال ابھرا تو انصار گھروں میں بیٹھ رہے اور خلافت اسلامی کا سوال صرف مہاجرین بلکہ قریش کی مرضی پر منحصر ہو گیا۔

۳۔ تیسرا طبقہ مفاد پسندوں (Opportunists) کا تھا۔ جنہیں نہ پرانے نظام سے پرخاش تھی نہ نئے نظام سے دلچسپی ان کو بس اپنی فکر تھی۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ تحریک ضرور کامیاب ہو گی اس لئے وہ اس تحریک سے وابستہ ہو کر اپنے لئے ایک روشن مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ مہاجرین قریش کی اکثریت اسی طبقہ سے تعلق رکھتی تھی۔

۴۔ اور چوتھا طبقہ ان رجعت پسندوں (Reactionaries) کا تھا جو اس انقلاب کی کامیابی سے حد درجہ خائف و ترساں تھے اور یہ چاہتے تھے کہ انقلاب پسندوں کی صفوں میں شریک ہو کر اندر ہی اندر اس تحریک کو برباد کر دیں۔

اول الذکر طبقہ کے راس و رئیس حضرت علیؑ مرتضیٰ تھے اور اس طبقہ میں وہ صحابہ شامل تھے جنہوں نے اپنی بے پناہ قربانیوں سے تاریخ اسلام کو انتہائی شاندار اور تابناک بنا دیا ہے۔ سلمان و ابوذر اسی مومنین خالصین کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، مقداد، عمار یاسر، ابی ابن کعب، حذیفہ یمانی، جابر بن عبداللہ، مالک بن نویرہ، خزیمہ بن ثابت، بلال حبشی، ابوایوب انصاری اور دوسرے سینکڑوں صحابہ کے نام اس زریں فہرست میں شامل ہیں۔ یہ وہ حضرات تھے جن کے سامنے اس انقلاب کی ایک جامع اور مکمل تصویر

موجود تھی جو پیغمبر اسلامؐ کا منشاء و مقصود تھا۔ اور وہ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ہر قربانی پیش کرنے پر تیار رہتے تھے۔ وہ نظام کہن کو مٹانا بھی چاہتے تھے اور نظام نو قائم کرنے کے بھی آرزو مند تھے۔ وہ ایک منزل پر تخریب چاہتے تھے اور دوسرے موقع پر تعمیر۔۔۔۔ تخریب نظام کہن کے لئے چونکہ تلوار کی ضرورت تھی اس لئے وہ میدان جنگ میں شمشیر بکف نظر آئے اور قیام نظام نو کے لئے چونکہ تبلیغ و اشاعت کی ضرورت تھی اس لئے بعد رسولؐ یہی حضرات جو ساری دنیا سے اپنی تلواروں کی کاٹ اور اپنے بازوؤں کی قوت منوا چکے تھے۔ پر امن اور خاموش تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔

دوسرا طبقہ زیادہ تر انصار مدینہ اور چند مہاجرین پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ نظام کہن کو ختم کرنے کی حد تک بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے رہے لیکن جیسے ہی نظام نو کے قیام کا سوال پیدا ہوا ان کا سارا جوش جہاد اور عزم انقلاب سرد پڑ گیا۔ خلافت کے نام پر جو نظام بھی ان کے سر تھوپ دیا گیا اسے انہوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ قبول کر لیا۔ انہیں نہ اس سے دلچسپی تھی کہ خلیفہ کون مقرر ہو رہا ہے اور نہ اس سے بحث تھی کہ اس سلسلہ میں کون سے اصول وضع ہو رہے ہیں۔ اجماع کا فیصلہ ہوا تو ان کو قبول' نامزدگی کا طریقہ اختیار کیا گیا تو ان کو منظور۔ شوریٰ کی ٹھہری تو وہ راضی۔ غرض ان کی نہ تو اپنی کوئی رائے تھی نہ کوئی اصول تھا نہ کوئی مقررہ راہ عمل تھی۔ جو کچھ چند بڑے کہہ دیتے تھے اکابر قریش کا جو فیصلہ ہو جاتا تھا یہ اسے مان لیتے تھے۔ ان کو نئے نظام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ان کے دلوں سے زندگی' ان کے خون سے حرارت اور ان کے قلوب سے گرمی بالکل ختم ہو چکی ہے۔ عہد رسالت میں یہی لوگ تھے جنہوں نے کفار قریش اور یہودیوں کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔ لیکن بعد رسولؐ یہ طبقہ اسلامی سیاست میں ایک ایسا مفلوج' بے حس اور بے جان عنصر بن گیا تھا جس کا تصور بھی حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا طبقہ مفاد پسندوں کا تھا‘ ان لوگوں کی کیفیت یہ تھی کہ جب نظام کہن کے خلاف میدان جہاد آراستہ ہوتا تھا تو یہ فرار پر فرار کرتے تھے اور جب سکون کی فضا ہوتی تھی تو نظام نو میں اپنے لئے مناسب جگہ پیدا کرنے کے جوڑ توڑ میں مصروف رہتے تھے۔ رسول اللہؐ مکہ میں تھے تو یہ حضرات جہاں ایک طرف پیغمبرؐ کے پہلو میں نظر آتے تھے وہیں دوسری طرف کفار سے بھی میل جول رکھتے تھے۔ رسولؐ شعب ابو طالبؑ میں نظربندی کے شدائد جھیلتے رہے اور یہ کفار مکہ کے ساتھ داد عیش دیتے رہے۔ رسول اللہؐ ہجرت کر کے مدینہ آگئے تو یہ حضرات وہاں بھی جلوہ فرما ہو گئے تاکہ فتوحات ملکی اور مال غنیمت میں حصہ بٹا سکیں۔ ان کو نہ انقلاب سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ اس کے اصولوں سے محبت‘ ان کی دلچسپی کا مرکز صرف ان کی ذات تھی اور وہ اپنے ذاتی نفع کے لئے انقلاب کے اہم اور بنیادی اصولوں کو بھی قربان کر سکتے تھے۔ اپنے ذاتی فائدہ کے لئے پرانے نظام کے شیدائیوں اور انقلاب دشمنوں سے بھی دوستی کر سکتے تھے اور حصول مقصد کے لئے ہر قسم کے جوڑ توڑ سے کام لے سکتے تھے۔ یہی وہ طبقہ تھا جو رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی بر سر اقتدار آگیا اور چونکہ اسے اپنے اقتدار کی بقاء کے لئے زیادہ سے زیادہ لوگوں کا تعاون درکار تھا اس لئے اس نے اسلامی تحریک کے اس سب سے بڑے دشمن ابو سفیان سے بھی دوستی کر لینے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی جس کی انقلاب دشمنی پر بدر و احد کے معرکے گواہ ہیں۔

یہ طبقہ اکابر قریش پر مشتمل تھا اور ہمیں یہ سن کر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ اس میں اکثریت مہاجرین کی تھی۔

چوتھا طبقہ ان مشرکین پر مشتمل تھا جو پہلے تو پیغمبر اسلامؐ کے مقابلہ میں تیغ و سناں کی تمام قوتیں استعمال کرتے رہے لیکن جب فتح مکہ نے ان کی کمر توڑ دی۔ پورے عربستان پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا اور ان کی فتح کی امیدیں یاس و ناکامی میں تبدیل ہو

گئیں تو اپنی جنگ کا رخ موڑنے اور کھلم کھلا جنگ کے بجائے اسلام کا لبادہ اوڑھ کے تحریک اسلام کو اندر سے کھوکھلا کرنے پر تیار ہو گئے۔ ان لوگوں نے بظاہر تو اسلام قبول کر لیا تھا لیکن بباطن یہ اسی جاہلی نظام کے پرستار تھے جس کے لئے وہ آگ اور خون کا کھیل کھیل چکے تھے۔ مسلمان بننے سے ان کا مقصد بس اتنا تھا کہ انقلابیوں کی صفوں میں داخل ہو کر ان کا شیرازہ درہم برہم کر دیا جائے، ان کا نظم برباد کر دیا جائے اور موقع ملتے ہی اسلام کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا جائے۔ وہ جنگ میں مسلمانوں سے ہار چکے تھے۔ مکر و فریب، سازش، اندرونی بغاوتوں اور داخلی انتشار کا سہارا لے کر مسلمانوں کو مات دینا چاہتے تھے۔ لیکن یہ کھیل آسان نہیں تھا۔ اس میں شدید احتیاط کی ضرورت تھی اور مسلمانوں کی جمی ہوئی طاقت پر اچانک حملہ کر دینے میں شدید خطرات کا سامنا ہو سکتا تھا اس لئے یہ طبقہ وفات رسولؐ تک بالکل خاموش رہا لیکن پیغمبرؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی جیسے ہی حالات بدلے اس نے اپنے مقاصد کے حصول کی جدوجہد شروع کر دی۔ اس کے سامنے اس وقت حصول مقصد کی دو ہی راہیں ہو سکتی تھیں۔

۱۔ وہ ایک تو یہ کہ برسراقتدار طبقہ کو جو مفاد پسندوں پر مشتمل تھا سچے انقلابیوں کے مقابلہ میں صف آرا کر دیں اور اس طرح مدینہ میں خانہ جنگی چھڑ جائے اس سے فائدہ یہ ہوتا کہ اسلامی تحریک کے سچے شیدائی اور پیغمبر آخرالزماںؐ کے انقلابی تصورات کا اصلی امین قتل ہو جاتے اور اس طرح اس انقلاب کا خاتمہ ہو جاتا جو حضرت سرور کائناتؐ وجود میں لانا چاہتے تھے۔

۲۔ اور دوسرے یہ کہ اگر خانہ جنگی نہ کرائی جا سکے تو مفاد پرستوں سے دوستی اور مفاہمت کر کے رفتہ رفتہ خود اپنی طاقت اتنی بڑھالی جائے کہ بالآخر اقتدار حکومت اسی طبقہ کے ہاتھوں میں آ جائے اور پھر وہ سچے انقلابیوں کو کچل کے دوبارہ اپنا پسندیدہ نظام جاہلیت قائم کر دے۔

اس طبقہ کا سرغنہ ابوسفیان تھا۔

رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی ابوسفیان نے یہ کوشش شروع کردی کہ انقلاب اسلامی کے علمبرداروں اور ان کے حریف مفاد پرستوں میں جنگ چھڑ جائے ایک طرف علیؑ اور ان کے ساتھی ہوں اور دوسری طرف خلافت کے مسند نشین مسلمان آپس میں لڑیں اور اس رجعت پسند طبقہ کی تمنا پوری ہو جائے جو نفاق کی ردائیں اوڑھے اسلام کی بربادی کی تمنائیں کر رہا تھا۔ ابوسفیان جانتا تھا کہ علیؑ اور اس کے ساتھی جو نظام جاہلی کے سب سے بڑے دشمن اور تحریک انقلاب اسلامی کے سچے شیدائی تھے اقلیت میں تھے اس لئے اگر جنگ ہوتی تو یہ سب لوگ مارے جاتے اور اس طرح انقلاب اسلامی کا ہر نقش دنیا سے فنا ہو جاتا۔ رہ جاتے مفاد پرست طبقہ کے لوگ تو ان کے متعلق ابوسفیان کو یقین تھا کہ ان کے دلوں میں اسلام کے لئے کوئی لگن نہیں ہے۔ اس لئے اگر سچے انقلابیوں کا خاتمہ ہو گیا تو یہ طبقہ خود ہی کچھ عرصہ کے بعد جاہلی نظام کی طرف واپس ہو جائے گا۔ ایسی حالت میں وقت کی بہترین سیاست یہ تھی کہ نام نہاد مفاد پرست مسلمانوں کے ذریعہ سچے مسلمانوں کا خاتمہ کرا دیا جائے۔ چنانچہ اس نے خلافت کا فیصلہ ہوتے ہی حضرت علیؑ کو ٹٹولا۔ ان کو اپنی امداد کا یقین دلایا مدینہ کو لشکروں سے پاٹ دینے کا سبز باغ دکھایا اور یہ چاہا کہ علیؑ حاکم وقت کے مقابلہ میں صف آرا ہو جائیں۔ یہ ایک خوبصورت کھیل تھا۔ سچے مسلمانوں کو مفاد پرست مسلمانوں سے پٹوا دینے کا، لیکن بنو امیہ کے سردار کی یہ چال ناکام ہوئی۔ امیرالمومنینؑ نے انتہائی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ابوسفیان کو دھتکار دیا اور انقلاب اسلامی کے سچے پرستاروں کو قتل کرا دینے کی یہ شیطانی سازش ناکام بنا دی گئی۔ وفات سرور کائناتؐ کے بعد الٰہی اور شیطانی قوتوں کا یہ پہلا ٹکراؤ تھا جس میں حق کامیاب ہوا اور باطل ناکام۔ بنی امیہ کی شیطانی چال ناکام ہوئی اور تحریک اسلامی کا علمبردار کامیاب۔ سچے مسلمانوں کو قتل کرا دینے کی مکروہ سازش

ناکام بنادی گئی اور ان لوگوں کو موت کے چنگل سے بچالیا گیا جن کے سہارے آئندہ دنیا کو دعوت اسلام سے روشناس کرایا جا سکتا تھا۔

رجعت پسند طبقہ جب اس سازش میں ناکام رہا تو اس نے دوسری راہ اختیار کی۔ اب وہ مفاد پسندوں کی جانب مائل ہوا تاکہ ان کی طاقت اتنی مضبوط کر دی جائے کہ سچے انقلاب پسند اور نظام الٰہی کے داعی برسر اقتدار نہ آسکیں۔ دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ ایوان حکومت میں داخل ہو کر خود اپنی طاقت مستحکم کر لی جائے اور موقع ملتے ہی مفاد پرست مسلمانوں کو پیچھے دھکیل کر حکومت پر قبضہ کر لیا جائے۔ رجعت پسند طبقہ یہ یقین رکھتا تھا کہ اگر حکومت اس کے ہاتھوں میں آگئی تو وہ انقلاب اسلامی کا قلع قمع کر دے گا اور دنیا سے اسلام کا نام حرف غلط کی طرح مٹ جائے گا اور حکومت حاصل کرنے کی واحد تدبیر اس کے نزدیک یہی تھی کہ حکمران طبقہ کو اپنے تعاون کا یقین دلا کے اس کا اعتماد حاصل کر لیا جائے۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا کہ اگر اس نے برسر اقتدار طبقہ کے مقابلہ میں سر اٹھایا اور وفات رسولؐ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بغاوت کی راہ اختیار کی تو سارے مسلمان اس کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوں گے اور مفاد پسند طبقہ اپنے اقتدار کی بقاء کے لئے سچے انقلابیوں اور نظام کہن کے دشمنوں کا تعاون حاصل کر لے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ رجعت پسند اور اسلام دشمن عناصر کچل ڈالے جائیں گے اور سچے مسلمان جن کو مفاد پسندوں نے پس پشت ڈال دیا تھا دوبارہ اسلامی سیاست میں نمایاں ہو جائیں گے۔ ابوسفیان اس حقیقت کو خوب جانتا تھا کہ مسلمانوں کو اس پر یا اس کے اسلام پر اعتماد نہیں ہے اور اس کی سابقہ روش کے نتیجہ میں عام مسلمانوں میں اس کے خلاف ایک نفرت موجود ہے۔ ایسی حالت میں وہ سمجھتا تھا کہ اگر اس نے بغاوت کی راہ اختیار کی اور کھلم کھلا اسلام پر ضرب عائد کرنا چاہی تو اس کا نتیجہ مسلمانوں کے اتحاد اور ان کی بیداری کی شکل میں برآمد ہو گا اور یہ چیز اس کے مقاصد

کے خلاف تھی اس لئے اس نے حکمران طبقہ کو اپنے تعاون کا یقین دلانا شروع کر دیا تاکہ

:-

۱۔ مفاد پسند طبقہ رجعت پسندوں کی مدد سے اتنا طاقتور ہو جائے کہ سچے مسلمان اس کے مقابلہ میں بے بس ہو جائیں۔

۲۔ عام مسلمان رجعت پسندوں کی جانب سے غافل ہو کر جمود اور بے حسی کا شکار ہو جائیں اور ان میں سرکار دو عالمؐ نے نظام کہن کے خلاف جو جذبہ جہاد بیدار کر دیا تھا وہ رفتہ رفتہ فنا ہو جائے۔

۳۔ اور ایوان حکومت میں داخل ہو کر اپنی طاقت اتنی مستحکم کر لی جائے کہ وقت آنے پر سلطنت اسلامی کا تختہ الٹ کر عربستان پر دوبارہ اسلام دشمن طاقتوں کا قبضہ کرا دیا جائے۔

ابوسفیان اپنی اس چال میں کامیاب رہا' مفاد پسند حکمران چونکہ خود خوفزدہ تھے اور ان کے دلوں میں یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں سچے انقلاب پسند علیؑ کے پرچم تلے متحد ہو کر ان کی بساط حکومت نہ الٹ دیں اس لئے انہوں نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کی پوری پذیرائی کی۔ ابوسفیان کے بیٹے کو شام کی گورنری دے دی گئی اور اس طرح گویا رجعت پسند عناصر کو خرید لیا گیا لیکن حکمران اکابر قریش کے مقابلہ میں ابوسفیان کہیں زیادہ دانش مند اور بساط سیاست کا تجربہ کار کھلاڑی تھی۔ اکابر قریش اس خیال میں تھے کہ ابوسفیان اور اس کے ساتھی شام کی گورنری پر مطمئن ہو جائیں گے اور پھر وہ ہمیشہ سلطنت کے وفادار رہیں گے۔ ان کی مدد سے مہاجرین قریش ہمیشہ عربی مملکت پر راج کرتے رہیں گے لیکن ابوسفیان کی تدبیر دوسری تھی' وہ ایوان حکومت میں اس لئے نہیں داخل ہو رہا تھا کہ بنی تیم اور بنی عدی کی غلامی کرتا رہے اور اپنی طاقتیں ان کے استحکام پر صرف کرتا رہے بلکہ اس لئے داخل ہو رہا تھا کہ رفتہ رفتہ حکمران اکابر

قریش کی طاقت کو اندر سے کھوکھلا کر کے خود سلطنت اسلامی پر قابض ہو جائے۔ یہ صرف غرض کی دوستی تھی جس میں مفاد پسند اور رجعت پسند دونوں اس لئے ایک ساتھ نظر آرہے تھے کہ اپنی اپنی غرض کی تکمیل کرلیں۔ اس سیاسی کھیل میں فتح بالآخر ابوسفیان کو نصیب ہوئی۔ چنانچہ اسلامی سلطنت کے قیام کے صرف سترہ سال بعد دنیا نے ابوسفیان کو مسند خلافت سے یہ جملہ کہتے سنا کہ

> "میرے پیارے بھتیجے عثمان! بڑی مشکل سے حکومت بنی امیہ کے ہاتھوں میں آئی ہے۔ اسے بنی امیہ کے ذریعے مضبوط کر لو۔ اس سے گیند کی طرح کھیلو' اس لئے کہ جنت و نار سب ایک ڈھکوسلہ ہیں"۔

اور پھر ابوسفیان کو دنیا نے دیکھا کہ وہ اسدالرسولؐ حضرت حمزہ کی قبر مبارک کو ٹھکرا ٹھکرا کے یہ تاریخی جملہ کہہ رہا ہے۔

> "بنی ہاشم! تم نے اسی حکومت کے لئے ہم سے نزاع کی تھی اب دیکھو کہ امیہ کے فرزند اس سے کس طرح کھیل رہے ہیں"۔

ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے منصوبہ کا ایک ایک جزو پورا ہو گیا تھا۔ حکومت بنی امیہ کے ہاتھوں میں آگئی تھی لیکن رجعت پسند طبقہ یہ جانتا تھا کہ ابھی اس کی قوت مستحکم نہیں ہے۔ ابھی مسلمانوں میں انقلاب اور زندگی کی چنگاریاں موجود ہیں اس لئے اگر رجعت پسند طبقہ حکومت کے نشہ میں سرشار ہو کر اسلام پر کھل کر وار کرنا چاہتا تو وہی مسلمان جو اپنے جمود اور بے حسی کے نتیجہ میں بنی امیہ کے ایک رکن کی بیعت کرنے پر تیار ہو گئے تھے اس حرکت کو ہرگز برداشت نہ کرتے بلکہ تڑپ کر رجعت پسندوں کے مقابلہ میں صف آرا ہو جاتے۔ ان کا سویا ہوا جذبہ جہاد جاگ اٹھتا اور اسلام

کی شہ رگ پر وار ہوتے دیکھ کر ان میں وہی زندگی اور بیداری پیدا ہو جاتی جس کا مزہ رجعت پسند طبقہ بدر و احزاب کے میدانوں میں چکھ چکا تھا اس لئے حکومت ہاتھ میں آتے ہی یہ کوشش شروع کی گئی کہ مسلمانوں کے نفوس کو بگاڑ دیا جائے' ان کی ہمت توڑ دی جائے' ان سے زندگی اور انقلاب کے جوہر چھین لئے جائیں۔ ان کا نظم برباد کر دیا جائے' ان کی قوت پریشان کر دی جائے اور جب عام مسلمان سیاسی اور روحانی اعتبار سے بالکل مفلوج اور ناکارہ ہو جائیں تو سچے انقلابیوں کی اس جماعت پر وار کیا جائے جو آج تک رسول اکرمؐ کے مقدس مشن کو کلیجے سے لگائے اس نظام نو کی خاموش تبلیغ کر رہی تھی جسے سرکار دو عالمؐ قائم فرمانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے:۔

۱۔ اسلامی سلطنت کے ہر صوبہ کی گورنری بنی امیہ کے سپرد کر دی گئی تاکہ وہ ظلم و ستم رانی کی قوتوں سے سچے مسلمانوں میں خوف و ہراس پھیلا دیں اور ان میں نظام کے قیام کی جو خواہش موجود ہے وہ افسردہ اور پامال ہو جائے۔

۲۔ اسلامی بیت المال کو بنی امیہ کی "گھریلو املاک" بنا دیا گیا تاکہ جہاں ایک طرف رجعت پسند طبقہ مالی اعتبار سے قوی ہو جائے' وہیں عام مسلمان افلاس و تنگ دستی کے نتیجہ میں زندگی کی حرارت سے محروم ہو جائیں۔

۳۔ جن مسلمانوں کے متعلق یہ معلوم تھا کہ وہ انقلاب اسلامی کے سچے داعی اور نظام کے قیام کے سچے خواہش مند ہیں ان پر مظالم شروع کر دیے گئے۔ چنانچہ عمار یاسر اور ابوذر کے ساتھ خلافت ثلاثہ میں جو سلوک روا رکھا گیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

۴۔ مقتدر اور صاحب اثر صحابہ کو مدینہ سے دور دور بھیج دیا گیا تاکہ عام مسلمانوں کی ہمت شکستہ ہو جائے اور ان میں حکومت وقت کی کار فرمائیوں کو چیلنج کرنے کی قوت باقی نہ رہے۔

۵۔ قریش کے وہ ممتاز اکابر جو سابقہ حکومتوں کے دور میں بڑے اقتدار کے مالک تھے مکمل طور پر نظرانداز کئے جانے لگے تاکہ عوام پر ان کا جو اثر ہے اس کا بھی خاتمہ ہو جائے۔

اموی سیاست کی یہ تدبیر بڑی حد تک کامیاب ہوئی چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ چند ہی سال میں مسلمانوں کی ہمت ٹوٹ گئی۔ ان کا نظم برباد ہو گیا۔ ان کی جرات سلب ہو گئی۔ ان کا عزم حیات مردہ ہو گیا۔ ان کی ایمانی جذباتیت اور ان کا انقلابی ولولہ سرد پڑ گیا اور وہ ایک ایسی مفلوج سراپا جمود اور مردہ جماعت میں تبدیل ہو گئے جو کسی اصولی جنگ میں حصہ لینے کے قابل نہیں کہی جا سکتی، جسے انقلاب اور اس کے اعلیٰ مقاصد سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی جو اس بلند تر نظام حیات کا تصور بھی کھو بیٹھی جو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اور جو اخلاقی اور اجتماعی اعتبار سے ایک ایسی مردہ اور فنا پذیر جماعت بن گئی جو ایک انقلابی تحریک میں معاونت کرنا تو درکنار کسی ایسی تحریک کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یقین نہ ہو تو حضرت عثمان کے دور حکومت کے آخری ایام پر ایک سرسری نظر ڈال لیجئے۔ حالت یہ تھی کہ خلیفہ وقت کا مکان مٹھی بھر مصریوں نے گھیر رکھا تھا اور وہی مدینہ کے لوگ جنہوں نے ایران، مصر و شام کی حکومتوں کے تختے الٹ دیئے تھے، جنکی تلواروں کی کاٹ سے ساری دنیا لرز رہی تھی اور جنہوں نے قیصر کا غرور اور کسریٰ کی تمکنت خاک میں ملا دی تھی ان مٹھی بھر مصریوں سے خائف گھروں میں زنجیریں دیئے بیٹھے تھے اور ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ خلیفۃ المسلمین کی کوئی مدد کر سکیں۔ اسی سے ان کے عزم و ہمت کی شکستگی اور ان کے عسکری نظم کے خاتمہ کا اندازہ کر لیجئے اور پھر سوچئے کہ بنی امیہ کے دس سالہ دور حکمرانی نے مسلمانوں کو کس حد تک مردہ اور ان کی سیرت کو کس حد تک مسخ کر دیا تھا۔

بنی امیہ مسلمانوں کو مسخ کر چکے تھے لیکن ابھی اسلام پر وار کرنا ان کے لئے ممکن

نہیں تھا۔ اس کے لئے ابھی کچھ اور وقت درکار تھا کہ اچانک ایک ذرا سی غلطی نے ساری بساط الٹ کر رکھ دی۔ محمد بن ابی بکر اور مصریوں سے وعدہ خلافی کا مظاہرہ کیا گیا اور اس کے نتیجہ میں بنی امیہ کے اقتدار کا محل لرز اٹھا۔ معاملہ چھوٹا سا تھا' چنگاری معمولی تھی لیکن اسی معمولی سی چنگاری سے ایک عظیم انقلاب کے شرارے بھڑک اٹھے۔ حضرت عثمان قتل کر دیئے گے اور عنان اقتدار ان سچے انقلاب پسندوں کے ہاتھوں میں آ گئی جو پیغمبر اسلامؐ کے دوش بدوش اسلام کے ذہنی روحانی اور الہٰی انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے جان و دل کی بازی لگا چکے تھے اور آج بھی اس الہٰی نظام کے قیام کے شدت سے آرزومند تھے جسے نبی کریمؐ وجود میں لانا چاہتے تھے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام خلیفہ بنا دیئے گے اور اس طرح اسلامی سیاست میں ایک عظیم انقلاب رونما ہو گیا۔

اسلامی دنیا کے لئے یہ انتہائی نازک وقت تھا اور مسلمان اس موقع پر پانچ طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔

۱۔ اسلامی انقلاب اور الہٰی نظام زندگی کے سچے پرستار جو اسلامی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ہر قسم کی قربانی پیش کرنے پر تیار تھے۔ اس طبقہ کی قیادت وفات رسولؐ کے بعد سے آج تک ہمیشہ علی علیہ السلام کے ہاتھوں میں رہی تھی اور یہی رسول اللہؐ کے اس عظیم روحانی ورثہ کے امین تھے جن پر الہٰی نظام کی کامیابی کا انحصار تھا۔

۲۔ وہ مہاجرین و انصار جو سابقہ حالات سے بددل ہو کر اپنا ذوق جہاد اور اپنا ولولہ انقلاب بڑی حد تک کھو چکے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی جاہلی نظام کی بازیابی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

۳۔ شکست خوردہ ذہنیت کے مسلمان جو نہ انقلاب پسندوں کے ساتھ مل کر بقائے

اسلام کی جدوجہد کرنے پر تیار تھے اور نہ رجعت پسندوں کے مقابلہ میں لب کشائی کی جرات رکھتے تھے۔ یہ طبقہ ابوموسیٰ اشعری اور ان کے امثال کا تھا جو کھڑے رہنے کے مقابلہ میں بیٹھنے کو، اور بیٹھنے کے مقابلہ میں لیٹنے کو اور لوہے کی تلوار کے مقابلہ میں لکڑی کی تلوار کو ترجیح دینے لگے تھے۔

۴۔ زرپرست اور مفاد پرست طبقہ جسے حق و باطل کی کسی اصولی کشمکش سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ان کو صرف اپنے ذاتی اقتدار اور حصول دولت سے دلچسپی تھی۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اسلام کا کیا حشر ہوتا ہے۔ ان کی ساری جدوجہد کا مرکز خود ان کی ذات تھی۔ طلحہ و زبیر وغیرہ اسی طبقہ کے لوگ تھے جن کو کوفہ اور بصرہ کی گورنری حاصل نہیں ہوئی تو وہ اس کا لحاظ کئے بغیر کہ دمشق کے گوشوں سے اسلام کے خلاف ایک زبردست طوفان اٹھ رہا ہے۔ امیرالمومنینؑ کے مقابلہ میں صف آرا ہو گئے۔ ان کا یہ اقدام بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ ان کو اسلام کی زندگی اور موت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور ان کی ساری سرگرمیوں کا محور خود ان کا ذاتی اقتدار اور نفع تھا۔

۵۔ اسلامی انقلاب کے دشمن رجعت پسند عناصر جو پرانے جاہلی نظام کو واپس لانے کے خواہش مند تھے اور امیر معاویہ کی سرکردگی میں شام کو اپنا سب سے طاقتور مورچہ بنا چکے تھے، امیر معاویہ وہی بزرگ تھے جو بدر و احد و احزاب وغیرہ میں اپنے والد ابوسفیان کے ساتھ پیغمبر اسلامؐ کے مقابلہ میں صف آرا ہو چکے تھے اور اسلامی تحریک انقلاب کو مٹا ڈالنے کا وہی جذبہ اپنے دل کے اندر رکھتے تھے جو خود ان کے والد اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد کے دلوں میں موجزن تھا۔

خلافت عثمانی کا خاتمہ ہوتے ہی رجعت پسند اور انقلاب دشمن طبقہ کے سامنے

تین راہیں آئیں:۔

۱۔ جمہور مسلمین کے فیصلہ کے مطابق امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کرلی جائے لیکن ایسا کرنے کے معنی یہ ہوتے کہ اسلامی نظام نہ صرف یہ کہ قائم ہو جاتا بلکہ اتنا مضبوط بھی ہو جاتا کہ پھر اسے مٹانا محال ہو جاتا۔ ایسی حالت میں رجعت پسندوں اور ان کے پسندیدہ اصولوں کا ختم ہو جانا یقینی تھا جسے ظاہر ہے کہ وہ قبول نہیں کرسکتے تھے۔

۲۔ کچھ عرصہ تک خاموشی اور انتظار کی پالیسی پر عمل کیا جاتا لیکن اس میں اندیشہ یہ تھا کہ نظام اسلامی کے داعیان کے قدم جم جاتے عوام میں ان کا اثر و رسوخ بڑھ جاتا۔ سوئے ہوئے مسلمان بیدار ہو جاتے۔ کھوئی ہوئی ہمت بازیاب ہو جاتی اور اسلامی نظام حکومت و معاش کی عملی تصویر نگاہوں کے سامنے آجانے کے بعد مسلمان دوبارہ اس جاہلی نظام سیاست کو ہرگز قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوتے جسے بنی امیہ اور رجعت پسند دنیا پر نافذ کرنا چاہتے تھے۔

۳۔ تیسرا راستہ صرف یہ تھا کہ حضرت عثمان کے قتل اور حضرت عائشہ کی مخالفت کے نتیجہ میں مسلمانوں میں ذہنی اور سیاسی انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوری طور پر امیرالمومنین حضرت علیؑ کے خلاف بغاوت کر دی جائے اور اس طرح اسلامی انقلاب کے داعیان کو اپنے قدم مضبوط بنانے سے روک لیا جائے۔ سیاسی اعتبار سے یہی تیسرا طریقہ صحیح اور مفید ہو سکتا تھا چنانچہ امیر معاویہ نے قصاص خون عثمان کا نعرہ بلند کر کے سلطنت اسلامی کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ سچے مسلمان اور نظام اسلامی کے شیدائی سمجھ گئے کہ امیر معاویہ کا مقصد حضرت عثمان کے خون کا انتقام لینا نہیں بلکہ اصل مقصد اسلام کی انقلابی تحریک کو فنا کر دینا ہے چنانچہ انہوں نے وہی کیا جو اسلام دشمنوں کے مقابلہ

میں دور رسالتؐ میں کیا جاتا تھا' وہ معاویہ شاہی کے مقابلہ میں سروں سے کفن باندھ کر میدان میں کود پڑے اور صفین کے میدان میں حق و باطل' الوہیت و شیطنت کا وہی معرکہ گرم ہو گیا جس کی مثال بدر و احد کے میدانوں میں مل چکی تھی۔ اس معرکہ میں امیرالمومنینؑ کو مہاجرین و انصار کے اس طبقہ کا پورا تعاون حاصل ہوا جو دور عثمانی میں بے عملی کا شکار ہو چکا تھا لیکن نظام باطل کا غلبہ برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس طرح مسلمانوں کے اول الذکر دو طبقے امیرالمومنینؑ کے پرچم تلے متحد ہو گئے۔ باقی رہے تین طبقے تو ان میں سے ایک تو کٹر رجعت پسندوں کا طبقہ تھا جو حکومت الٰہیہ اور نظام اسلامی کے تمام تصورات کو مٹا دینے کا آرزومند تھا۔ وہ تمام تر امیر معاویہ کے ساتھ تھا۔ زرپاشی کی مدد سے امیر معاویہ نے زرپرست مسلمانوں کو بھی خرید لیا اور شکست خوردہ ذہنیت کے بزدل لوگ شامیوں کا پلہ بھاری دیکھ کر رفتہ رفتہ خود ہی امیر معاویہ کے ساتھ ہو گئے۔ امیر معاویہ کے عروج کے ساتھ اسلام میں بادشاہت' جاگیرداری' زراندوزی' عشرت پسندی' غرض ایام جاہلیت کی تمام برائیاں عود کر آئیں اور بنی امیہ کی حکومت انقلاب اسلامی کے لئے سب سے بڑا چیلنج بن گئی۔ یہ تھے مختصراً حالات جن میں آل رسولؐ کے محترم ارکان کو بقائے اسلام کی سعی و جہد کرنا تھی اور ان کے عظیم مجاہدات کا مطالعہ کرتے وقت اس پس منظر کو نگاہ میں ضرور رکھنا چاہیے کیونکہ تب ہی ہم ان شاندار کامیابیوں اور کامرانیوں کا صحیح احساس کر سکیں گے جو اس مجاہدۂ حق و باطل میں آل رسولؐ کو نصیب ہوئیں۔

☆———☆☆———☆

آل رسولؑ کا مقصد

تاریخ اسلام کی یہ انتہائی بد قسمتی ہے کہ آل رسولؑ کی تحریک کو بادشاہوں کی سعی کشور کشائی کے پیمانہ سے ناپا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعد رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام سریر آرائے خلافت نہیں ہوئے۔ امام حسن علیہ السلام تخت حکومت چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے یا امام حسین علیہ السلام کے مقابلہ میں تاج شاہی یزید کے سر پر جگمگاتا رہا تو ہم یہ فیصلہ کر دیتے ہیں کہ آل رسولؑ کو ناکامی اور محرومی کی زندگی بسر کرنا پڑی۔ چودہ سو سال تک شاہی و سلطانی کے نظام میں زندگی بسر کرتے رہنے کے نتیجہ میں ہماری یہ کچھ عادت سی ہو گئی ہے کہ ہم آل رسولؑ کے ہر اقدام کو ناکامی اور محرومی کی زندگی بسر کرنا پڑی۔ چودہ سو سال تک شاہی و سلطانی کے نظام میں زندگی بسر کرتے رہنے کے نتیجہ میں ہماری یہ عادت سی ہو گئی ہے کہ ہم آل رسولؑ کے ہر اقدام کو حصول سلطنت کی ایک کھلی یا ڈھکی اعلانیہ یا خفیہ کوشش تصور کرنے لگے ہیں۔ یہی وہ غلطی ہے جس کے نتیجہ میں ہم نہ صرف یہ کہ اسلامی تحریک کے حقیقی خدوخال سے ناآشنا رہتے ہیں بلکہ آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح تاریخ اور ان کے عظیم کارناموں کا اندازہ کرنا بھی ہمارے لیے دشوار ہو جاتا ہے۔

ہمارے لاشعور میں یہ خیال راسخ ہو چکا ہے کہ حکومت بنی ہاشم کا حق تھی اور وہ اپنے اس حق سے محروم کر دیے گئے۔ انہوں نے چند مرتبہ یہ کوشش بھی کی کہ تاج خلافت ان کو نصیب ہو جائے لیکن بنی امیہ نے روپے اور تلوار کے بل پر ہر کوشش ناکام بنا دی اور ان پیہم ناکامیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر آئمہ اہل بیتؑ اس باب میں قطعاً

مایوس ہو کر خانہ نشین ہو گئے لیکن ظالموں نے ان کو پھر بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ وہ بار بار اسیر کیے گئے، نشانہ ستم بنائے گئے اور ایک ایسی حسرت انگیز و یاس آگیں زندگی بسر کرتے رہے جو تاریخ درد و الم میں اپنی نظیر آپ ہے۔

یہ تصور بجائے خود آل رسولؐ پر ایک ہولناک ظلم کے مترادف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آل رسولؐ کے مقدس افراد کو بادشاہی کے ملعون تصور سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ سرے سے اس انسانی حاکمیت کے قائل ہی نہیں تھے جس کا ایک نمونہ بادشاہت ہوا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب بنی امیہ کو بنی عباس کے ہاتھوں شکست ہوئی اور حکومت آل ہاشمؑ کے ہاتھوں میں آگئی تو اس ہاشمی حکومت سے بھی جسے بنی عباس کی حکومت کہا جاتا ہے آئمہ آل رسولؐ کا اسی طرح ٹکراؤ جاری رہا جس طرح آل امیہ سے جاری رہ چکا تھا۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض امام زادوں نے حصول حکومت کی کوشش کی لیکن ہمارے آئمہ نے ان کی کوئی امداد نہیں کی۔ ان مواقع پر آئمہ کی خاموشی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بنی امیہ یا بنی عباس کے مظالم سے خائف تھے بلکہ حقیقت صرف یہ تھی کہ جو امامزادے حصول حکومت کے لیے جنگ کر رہے تھے وہ بھی انسانی حاکمیت کے داعی تھے اور چونکہ آئمہ اہل بیتؑ کو اس اصول سے قطعاً" اختلاف تھا اس لیے وہ ان لوگوں سے بھی اس طرح علیحدہ رہے جس طرح انسانی حاکمیت کے ان علمبرداروں سے دور رہے جن کو بنی امیہ یا بنی عباس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آئمہ علیہم السلام خلافت الٰہیہ کے دعویدار رہے اور اس دعوے پر وہ شدت سے اٹل تھے کہ سخت سے سخت مظالم کے باوجود انہوں نے اپنے اس دعوے کو ترک نہیں کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ الٰہیہ اور دنیوی بادشاہت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اتنا ہی فرق جتنا کہ تاجور مامون الرشید اور بوریہ نشین امام رضاؑ میں تھا خلافت ایک منصب دینی ہے جس میں صاحب امراللہ کی جانب

سے معاشرہ اسلامی کی تنظیم، سرحدوں کی مدافعت، واجبات الہیہ کی وصولیابی، شریعت حقہ کی حفاظت اور دین الٰہی کی تبلیغ و اشاعت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ انسانوں پر "حکومت" نہیں کرتا اس لیے کہ حکومت کا حق صرف اللہ کو ہے۔ وہ صرف شریعت کی راہ پر انسانوں کی "قیادت" کرتا ہے جس کے لیے وہ مامور ہوتا ہے وہ بادشاہ نہیں ہوتا قائد یا امام ہوتا ہے۔ آل رسولؐ کو یہ منصب من جانب اللہ حاصل تھا اسے ان سے کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔ اس لیے اس مسئلہ پر ان کو کسی سے کوئی تنازعہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کو بنی امیہ یا بنی عباس سے خلافت الہیہ کے مسئلہ پر کوئی اختلاف نہیں تھا اس لیے کہ مادی قوت اور ظاہری شوکت کے باوجود یہ سلاطین ان سے ان کا الٰہی منصب نہیں چھین سکتے تھے۔ اختلاف تھا تو اس سوال پر کہ ان سلاطین نے مسلمانوں پر انسانی حاکمیت کا اصول نافذ کر کے ان کی آزادی کو غلامی میں تبدیل کر دیا تھا اور مسلمانوں کے سچے قائدین اس صورت حال کو برداشت کرنے پر تیار نہیں تھے۔ وہ لڑتے تھے مسلمانوں کی حقیقی آزادی کے لیے شریعت کی بقاء کے لیے اسلامی نظام کے قیام کے لیے اور اس حکومت الہیہ کو وجود میں لانے کے لیے جس کے قیام کی خاطر خاتم المرسلینؐ نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی وہ اسلامی تحریک انقلاب کے داعی تھے اور ان کا ہر قدم اسی انقلاب کے تکملہ کے لیے اٹھا کرتا تھا۔ ایسی حالت میں نہ تو ان کے کردار پر ایک طلبگار سلطنت کے کردار کی حیثیت سے نظر ڈالی جا سکتی اور نہ جہاد زندگی میں ان کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ اس حیثیت سے کیا جا سکتا ہے۔

آل رسولؐ کے محترم ارکان کی حیثیت اسلامی تحریک انقلاب کے قائدین کی ہے اور ان کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ ان کی اسی حیثیت کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے۔

ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے اسلامی نظام کو اغیار کی دست برد سے محفوظ رکھنے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی۔ اسلام کے سیاسی معاشی اور تمدنی نظریات کو لٹ

جانے سے کہاں تک محفوظ رکھا؟ حکومت الہیہ کے جس تصور کو شیطان مٹا دینا چاہتا تھا اسے سلاطین کی دست برد سے بچانے میں کس حد تک کامیاب ہوئے۔ شریعت اسلامی کو اس کے اصلی خدو خال کے ساتھ برقرار رکھنے کا فریضہ کہاں تک انجام دیا؟ ملت اسلامیہ کی رہنمائی کے فرائض کس حد تک انجام دیئے؟ تبلیغ و اشاعت اسلام میں کس حد تک معاون ہوئے؟ اور اسلامی تحریک انقلاب کو پروان چڑھانے میں ان کو کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی؟ اور انہیں امور کا اندازہ کرنے کے بعد ہم یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ آل رسولؐ کے محترم ارکان جہاد حق و باطل میں کامران و بامراد ثابت ہوئے یا ناکام و نامراد!

بد قسمتی سے اسلامی تاریخ کبھی کسی اصول کو سامنے رکھ کر نہیں لکھی گئی بلکہ اسے محض چند بادشاہوں کی کہانی بنا دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، معاشی اخلاقی اور تمدنی تحریکات کو سمجھنا آسان نہیں رہا ہے۔ آل رسولؐ کا کردار چونکہ ایک خاص اصول اور ایک خاص روحانی، اخلاقی اور انقلابی تحریک سے وابستہ تھا اس لیے بادشاہوں کی کہانی میں اس کا صحیح موقف تلاش کرنا بہت دشوار ہو گیا ہے اور جب تک تاریخ پر گہری نگاہ نہ ڈالی جائے حالات کی پوری چھان بین نہ کی جائے، واقعات کے پس منظر پر نظر نہ رکھی جائے ذہنی اور سیاسی کیفیات کا تجزیہ نہ کیا جائے پس پردہ عوامل اور نفس انسانی کے محرکات کا پتہ نہ چلایا جائے تب تک آل رسولؐ کا حقیقی کردار تاریخ اسلام میں ان کا صحیح مقام اور اسلامی معاشرہ میں ان کا اصلی موقف معلوم کرنا قطعاً ناممکن ہے۔

تاریخ کا ہر واقعہ کسی سبب کا نتیجہ ہوتا ہے، اس کی پشت پر کچھ عوامل ہوتے ہیں، کچھ خاص محرکات ہوتے ہیں۔ ایک مخصوص ذہنی پس منظر ہوتا ہے، ایک خاص طرز فکر اس کا خالق ہوتا ہے اس لیے جب تک کسی دور کے فکری رجحانات کا اندازہ نہ ہو،

سیاسی، معاشی، تہذیبی اور فکری پس منظر معلوم نہ ہوں۔ تاریخی شخصیتوں کی ذہنی کیفیات اور ان کے مقاصد کا پتہ نہ چلایا جائے۔ ان کی نفسیاتی کیفیت پر نظر نہ رکھی جائے اور ان عوامل کو معلوم نہ کیا جائے جو اس وقت کار فرما تھے تب تک کسی واقعہ کی حیثیت یا تاریخ میں اس کے مقام کا فیصلہ کرنا قطعاً فضول سی بات ہے آل رسولؐ کی تاریخ کے سلسلہ میں یہ غلطی اور زیادہ شدت سے نمایاں ہے اس لیے کہ کچھ تو دور تقیہ کے اثرات کے نتیجہ میں اور کچھ ذہنی انحطاط کی بدولت آل رسولؐ کی تاریخ مرتب کرتے وقت ان امور کا بہت کم لحاظ رکھا گیا اور یہی وجہ ہے کہ نسل انسانی کے ان منصوص من اللہ قائدین کی جو عظمت ہمارے دلوں میں ہونا چاہیے تھی، ان کی بے پناہ قائدانہ صلاحیتوں کا جو احساس ہمارے قلوب پر ہونا چاہیے تھا اور ان کی امامت کبریٰ کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمانوں کو جو عدیم النظیر فوائد نصیب ہوئے ان کا جو نقش ہمارے ذہنوں پر ہونا چاہیے تھا وہ بہت کم نظر آتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہم ان کی محبت کو سرنامہ ایمان اور ان سے عقیدت کو پروانہ نجات تصور کرتے ہیں لیکن عشق و عقیدت کی ولوی سے ذرا دور ہو کر ان کی جو فکری عظمت ہمارے دلوں میں ہونا چاہیے اس سے کم از کم ہمارے عوام قطعاً" بے بہرہ ہیں اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ آل رسولؐ کی تاریخ کو آج تک صحیح طور پر مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس مقالہ میں ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم آل رسولؐ کی تاریخ مرتب کرنے کا ایک ڈھنگ بتا دیں۔ ایک راستہ تیار کر دیں جس پر چل کر دوسرے ارباب فکر و قلم آل رسولؐ کی مکمل تاریخ مرتب کریں اور ہمیں امید ہے کہ اگر اس طریقہ پر تاریخ از سر نو ترتیب ہو گئی تو نہ صرف یہ کہ آل رسولؐ کی عظمت کے ہزاروں نئے گوشے دنیا کے سامنے آ جائیں گے، بلکہ جہاد حق و باطل میں حق پرستوں کی شاندار کامیابیوں کی یہ داستان خود ہماری نسل میں حق پرستی کا وہ ولولہ اور وہ عزم پیدا کر دے گی

جس سے باطل کا قصر لرزہ براندام ہو جائے گا۔

☆☆☆

سیاست علویہ کا پہلا مظاہرہ

پیغمبر اسلامؐ نے اپنی حیات طیبہ کے دوران ہی اسلام کا پیغام عرب کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا تھا لیکن ایک عالمگیر دین کی حیثیت سے اسلام کا مقصد ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ ایک مختصر سی زندگی میں ساری دنیا کو مسلمان بنا دینا ناممکن تھا چنانچہ حضرت سرور کائناتؐ نے انتہائی بصیرت کا مظاہرہ فرماتے ہوئے مستقبل میں بقاء و اشاعت اسلام کا ——— نیز خود عربستان میں منافقین کے مقابلہ میں اسلام کے تحفظ کا ضروری بندوبست فرما دیا۔ آپ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں حجتہ الوداع سے واپسی کے موقع پر غدیر خم کے میدان میں اپنے وصی و جانشین کی نامزدگی فرما دی تاکہ آپ کے بعد اسلام کی دعوت انقلاب افراتفری کا شکار ہو کر تباہ نہ ہو جائے اور کاروان حق ایک ایسے قائد کی سرکردگی میں برابر آگے بڑھتا رہے جس کی عظیم صلاحیتوں کا خود دور رسالت میں کافی شاندار اور کامیاب تجربہ کیا جا چکا تھا۔ میدان غدیر میں من کنت مولا فہذا علی مولاہ کے تاریخی ارشاد کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمان اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ :۔

> سرور کائناتؐ کے بعد اسلام کی انقلابی تحریک کو اندرونی دشمنوں سے محفوظ رکھنے اور دنیا کے گوشہ گوشہ تک اس تحریک کو عام کرنے کی صلاحیت علیؑ کے علاوہ اور کسی دوسرے شخص میں نہیں ہے اس لیے بادشاہت کا تاج خواہ کسی کے سر پر جگمگائے لیکن جہاں تک اسلامی تحریک کا تعلق ہے اسلام کی دعوت انقلاب کا تعلق ہے، شریعت اسلامیہ کو اس کی تمام خوبیوں کے ساتھ قائم

رکھنے کا تعلق ہے اور قومی یا عربی سیاست سے قطع نظر خود دین اسلام کے مفاد کا تعلق تھا مسلمانوں کی قیادت و امارت کا مستحق علیؑ کے سوا کوئی دوسرا نہیں' وہی سفینہ اسلام کا ناخدا ہو گا' وہی ملت کے دینی مفاد کا پاسبان ہو گا اور دین کا مستقبل اسی کی ذات گرامی سے وابستہ ہو گا"۔

اسی ارشاد کی روشنی میں حضرت ختمی مرتبتؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی تحریک اسلامی کی قیادت کا بار گراں حضرت علی علیہ السلام کے کاندھوں پر آ گیا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ نے اس گرانقدر ذمہ داری کو کماحقہ پورا فرمایا جو اللہ' رسولؐ اور اسلام کی جانب سے آپ پر عائد کی گئی تھی۔

حضرت علی علیہ السلام نے تحریک اسلامی کی قیادت جس وقت سنبھالی وہ تاریخ اسلام کا انتہائی نازک' حوصلہ شکن اور پر آشوب دور تھا' اس لیے کہ ـــــــ

۱۔ حضرت ختمی مرتبتؐ کے انتقال کی وجہ سے مسلمانوں کو جو صدمہ عظیم پہنچا تھا اور اس کے نتیجہ میں ملت کو ہولناک دھچکا لگا تھا اس نے یقینی طور پر مسلمانوں کے ذہنوں کو پراگندہ دلوں کو افسردہ اور قلوب کو مضمحل کر دیا ہو گا۔ اس سانحۂ عظمیٰ کا لازمی نتیجہ ایک فکری انتشار اور ایک ذہنی کرب ہی کی صورت میں نمایاں ہو سکتا تھا چنانچہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا مسلمان مرگ رسولؐ کی اطلاع پاتے ہی حواس کھو بیٹھے اور ان کو مستقبل بالکل تاریک اور غیر یقینی نظر آنے لگا۔ مملکت اسلامی کی شامی سرحدوں سے پہلے ہی وحشت خیز خبریں آ چکی تھیں۔ مقابلہ کے لیے رسولؐ نے جو لشکر تیار کیا تھا اس میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں مسلمانوں میں جتنی بھی گھبراہٹ نہ پھیل جاتی وہ کم تھی۔ موقع پرستوں نے اسی صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا اور عین اس وقت جب کہ بنی ہاشم تدفین رسولؐ

میں مصروف تھے حضرت ابو بکر کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ پراگندہ ذہن "افسردہ دل" شکستہ عزم اور خوفزدہ مسلمانوں نے اس فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور اس طرح ایک حواس باختہ قوم اپنی قیادت کے سلسلہ میں ایک اتنا غلط اور مہلک فیصلہ کر بیٹھی جس کا بھگتان آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔

۲۔ اسلامی حکومت ایسے ہاتھوں میں چلی گئی جو اس حکومت کو اسلامی دعوت کے عام کرنے اور الٰہی انقلاب کو وجود میں لانے کا ذریعہ بنانے پر تیار نہیں تھے بلکہ اس حکومت کے نتیجہ میں عربی شہنشاہیت وجود میں لانے کے خواہش مند تھے۔

۳۔ عرب میں ارتداد کا فتنہ سر اٹھا رہا تھا اور مرتدین کی فوجیں مدینہ کی طرف کوچ کر رہی تھیں۔

۴۔ شام میں قیصر کی فوجی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں اور مسیحی قوتوں سے مسلمانوں کے ٹکراؤ کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔

۵۔ سعد بن عبادہ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا تھا اس کے نتیجہ میں انصار کے ایک بڑے طبقہ میں حکومت وقت کی جانب سے ایک عام بد دلی اور افسردگی کے آثار پیدا ہو گئے تھے ابھی اس بد دلی کا محض آغاز تھا لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ اتنی بڑھی کہ انصار اسلامی سیاست سے قطعاً" بے تعلق ہو گئے۔ چنانچہ اسلامی تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ سرکار دو عالمؐ کے بعد ہمیشہ مہاجرین اور قریش سلطنت اسلامی کے کرتا دھرتا بنے رہے اور انصار کا بہ حیثیت مجموعی سیاسی مسائل سے تعلق صفر سے زیادہ نہیں رہا۔ ملت اسلامیہ کے اتنے بڑے اور پر جوش حصہ کے مسائل ملی سے کنارہ کش ہو جانا تاریخ اسلامی پر جتنے ہولناک اثرات چھوڑ سکتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

۶۔ ابو سفیان اور اس کے اسلام دشمن ساتھی خود مدینہ میں موجود تھے اور اس

موقع کے منتظر تھے کہ مرتدین کو ذرا بھی غلبہ نصیب ہو تو مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیں۔

۷۔ انقلاب اسلامی کے سچے شیدائی اور دعوت الٰہیہ کے حقیقی نقیب بہت کم تھے اور زمانہ نے ایک ایسی پر آشوب کروٹ لے لی تھی کہ وہ خاموش رہنے پر مجبور تھے۔

۸۔ حکومت جن مفاد پسندوں کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی وہ اپنے استحکام کے لیے رجعت پسندوں کا تعاون بھی قبول کر سکتے تھے اس لیے حکومت اسلامی کی اصولی اساس متزلزل ہو گئی تھی۔

۹۔ خلافت کے سلسلہ میں ایک غلط اصول وضع کر لیے جانے کا نتیجہ یہ تھا کہ خود مسلمانوں کے گمراہ ہو جانے کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا، ایسی حالت میں غیر ممالک میں تبلیغ اسلام کرنے کے مقابلہ میں یہ ضروری ہو گیا تھا کہ خود ان مسلمانوں پر احقاق حق کر دیا جائے جو مفاد پسندوں کی کوشش کے نتیجہ میں خلافت الٰہیہ کو عربی ملوکیت سمجھ کے دین کے باب میں ایک شدید غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔

امیر المومنین "طلب گار سلطنت" ہوتے تو اس نازک موقع پر تلوار نکال کر قسمت آزمائی کے لیے میدان میں اتر آتے لیکن آپ کو سلطنت عزیز نہیں تھی۔ آپ "بادشاہ" نہیں تھے جو حصول حکومت کے لیے قوم کے مفاد کو نظر انداز کر دیتے۔ آپ امام تھے۔ قوم کے منصوص من اللہ قائد، دین کے پاسبان اور ملت کے محافظ۔ آپ کی توجہ سلطنت پر نہیں تھی بلکہ اس دین کی بقاء پر مرکوز تھی جس کی کامیابی کے لیے آپ شب ہجرت چار سو ننگی تلواروں کے سائے میں آرام کی نیند سو گئے تھے یا جس کی خاطر آپ نے اپنی جوانی کے پر بہار ایام خیبر و خندق کے خونفشاں مورچوں کی نذر کر دیے تھے۔ آپ نے حالات کا مدبرانہ جائزہ لیا اور یہ فیصلہ کیا کہ۔

مسئلہ خلافت پر نہ صرف یہ کہ جنگ نہ کی جائے بلکہ حکمران طبقہ سے محدود تعاون کی پالیسی اختیار کی جائے"۔

آپ کے اس مدبرانہ فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ:۔

ا۔ ابوسفیان اور اس کے اسلام دشمن ساتھی مسلمانوں میں جس خانہ جنگی کا خواب دیکھ رہے تھے وہ وجود میں نہیں آئی اور رجعت پسندوں کی تمنا دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

۲۔ مفاد پسند حکمران طبقہ کو آپ کی جانب سے جنگ کا جو خطرہ تھا وہ دور ہو گیا اور اس کے نتیجہ میں اس نے جیش اسامہ کو شام کی طرف روانہ کر دیا۔ اس طرح قیصر کی جانب سے مسلمانوں کو جو دھڑکا لگا ہوا تھا وہ دور ہو گیا اور اسلام کے لیے بیرونی دشمنوں کی جانب سے جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا وہ دفع ہو گیا۔

۳۔ مسلمانوں نے اپنی حکومت کے باب میں جو فیصلہ کر دیا تھا وہ چاہے کتنا ہی غلط سہی مگر چونکہ اسے چیلنج نہیں کیا گیا تھا اس لیے مسلمانوں کو سکون کے چند لمحات میسر آگئے' ان کو ایک طاقتور حکومت بن جانے کا احساس پیدا ہو گیا جس کے نتیجہ میں ان کی گھبراہٹ' ان کا انتشار' ان کا خوف اور سرور کائنات کی جانک انتقال کے نتیجہ میں پھیلی ہوئی سراسیمگی دور ہو گئی۔ ان میں پھر ایک بار ہمت' خود اعتمادی' جرأت اور جہد للبقاء کے جوہر بیدار ہو گئے اور قوم کے نظم (MORALE) پر جو خراب اثرات پڑ رہے تھے ان کا خاتمہ ہو گیا۔

۴۔ حکومت وقت سے ٹکراؤ کے نتیجہ میں پیغمبر اسلامؐ کے بلند مرتبت شاگردوں' تحریک اسلام کے سچے علمبرداروں' الٰہی نظام نو کی حقیقی معرفت رکھنے والوں اور دعوت انقلاب کے صحیح مفہوم کو جاننے اور سمجھنے والوں کی وہ مختصر سی جمعیت قتل ہو جاتی جس پر آئندہ اسلامی تصور حیات کو عام کرنے کا انحصار تھا۔ امیر المومنینؑ

نے خاموشی برت کے اس جماعت کو بچالیا اور اسطرح مستقبل میں حقیقی اسلام کی اشاعت کا بندوبست کر دیا۔

۵۔ خانہ جنگی وجود میں نہ آنے کی وجہ سے حکمران طبقہ آسودہ ہو کر مرتدین کے مقابلہ میں صف آرا ہو گیا اور اس طرح عرستان کے اندر اسلام کو جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا اس کا استیصال ہو گیا۔ مسلمانوں کے اتحاد کے نتیجہ میں جہاں مرتدین کے مقابلہ میں ایک متحدہ محاذ وجود میں آ گیا وہیں ان منافقین کی ہمت بھی شکستہ ہو گئی جو مرتدین کو غلبہ پاتے دیکھ کر مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دینے کی فکروں میں مشغول تھے۔

امیر المومنینؑ نے اس موقع پر اسی سیاست کا مظاہرہ فرمایا جس کی تعلیم آپ نے حضرت ختمی مرتبتؐ سے حاصل فرمائی آپؐ کا یہ دستور تھا کہ آپ منافقین اور مولفۃ القلوب کو اپنے ساتھ رکھتے تھے تاکہ یہ لوگ مال غنیمت اور دولت دنیوی کے لالچ میں کفار سے رزم آزما رہیں اور اسلام کو فتح و ظفر نصیب ہو۔ امیر المومنینؑ نے بھی یہی کیا آپ نے "سلطنت کے شیدائی مفاد پسندوں" کو ملک و مال پر قبضہ کیے رہنے کی اجازت دے دی تاکہ وہ اپنی سلطنت کے تحفظ کے لیے مرتدین سے جنگ کریں اور اسلام کے سر پر جو خطرہ منڈلا رہا تھا وہ دور ہو جائے۔

مرتدین کا استیصال دراصل سچے مسلمانوں کا کام تھا لیکن امیر المومنینؑ نے یہی کام مفاد پسندوں سے لے لیا اور دولت یا حکومت کی خواہش میں مسلمان ہونے والوں کے ذریعے دشمنان اسلام کی کمر توڑ دی۔ مرتدین سے سچے مسلمانوں کی جنگ ہوتی تو اسلامی دعوت انقلاب کا حقیقی مفہوم جاننے والے بھی کافی تعداد میں مارے جاتے اور اس طرح ان لوگوں کی تعداد کم ہو جاتی جن پر حقیقی اسلام کی اشاعت کا دارومدار تھا' سیاست علویہ نے ان سچے مسلمانوں کو جنگ سے بھی محفوظ رکھا اور مرتدین کا قلع قمع بھی

کرا دیا سیاست، معاملہ فہمی، دور اندیشی اور اعلی حکیمانہ قیادت کا اس سے بہتر مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ سیاست کی اس سے اعلی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ مرتدین کی طاقت مفاد پسندوں کے ہاتھوں ختم کرادی گئی اور جن دونوں طاقتوں کو اسلام کے مقابلہ میں متحد ہونا چاہیے تھا ان کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر اسلام کے سر سے ایک بلا دور کر دی گئی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس زمانہ میں مرتدین کے خلاف جنگ جاری تھی تو حضرت علی علیہ السلام راتوں کو مدینہ کا پہرہ دیتے تھے اور طلایہ پھرتے تھے بعض کوتاہ بین اور بصیرت نا آشنا حضرات اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ امیر المومنینؑ اس دور کے مسند نشین خلافت سے پورا اتفاق رکھتے تھے اور آپ کا یہ تعاون "مسلمانوں کی خانہ ساز تعمیر خلافت کا ایک جواز تھا۔ حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا واقعہ یہ تھا کہ تحریک اسلامی کے قائد کی حیثیت سے مرتدین کا استیصال اور قلب اسلام یعنی مدینہ کی حفاظت دراصل امیر المومنینؑ کا فرض تھا اور آپ نے یہ فرض اس طرح پورا فرمایا کہ نام نہاد مسلمانوں کے ذریعہ مرتدین کا استیصال بھی ہو گیا اور مدینہ کی تاراجی کا جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا وہ بھی آپ کے نام کی ہیبت اور آپ کی شب گشت کے نتیجہ میں ختم ہو گیا۔——

اب اسے چاہیے یوں کہہ لیجئے کہ امیر المومنینؑ حکمران وقت سے تعاون کر رہے تھے اور چاہیے یوں سمجھ لیجئے کہ جس طرح کفار کے مقابلہ میں رسولؐ مولفتہ القلوب کا تعاون حاصل کیے رہتے تھے اسی طرح مرتدین کے مقابلہ میں علیؑ مفاد پسندوں کا تعاون حاصل کیے رہے اور جس طرح رسولؐ نے منافقین اور مولفتہ القلوب کو اپنے ساتھ رکھ کر کفار میں ایک دہشت پیدا کر رکھی تھی اسی طرح امیر المومنینؑ نے دولت اور حکومت کے شیدائی عربوں کی طاقت سے مرتدین کا سر کچل دیا۔

امیر المومنینؑ مسئلہ خلافت پر خاموش نہ رہتے تو سلطنت کے شیدائی محض اپنی حکمرانی باقی رکھنے کے لیے مرتدین سے مل جانے میں بھی باک نہ رکھتے اور منافقین جب

یہ صورت دیکھتے تو وہ بھی اس اتحاد میں شامل ہو کر اسلام کی موت کا سامان فراہم کر دیتے" امیر المومنینؑ نے اپنی خاموشی کے نتیجہ میں ان تینوں طبقوں کا اتحاد ناممکن بنادیا اس لیے کہ سلطنت کے شیدائی جو کچھ چاہتے تھے وہ ان کو مل گیا وہ "دنیائے اسلام" کے مالک قرار پاگئے اور اب ان کو مرتدین سے لڑنا ضروری ہو گیا جو ان کے اقتدار کے لیے خطرہ بنے ہوئے تھے۔ رہا ابو سفیان اور اس کا گروہ منافقین تو وہ مسلمانوں کا اتحاد دیکھ کر ایسے سوفردہ ہو گئے کہ ان کو مرتدین کا ساتھ دینے کی ہمت نہیں ہو سکی اور اس طرح سلطنت کے شیدائیوں، مرتدوں اور منافقوں کا جو اتحاد ثلاثہ وجود میں آسکتا تھا اس کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ٹل گیا۔

حسن تدبر کے اس بے مثل مظاہرہ کو حکمت ربانی کے علاوہ اور کس لفظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

> اور پھر اس "فتح مبین" کی امیر المومنینؑ کو قیمت کیا ادا کرنا پڑی؟
> صرف وہ "بادشاہت" جس کی آپ کو کوئی ضرورت نہیں تھی، وہ "انسانی حاکمیت" جو خود آپ کے اصول کے خلاف تھی! وہ دنیوی طمطراق شاہانہ جس کا ذات بوترابؑ سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا تھا۔

رہی وہ امامت کبریٰ وہ خلافت الٰہیہ اور وہ قیادت ملی جو قدرت نے آپ کو عطا فرمائی تھی وہ نہ کوئی چھینے جانے والی چیز تھی اور نہ چھینی جاسکتی وہ آپ کو بدستور حاصل رہی اور اسی کا ایک مظاہرہ یہ حسن تدبر تھا کہ آپ نے مرتدین اور منافقین کی یلغار سے اسلام اور مسلمانوں، دونوں کو بچالیا۔ بلاشبہ امیر المومنینؑ کو دنیوی حکومت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس حکومت سے جو بجا طور پر آپ کا حق تھی یہ ایک عظیم قربانی تھی جو آپ کو دینا پڑی لیکن اس قربانی کے نتیجہ میں مرتدین ختم ہو گئے اور عرب میں اسلام کا آفتاب

اس شان سے چمکا کہ آج بھی ریگ زار عرب کے ذرات اس کی رحمت پاش کرنوں سے جگمگاتے نظر آرہے ہیں۔

منافقین کی آخری امیدیں بھی ٹوٹ گئیں اور وفات رسولؐ سے فائدہ اٹھا کر چمن اسلام کو تاراج کر ڈالنے کے جو منصوبے دلوں کے پردوں میں پروان چڑھ رہے تھے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے۔ مسلمانوں کے لرزتے ہوئے دل اور خوف سے کانپتے ہوئے قلب ٹھہر گئے۔ ان میں ہمت اور خود اعتمادی کے جوہر پیدا ہو گئے وہ جوہر جن ——— کے نتیجہ میں مسلمان قوم اس شان سے ابھری کہ سات سو سال تک اقوام عالم پر اس کے اقتدار کا پرچم لہراتا رہا اور آج کے اس مٹے ہوئے عالم میں بھی دنیا کے ایک چوتھائی حصہ پر وہ داد حکمرانی دے رہی ہے۔ اسلام کی تباہی اور الٰہی دعوت انقلاب کے فنا ہو جانے کا جو خطرہ وفات حضرت ختمی مرتبتؐ کے وقت پیدا ہو گیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ اسلام کا ننھا سا پودا کفر و ارتداد کی تیز و تند سموم کے ہولناک جھونکوں سے بچ گیا۔ امیرالمومنینؑ نے اسے گر جانے سے بچا لیا۔ آپ کی اولاد امجاد نے اسے اپنے لہو سے سینچ کر ایک تناور درخت کی شکل میں تبدیل کر دیا۔

یہ تھی ایک "خاموشی" کی قیمت جو تحریک اسلام کے قائد امیرالمومنین علیؑ نے وصول کی اور کون کہہ سکتا ہے کہ دنیوی حکومت کے مقابلہ میں یہ قیمت کم تھی۔

احقاق حق

حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے انتقال کے وقت دو قسم کے خطرات ابھرے تھے۔

۱۔ ایک خطرہ شامیوں، مرتدوں اور منافقوں کا تھا، جو ملت اسلامیہ کی تباہی کا سبب بن سکتا تھا۔

۲۔ اور دوسرا خطرہ مسئلہ خلافت کے سلسلہ میں ایک غلط اصول وضع کر لیے جانے کا تھا جس سے خود اسلام کے اصول برباد ہو جانے کا خوف تھا۔

ملت اسلامیہ کے لیے جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا اسے ملت اسلامیہ کے قائد اعظم اور قوم کے منصوص من اللہ امام نے دور کر دیا۔

رہا اصول اسلام کے لیے خطرہ تو اسے دور کرنا امامت کا نہیں رسالت کا کام تھا۔ چنانچہ اصول کی حفاظت و اشاعت کے لیے وہ ذات آگے بڑھی جسے خود رسولؐ جزو رسالت (بضعتہ منّی) قرار دے کر اسی دن کے لیے چھوڑ گئے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ کے دوران میں بار بار مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح فرما دی تھی کہ آپ کے بعد آپ کا وصی اور جانشین کون ہو گا۔ دعوت عشیرہ سے لے کر میدان غدیر خم تک علیؑ کی خلافت و وصایت کا بار بار اعلان کیا جا چکا تھا لیکن وصایت کے باب میں آپ کے احکام کا نفاذ چونکہ آپ کی وفات کے بعد ہی ہو سکتا تھا اور یہ خطرہ شدت سے موجود تھا کہ آپ کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد کمزور عقیدہ مسلمان اس اہم منصب شریعت کے باب میں شدید غلط روی کا شکار ہو

جائیں گے اس لیے سرکار دو عالمؐ نے اپنے بعد ایک ایسی شخصیت کو چھوڑا جو ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے آپ کا جزو تھی اور مسئلہ خلافت کے سلسلہ میں حق اور باطل کو ایک دوسرے سے ممتاز کر دینے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی۔ یہ شخصیت تھی حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی جو حیات رسولؐ میں بھی اس اعتبار سے شریکۃ الرسولؐ رہ چکی تھی کہ عورتوں سے متعلقہ احکام شریعت کی توضیح و تشریح آپ ہی کی ذات بابرکات سے متعلق تھی۔ مردوں سے متعلق شرعی احکام کی عملی تفسیر خود حضرت ختمی مرتبتؐ پیش فرما دیتے تھے، لیکن عورتوں کے مخصوص احکام پر عمل کرنا چونکہ حضور اکرمؐ کے لیے ممکن نہیں تھا اس لیے ان احکام کی عملی توضیح کے لیے ایک ایسی عورت کی ضرورت تھی جو معصومہ ہو، تاکہ مسلمان خواتین اس کی تاسی کر سکیں معصومہ عالم اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے وجود میں آئی تھیں اور دور حیات رسولؐ میں اپنے عظیم المرتبت والد کے فرائض میں ان کا ہاتھ بٹاتی رہیں لیکن ابھی آپ کو ایک فریضہ انجام دینا تھا۔ وہ فریضہ جس میں آپ کو عورتوں کے ساتھ مردوں کی قیادت بھی فرمانا تھی۔ جس میں آپ کو شریعت اسلامیہ کے ایک اہم رکن یعنی مسئلہ خلافت اسلامیہ کی توضیح و تشریح فرمانا تھی۔ جس منزل پر آپ کو احقاق حق و ابطال کے لیے ایک عدیم النظیر جہاد فرمانا تھا ــــــ ایسا جہاد جس کے نتیجہ میں حق اور باطل ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہو گئے کہ آج تک تلبیس و تدلیس کا کوئی حربہ اس باب میں سچے مسلمانوں کو گمراہ نہیں کر سکا ہے۔

خلافت کے باب میں حضرت سرور کائناتؐ نے جتنی بھی ہدایات فرمائیں مسلمانوں نے ان کی مختلف توجیہہ و تشریح کر کے انہیں اپنے مطلب کے مطابق ڈھال لیا۔ حتیٰ کہ غدیر کے کھلے ہوئے اعلان وصایت کے سلسلہ میں بھی طرح طرح کے مطالب پیدا کر دیے گئے اور اس طرح حق پر باطل کے اتنے غلاف چڑھا دیے گئے کہ

حق اور باطل میں امتیاز کرنا دشوار ہو گیا۔ اس سلسلہ میں حاشیہ آرائیوں غلط بیانیوں اور جھوٹے دلائل کا اتنا طومار باندھا گیا کہ خود حضرت امیر المومنینؑ پر یہ تہمت عائد کر دی گئی کہ آپ نے رسولؐ کے بعد منصب خلافت پر قبضہ کر لینے والوں کی بیعت فرمائی تھی۔ حق پر یہ ایک انتہائی مہلک وار تھا جو باطل کی جانب سے عائد کیا گیا تھا اور شیطان کی اس ضرب نے ملت اسلامیہ کو گمراہی اور شریعت کے ایک اہم رکن کے متعلق شدید غلط فہمی کا شکار کر دیا تھا۔ حق و باطل کا یہ انتہائی اہم ٹکراؤ تھا جو وفات رسولؐ کے بعد ہی وجود میں آیا اس موقع پر رسولؐ زادی حق کی حمایت میں سینہ سپر ہو گئی اور اس نے اپنے خاموش مجاہدہ کی مدد سے باطل کو وہ دندان شکن شکست دی کہ پوری ملت اسلامیہ کو گمراہی کا شکار کر دینے کا شیطانی خواب ہمیشہ کے لیے مسمار ہو گیا۔

معرکہ حق و باطل میں خاتون جنتؑ کی اس بے عدیل کامیابی کی داستان دلچسپ بھی ہے اور عبرت خیز بھی۔

دنیا جانتی ہے کہ شاہزادی ایک انتہائی دولت مند ماں کی اکلوتی وارث تھی اور اس اعتبار سے اسے دنیوی دولت کی کوئی کمی نہ تھی لیکن یہ ساری دولت اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں صرف کر دی گئی اور شاہزادی اس پر خوش تھی کہ اس کی دولت کی بدولت دنیا دولت اسلام سے مالا مال ہو گئی۔ شاہزادی اس رسولؐ کی پارہ جگر تھی جو امت کا شفیق باپ اور رحمت عالم تھا اور اس علیؑ کی شریک حیات تھی جو اپنے بچوں کو بھوکا رکھ کر بھی فقرائے مدینہ کی امداد کرنا ضروری تصور کرتا تھا خود شاہزادی کا کردار یہ تھا کہ اس نے شب عروسی پیوند دار لباس میں بسر کی اور بابا کا دیا ہوا لباس تو ایک فقیر کو عطا کر دیا۔ شاہزادی کے اس کردار کو نظر میں رکھیے اور پھر یہ سوچیے کہ یہی عورت ایک جائیداد کے لیے ایوان خلافت میں مقدمہ دائر کرتی ہے گواہ پیش کرتی ہے اور جب اس کا دعویٰ خارج کر دیا جاتا ہے تو خلافت مآب اور ان کے مشیر خاص سے اس حد تک ناراض ہو

جاتی ہے کہ ان سے گفتگو بند کر دیتی ہے اور یہاں تک ہدایت کر دیتی ہے کہ اسکی میت پر بھی یہ لوگ نہ آنے پائیں۔

// عمومی حالات ہوتے تو شاید شاہزادی کو اس کی پروا بھی نہ ہوتی کہ مسلمانوں نے آپ کی ایک جائیداد لے لی۔ ممکن ہے کہ اگر کوئی غریب مسلمان آپ سے اس جائیداد کا سوال کر لیتا تو آپ یقیناً یہ زمین اسے عطا فرما دیتیں' ایسی حالت میں جس عورت نے اپنی ماں کی بے شمار دولت مسلمانوں پر قربان کر دی تھی وہ ایک ادنیٰ سی جائیداد کے لیے مسلمانوں سے ہرگز تنازعہ نہیں کر سکتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ شہزادی نے فدک کا سوال اس لیے نہیں اٹھایا تھا کہ آپ اس جائیداد کو مسلمانوں سے عزیز رکھتی تھیں یا خدانخواستہ اسے اپنی روزی کا ذریعہ خیال فرماتی تھیں' ایسا خیال بھی کفر کے مترادف ہے اس لیے کہ ایک سچی مومنہ کی حیثیت سے آپ فدک کو اپنے رزق کا سہارا نہیں مانتی تھیں بلکہ رزق کے باب میں صرف اللہ پر توکل فرماتی تھیں ایسی حالت میں ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ آپ نے فدک کا سوال کسی اور غرض سے اٹھایا تھا اور وہ غرض تھی باطل کو بے نقاب کر دینا۔

آپ نے فدک کا دعویٰ دائر کیا تو اس میں آپ کی حیثیت مدعیہ کی تھی اور حاکم وقت مدعا علیہ تھے قانون اور انصاف کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی یہ کہہ دے گا کہ مقدمہ کا فیصلہ ہمیشہ ایک غیر جانبدار عدالت کو کرنا چاہیے لیکن باب فدک میں ہم یہ تماشا دیکھتے ہیں کہ خود مدعا علیہ جج کے فرائض انجام دے رہا ہے چنانچہ خلافت مآب نے جو مدعا علیہ کی حیثیت رکھتے تھے اپنی جانب سے کوئی ثبوت یا شاہد پیش کیے بغیر مقدمہ کا فیصلہ اپنے حق میں کر دیا اور اس طرح تاریخ عدل و انصاف میں ایک ایسے باب کا اضافہ فرما دیا جس پر شاید انصاف قیامت تک ماتم کناں نظر آئے گا۔

خلافت اسلامیہ کا بنیادی اصول عدل ہے لیکن مسلمانوں نے جس شخص کو خلیفہ

منتخب کیا تھا وہ عدل و انصاف کے اس بنیادی اصول سے بھی ناواقف تھا کہ کسی مدعا علیہ کو مقدمہ فیصل کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ ہر مقدمہ کا فیصلہ ایک غیر جانب دار ثالث ہی کر سکتا ہے۔

اور پھر عدل و انصاف کا یہ کرشمہ بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ مدعیہ تو اپنے دعوے کے حق میں گواہ پیش کرتی ہے اور وہ گواہ ناقابل قبول قرار دے کے مسترد کر دیے جاتے ہیں ـــــ اور مدعا علیہ اپنے حق میں کوئی گواہ بھی پیش نہیں کرتا بلکہ صرف ایک ایسے قول کی اساس پر جسے اس کے سوا اور کسی نے نہیں سنا تھا' مقدمہ کا فیصلہ اپنے حق میں کر دیتا ہے۔

اگر انصاف یہی ہے تو شاید قانون اور عدل کی ساری کتابیں دریا برد کر دینا پڑیں گی اور یہ بات مان لینا پڑے گی کہ مطلق العنان بادشاہوں کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون اور آمرین کی ہر جابرانہ خواہش کا نام انصاف ہے۔

معصومہ عالمؑ کے اس اقدام نے ہمارے سامنے یہ صاف اور سیدھا سا سوال پیش کر دیا کہ آیا وہ شخص بھی جو انصاف کے مبادی تک سے ناواقف ہو منصب خلافت کا اہل کہا جا سکتا ہے؟ اس سوال کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ ہے "نہیں" اور یہیں سے ہر سلیم العقل انسان پر حق واضح ہو جاتا ہے۔

سیدہ عالمؑ نے ابطال باطل کے معاملہ میں اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ باطل پر ایک اور ضرب بھی عائد کی۔

آپ نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر سے اپنی ناراضگی کا اعلان کر دیا اور ان حضرات پر ایسی غضب ناک ہوئیں کہ ان کو اپنے جنازہ تک پر آنے کی ممانعت کر دی۔

دنیا جانتی ہے کہ سرکار دو عالمؐ یہ ارشاد فرما چکے ہیں کہ فاطمہ میری پارہ جگر ہے جس نے اسے ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی۔ جس نے مجھے ایذا دی اس نے خدا کو ایذا

دی اور جس نے خدا کو ایذا دی وہ کافر ہو گیا۔۔۔۔۔۔ اب اس اعلان رسالت کی روشنی میں یہ دیکھیے کہ فاطمہؑ مذکورہ بالا حضرات سے ناراض ہیں۔ اتنی ناراض کہ اپنی میت پر بھی ان کا آنا گوارا نہیں کر سکتیں، اب ایسی حالت میں ان حضرات کا خلیفہ رسولؐ کہلانا تو درکنار مسلمان ہونا بھی کہاں تک تسلیم کیا جا سکتا ہے!

معصومہ عالمؑ کے اس احتجاج کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ خلیفہ وقت کی ذلت اس منصب عظمی کے لائق نہیں ٹھہری بلکہ وہ اصول بھی مہمل قرار پا گئے جن کے نتیجہ میں منصب خلافت ان حضرات کو حاصل ہوا، اس لیے کہ جن اصول کے نتیجہ میں خلافت ان حضرات کو نصیب ہو سکتی ہو جن کا ایمان بھی بہ نص رسول مشتبہ قرار پائے وہ ہرگز صحیح اور اسلامی نہیں کہے جا سکتے۔

ایک جائیداد کا سوال اٹھا کے مسلمانوں کی خود ساختہ خلافت کا قصر منہدم کر دینا، جہاد حق و باطل کی تاریخ کا ایک ایسا نادر روزگار کارنامہ ہے جس پر آل رسولؐ کی تاریخ ہمیشہ ناز کر سکتی ہے۔

معصومہ کونینؑ کی فتح مبین سے بھلا کسے انکار کی گنجائش ہو سکتی ہے؟ آل رسولؐ کی دور رس نگاہیں یہ تماشا بھی دیکھ رہی تھیں کہ آگے چل کر یہ دعویٰ کیا جائے گا کہ امیر المومنینؑ نے خلفائے وقت کی بیعت کر لی تھی اور اس طرح امامت حقہ پر پردے ڈال کر باطل کو فروغ دیا جائے گا۔ شریکۃ الرسولؐ نے اس فتنہ کا بھی خاتمہ کر دیا اور وہ اس طرح کہ دنیا کا کوئی انسان یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ جناب فاطمہؑ نے حضرت ابوبکر کی بیعت کی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ جب معصومہ عالمؑ نے حضرت ابوبکر کی بیعت نہیں کی تو پھر آپ کسے اپنا امام تصور فرماتی تھیں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد متفق علیہ ہے کہ من مات ولم یعرف امام زمانہ مات میتۃ الجاہلیۃ (جو اپنے امام زمانہ کی معرفت حاصل کیے بغیر مر گیا وہ کفر

کی موت مرا) اس ارشاد گرامی کی روشنی میں یہ لازمی ہے کہ سیدہ عالم جو مسلمان ہیں، بچی مومنہ ہیں، خاتون جنت ہیں، سیدہ زنان بہشت ہیں ضرور اپنے امام زمانہ کی معرفت کامل رکھتی ہوں گی، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ نے نہ صرف یہ کہ حضرت ابوبکر کی بیعت نہیں کی بلکہ ان سے ناراض رہیں، ایسی حالت میں دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔

۱۔ یا تو جناب سیدہ کے ایمان سے ہاتھ دھولیا جائے اس لیے کہ آپ نے خلیفہ وقت کی بیعت نہیں کی تھی، اور

۲۔ یا پھر یہ مان لیا جائے کہ وہ شخص سرے سے امام زمانہ تھا ہی نہیں جس کی بیعت سے آپ نے احتراز فرمایا تھا بلکہ امام زمانہ کوئی اور شخص تھا اور آپ اسی کی بیعت میں تھیں!

ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی مسلمان جناب سیدہ کے ایمان سے انکار نہیں کر سکتا بلکہ ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ سیدہ زنان بہشت ہیں ایسی حالت میں صرف دوسری ہی صورت صحیح قرار پاتی ہے اور اس سے نہ صرف یہ کہ حضرت ابوبکر کی خلافت کا مرحومہ ختم ہو جاتا ہے بلکہ امیر المومنین کی امامت حقہ کا بھی ناقابل انکار ثبوت مل جاتا ہے اس لیے کہ وہ ذات پاک جو شریکۃ الرسولؐ تھی، معصومہ تھی، سیدہ زنان بہشت تھی آپ ہی کو امام تسلیم کرتی تھی اور صرف آپ ہی کی بیعت کو جائز قرار دے رہی تھی۔

جناب فاطمہؑ سے زیادہ منشائے رسالت کو جاننے اور سمجھنے والا بھلا اور کون ہو سکتا ہے؟ ایسی حالت میں جب یہ عارفہ منشائے رسولؐ بضعۃ الرسولؐ شریکۂ رسولؐ علیؑ کی امامت کو حق قرار دے رہی ہے تو پھر اس کے حق ہونے سے بھلا کیسے انکار ہو سکتا ہے؟

استقرار حق کے سلسلہ میں معصومہؑ کی یہ سعی بلیغ معرکہ حق و باطل کی تاریخ کا

ایسا سنہرا باب ہے جس پر خود حق بجا طور سے ناز کر سکتا ہے۔

جناب سیدہؑ نے تیغ و سنان سے جنگ نہیں کی اس لیے کسی نے اس "جنگ" میں آپ کی فتح مبین پر غور نہیں کیا جس میں خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر حق کو فتح نصیب ہوئی اور باطل کی شہ رگ کاٹ دی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ معصومہ کا یہ مجاہدہ بھی حق و باطل کی جنگ کا ایک جزو تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ خونیں جنگ نہیں تھی۔ "سرد جنگ یا اعصابی جنگ" تھی جس میں آل رسولؐ نے فتح مبین حاصل کی اور اس قرآنی اعلان کو سچ کر دکھایا کہ حق ہمیشہ مظفر و منصور ہوتا ہے اور باطل ہمیشہ ناکام و نامراد۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوتے ہی آل رسولؐ کو دو مورچے سر کرنا پڑے۔ ایک بیرونی حملہ آوروں کا مورچہ جسے تحریک اسلامی کے قائد اعظم نے مفاد پرستوں کو مرتدین کے مقابلہ میں صف آرا کر کے ختم کر دیا اور دوسرا اندرونی خطرہ جس میں مسلمانوں کے عقائد برباد ہونے کا احتمال تھا اسے رسول زادی نے اپنے خاموش مجاہدہ سے دور کر دیا!

مسلمان بھی بچا لیے گئے اور اسلام کو بھی بچا لیا گیا۔ شیطان کے دونوں وار خالی گئے اور حق کی اتنی بڑی جنگ جیت لی گئی۔

اور مزہ کی بات تو یہ ہے کہ اس "جنگ" میں نہ تلوار چلی نہ خون بہا' نہ قربانیاں پیش کرنے کی نوبت آئی' نہ حق پرستوں کو جان دینے کی ضرورت محسوس ہوئی بلکہ صرف امیرالمومنینؑ کی خاموشی اور معصومہؑ کے آنسوؤں نے یہ دونوں مورچے سر کر لیے۔

اللہ اللہ! آل رسولؐ کی کیا شان ہے؟ کہ ان کا ایک مرد چپ رہتا ہے تو حق کے پرچم کھل جاتے ہیں اور ایک عورت پکار اٹھتی ہے تو قصر باطل کے کنگرے منہدم ہو جاتے ہیں۔

حق پرستی کی تاریخ کتنی ہی شاندار کیوں نہ سہی لیکن اس پایہ اور اس شان کے نا تحیین پیش کرنے سے بہر حال قاصر ہے اور یہ عظمت و شرف صرف خاتم النبیین کی آل ہی کو نصیب ہے کہ ان کی لب کشائی میں بھی حق کے لیے ظفر ہے اور ان کی خاموشی میں بھی حق کی فتح!

☆——☆☆——☆

تبلیغ اسلام

مرتدین، منافقین اور مفاد پسند مسلمانوں کے سلسلہ میں سیاست علویہ کو بے پناہ کامیابی نصیب ہوئی۔ لیکن ابھی دوسرے عظیم مسائل موجود تھے اور تحریک اسلامی کے قائد کو ان امور میں بھی اپنی بصیرت، معاملہ فہمی اور حکمت و سیاست کا امتحان دینا تھا۔ مرتدین کے استیصال کے ساتھ اندرون ملک کا خطرہ دفع ہو گیا تھا لیکن سلطنت اسلامی کی سرحدوں پر طوفان اٹھتے نظر آ رہے تھے ایران کا کسریٰ اور روم کا قیصر اسلام کی ابھرتی ہوئی قوت سے خائف تھے اور اسے کچل دینے کی آرزو مند ایران اور شام کی سرحدوں سے جنگی باجے بجنے کی صدائیں آنا شروع ہو چکی تھیں اور یہ یقینی تھا کہ آج نہیں تو کل مسلمانوں کی نئی سلطنت کو دنیا کے ان قدیم حکمرانوں سے ضرور ٹکر لینا پڑے گی۔ ملت اسلامیہ کا ناخدا اور دعوت اسلامی کا قائد اس صورت حال کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ قیصر اور کسریٰ ریگ زار عرب سے ابھرتی ہوئی اس نئی طاقت کا وجود برداشت کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا پر اسلام کا اثر اسی وقت غالب ہو سکتا ہے جب ان قوتوں کو شکست دے کر مسلمان صف اول کی بین الاقوامی طاقت بن جائیں۔ وہ اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف تھا کہ عربستان کے باہر اسلام کی آواز تبھی پہنچائی جا سکتی ہے جب قیصر و کسریٰ کی تیار کردہ سدِ سکندری جس نے جزیرہ نمائے عرب کو گھیر رکھا تھا توڑ ڈالی جائے اور انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کرا کے اللہ کی عبدیت میں دے دینے کا اسلامی تصور اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب انسانی حاکمیت کے ان دونوں سب سے بڑے بتوں کو جنہیں دنیا قیصر و کسریٰ کے نام سے یاد کرتی تھی پاش پاش

کر ڈالا جائے۔ یہ تھی وہ صورت حال جو مرتدین کے استیصال کے بعد انقلاب اسلامی کے داعی کے سامنے تھی اور اسے اس حکمت ربانی کے ساتھ اس کا بھی مقابلہ کرنا تھا جس کا مظاہرہ وہ مرتدین کے باب میں کر چکا تھا۔

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مرتدین کے خاتمہ کے بعد امیر المومنینؑ نے حصول خلافت کے لیے جنگ کیوں نہیں کی؟ لیکن یہ اعتراض دراصل تاریخ اسلامی اور خود امیر المومنینؑ کی صحیح موقف کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے یہ لوگ امیر المومنینؑ کو بھی انہیں دعویداران خلافت و طلبگاران سلطنت کی سطح کا انسان تصور کرتے ہیں جنہوں نے ہر ہر قدم پر حصول حکومت کے لیے بغاوتیں کر کے مسلمانوں کی سطوت و شوکت کا جنازہ نکال دیا ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کر ڈالا اور ان کی اس عظیم سلطنت کو خانہ جنگیوں کا لامتناہی سلسلہ جاری کر کے برباد کر ڈالا جس کی سرحدیں بنگالہ سے لے کر مراکش تک پھیلی ہوئی تھیں۔ دراصل یہ لوگ امیر المومنینؑ کی حیثیت، آپ کے مقاصد آپ کے طریق کار تاریخ اسلام میں آپ کے موقف اور اسلامی تحریک سے آپ کے تعلق کو قطعاً نہیں سمجھتے اور آپ کے افعال و اعمال پر ایک معمولی طلبگار سلطنت کے افعال کے زاویہ سے نظر ڈالتے ہیں۔ چودہ سو سال تک شاہی و سلطانی کے مکروہ نظام زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ان کے فکر و نظر کے سانچے ہی بگڑ گئے ہیں۔ ان کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز ہی غلط ہو گیا ہے اور وہ مقام علوی کی عظمت و رفعت سمجھنے کی اہلیت ہی کھو چکے ہیں وہ اس حقیقت کو سرے سے نظر انداز کرتے ہیں کہ امیر المومنین علیہ السلام بادشاہت کے آرزو مند نہیں تھے بلکہ وصی رسولؐ تھے اور اس لحاظ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مشن کی تکمیل آپ کا مقصد حیات تھی۔ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تحریک اصلاح و انقلاب کے مسلّمہ قائد تھے اور اس اعتبار سے اس تحریک کو کامیاب بنانا آپ کی زندگی کا نصب العین تھا آپ اشاعت اسلام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے دست راست رہ چکے تھے۔ اس لیے آپ کو اگر کچھ فکر تھی تو اسلام کا پیغام عالمگیر بنا دینے کی ——— آپ خلافت کا دعویٰ ضرور فرماتے تھے لیکن حکومت آپ کے لیے مقصود بالذّات نہیں تھی۔ صرف منہاج مقصد کی حیثیت رکھتی تھی۔ آپ کو حکومت سے صرف اس حد تک دلچسپی تھی کہ اس کے ذریعہ سے آپ ایک طرف تو مسلمانوں کی اعلیٰ اخلاقی و روحانی تنظیم قائم رکھ سکتے تھے اور دوسری طرف اس کی مدد سے اشاعت اسلام کا فریضہ انجام دے سکتے تھے۔ خلافت سے آپ کا مقصد نہ ذاتی عیش تھا اور نہ حصول شہرت، ایسی حالت میں آپ تمام معاملات پر اپنے مشن اور اسلام کی بھلائی کے نقطہ نظر سے غور فرماتے تھے اور وہ راہ عمل اختیار فرماتے تھے جو دعوت اسلامی کو عام کرنے کے لیے ضروری اور سود مند ہوا کرتی تھی اس موقع پر بھی آپ نے وہی کیا جو آپ کے مقصد حیات کے اعتبار سے ضروری تھا اور جس سے ان مقاصد کے حصول میں مدد مل سکتی تھی جو آپ کو دل و جان سے عزیز تھے۔

اگر اس موقع پر آپ حصول خلافت کے لیے شمشیر بکف ہو جاتے تو اس کے دو ہی نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ ایک تو یہ کہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو شکست ہو جاتی اور وہ مقدس ہستیاں شہید ہو جاتیں جن پر تبلیغ و اشاعت اسلام کا انحصار تھا اور دوسرے یہ کہ آپ کامیاب ہو جاتے اور تخت خلافت آپ کے قدموں تلے آ جاتا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں کا مجموعی نتیجہ کیا برامد ہوتا؟ ظاہر ہے کہ اگر مومنین صالحین کی یہ جماعت ختم ہو جاتی تو اسلام مجموعہ رہ جاتا منافقین کا، ان سابق مرتدین کا جن کو ابھی ابھی بزور شمشیر مسلمان بنایا گیا تھا اور ان جاہل عربوں کا جنہوں نے صحیح طور پر اسلامی دعوت انقلاب کو سمجھا بھی نہیں تھا۔ ان لوگوں سے یہ توقع کرنا کہ وہ دنیا کو اسلام کے صحیح تصور سے آگاہ کرتے یا اسلامی نظام کو دنیا میں قائم کرتے قطعاً مہمل سی بات تھی اور یہ لازمی تھا کہ امیر المومنینؑ کی شہادت کے ساتھ ہی اسلام کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔ ایسی حالت میں

شہادت کا مقصد ہوتا اسلام کی موت اور ظاہر ہے کہ امیرالمومنینؑ اس صورت حال کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ رہا یہ امر کہ جنگ میں آپ کو کامیابی ہوتی تو اول تو بظاہر اس کی کوئی امید ہی نہیں تھی اور دوسرے اگر آپ کامیاب بھی ہو جاتے تو آپ ایک ایسی قوم پر حکمران ہوتے جو اصولی اور بنیادی طور پر آپ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی تھی۔ جو تلوار کی نوک پر آپ کی اطاعت تو کرتی لیکن تبلیغ اسلام کی مہم میں آپ کا ساتھ نہ دیتی جو آپ کو "بادشاہ" تو مانتی لیکن امام کی حیثیت سے قبول نہ کرتی جس کے سر اسلام کے سامنے جھکتے اور دل صنم کدوں کا طواف کرتے اور جس پر آپ ساری دنیا کو مسلمان بنانے کے لیے تو کیا خود سرحد اسلامی کی مدافعت کے لیے بھی اعتماد نہیں کر سکتے تھے۔ ایسی حالت میں آپ کو اپنی تمام تر توجہ خود عربوں میں اسلام حقیقی کی اشاعت پر مرکوز رکھنا پڑتی اور قیصر و کسریٰ کو شکست دے کر ساری دنیا تک اسلام کا پیغام پہنچانے کا کام دھرا رہ جاتا۔ ایسی حالت میں آپ نے وہی کیا جو حکمت ربانی کے امین کو کرنا چاہیے تھا۔ جو صرف سیاست الٰہیہ کے وارث عمل میں لا سکتے تھے اور جس حسنِ تدبّر کی مثال اولیاء اللہ کے علاوہ اور کہیں دستیاب نہیں ہو سکتی تھی آپ نے حکومت کے باب میں اپنی خاموشی جاری رکھی اور ایسا طرز عمل اختیار فرمایا جس کے نتیجہ میں فرماں روایان سلطنت اسلامی میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اب یہ سلطنت ان کی "اپنی" ہے، ان کی طاقت کو اب کوئی چیلنج کرنے والا نہیں ہے اور اس لحاظ سے اس مملکت کے تحفظ کی ذمہ داری اب خود انہیں پر ہے۔

اس احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے "اپنی مملکت" کو قیصر و کسریٰ کے خطرہ سے محفوظ رکھنے کی تیاری شروع کر دیں اور جن اسلام دشمن قوتوں کا استیصال خود امیرالمومنینؑ اور مومنین صالحین کا فرض تھا ان کو ختم کرنے، ان کے مقابلہ میں تیغ آزما ہونے کی ذمہ داری ان مفاد پسند مسلمانوں پر ڈال دی گئی جو سلطنت کے لیے تو کفار سے لڑ سکتے

تھے لیکن ایک مجرد اصول کی خاطر میدان جنگ میں بھیجے جاتے تو وہی منظر پیش کرتے جو احد اور حنین میں پیش کر چکے تھے۔

امیر المومنینؑ نے تحت و تاج کے شیدائیوں کو سلطنت کا کھلونا دے کر جو فائدہ اٹھایا وہ سیاست علویہ کا ایک بے نظیر نمونہ ہے۔ آپ کے اس اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ :-

۱۔ ان عرب فوجوں نے جو منافقین' سابق مرتدین' مال غنیمت کے شیدائیوں' دولت کے پرستاروں اور عربی مملکت کے فداکاروں پر مشتمل تھیں توسیع سلطنت اور حصول دولت کے جذبہ میں ان قیصرو کسریٰ کی کمر توڑ دی جن سے اسلام کو شدید خطرہ تھا حکمران خوش تھے کہ ان کو "فاتح اعظم" کا لقب حاصل ہو گیا سپاہی مسرور تھے کہ ان کو کافی مال غنیمت میسر آ گیا اور تحریک اسلامی کا قائد 'علیؑ' خوش تھا کہ مومنین صالحین کو قربانی دیئے بغیر دعوت اسلام کے محترم ارکان کو آگ اور خون کی بھٹی میں جھونکے بغیر اور سچے مسلمانوں کو تلوار کی آنچ سے محفوظ رکھتے ہوئے اسلام کے دو خطرناک دشمنوں کا خاتمہ کرا دیا گیا۔

۲۔ ایران' مصر' شام' فلسطین اور عراق پر عربوں کا پرچم فتح لہرانے لگا جس کے نتیجہ میں ان ممالک میں اس صحیح اور سچے اسلام کی تبلیغ آسان ہو گئی۔ جس کے علمبردار حضرت علی مرتضیٰؑ تھے۔ کفر کی قوت ٹوٹ گئی اور سچے مسلمانوں کو ان علاقوں میں دعوت اسلام عام کرنے کا پورا موقع حاصل ہو گیا۔

۳۔ قیصرو کسریٰ کے مقابلہ میں جو لڑائیاں لڑی گئیں ان میں ہزاروں مسلمان مارے گئے لیکن حضرت علی علیہ السلام کی ذہانت کے نتیجہ میں وہ حقیقی اور سچے مسلمان جو اسلام کے مقصود حقیقی کو سمجھتے تھے جو رسولؐ کی دعوت انقلاب کا سچا نمونہ تھے جو اسلام کی اعلیٰ اخلاقی و روحانی قدروں کے امین تھے اور جنہوں نے

لسان فیض ترجمان رسالت سے اسلام کی حقیقی تفسیر و تشریح معلوم کی تھی ان جنگوں سے دور رہے اور اس طرح وہ لوگ بچ گئے جو مفتوحہ علاقوں میں اسلام کی تبلیغ کے حقیقی معنوں میں اہل تھے۔

۴۔ قیصر و کسریٰ کی ذلت آمیز شکست نے ساری دنیا کی نگاہیں اسلام کی طرف موڑ دیں اور پہلے جس دین کا مذاق اڑایا جاتا تھا اسکو اب دنیا بڑی سنجیدگی کی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ غیر ممالک کے لوگوں کو بھی اسلام اور مسلمانوں سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی فکر پیدا ہو گئی اور مسلمانوں کے سب سے بڑی بین الاقوامی طاقت بن جانے کا ایک نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ دنیا بھر میں اسلام کو جاننے کا شوق بیدار ہو گیا۔ اسی طرح اسلام کے پیغام کو عام کرنے کے لیے زمین تیار ہو گئی اور ایک ایسی نفسیاتی فضا پیدا ہو گئی جو تبلیغ میں بے حد معاون ہوا کرتی ہے۔

۵۔ امیر المومنینؑ اور دوسرے علمائے امت کو منافقین کی سازشوں سے آزاد ہو کر مدینہ میں قرآن و حدیث اور شریعت کی تعلیم عام کرنے کا موقع حاصل ہو گیا تاریخیں شاہد ہیں کہ امیر المومنینؑ اور دوسرے صلحائے امت اس زمانہ میں جبکہ فرمانروایان وقت تسخیر ملکی کی مہم میں مصروف تھے مدینہ میں وعظ و تبلیغ وہدایت کا کام پوری سرگرمی سے انجام دیتے رہے اور اس تربیت کا نتیجہ یہ تھا کہ مدینہ علوم اسلامی کا گہوارہ بن گیا۔ مدینہ کو فقہ اور حدیث میں جو مرکزیت حاصل ہوئی وہ دوران فتوحات ملکی میں امیر المومنینؑ کی انہی علمی کاوشوں کا نتیجہ تھی منافقین مکہ اور مدینہ میں موجود رہتے تو وہ اسلامی علوم کی اشاعت میں ہمیشہ رخنہ اندازی کرتے رہتے اور ہرگز اسے پسند نہ کرتے کہ اس دین کا علم عام ہو جسے وہ اپنے دل کے پردوں میں ناپسند کرتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ لوگ مال غنیمت کی تمنا میں مدینہ سے دور ایران و مصر میں مصروف جنگ تھے اس لیے امیر المومنینؑ کو یہ موقع مل

گیا کہ صدر اسلام کو مستحکم کردیں اور مکہ اور مدینہ کو جو مفاد پسندوں کے اثرات کے نتیجہ میں عربوں کی سیاسی اور عسکری قوت کے مرکز بن گئے تھے اپنے اثرات کے ماتحت علوم و تمدن اسلامیہ کا مرکز بنا دیں۔

۶۔ اندرون عربستان میں اسلام کی تبلیغ مکمل کرلی گئی۔ یہ صحیح ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور حیات میں عربوں نے اسلام قبول کرلیا تھا لیکن اس قبولیت اسلام کی حقیقت بس اتنی تھی کہ پیغمبر اسلامؐ کا انتقال ہوتے ہی عربوں کا بیشتر حصہ مرتد ہو گیا تھا۔ ان مرتدین کو دوران خلافت اول دوبارہ بنوکِ شمشیر مسلمان بننے پر مجبور کیا گیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ تلوار کے خوف سے مسلمان ہونے والے سچے مسلمان نہیں کہے جاسکتے۔ ضرورت اس کی تھی کہ عربوں میں اسلام کی صحیح تبلیغ کی جائے فرماں روایان وقت چونکہ تسخیر ممالک میں مصروف تھے اس لیے وہ یہ کام نہیں کر سکتے تھے۔ امیر المومنینؑ پر چونکہ حکومت یا جنگ کی ذمہ داریاں نہیں تھیں اس لیے آپ اور آپ کے ساتھی خاموشی کے ساتھ اسلام کی تبلیغ میں مصروف رہے اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ عربستان میں اسلام کے قدم ہمیشہ کے لیے جم گئے۔

مفتوحہ ممالک میں جو اسلام پھیلا وہ ان مسلمان فوجوں کی بدولت نہیں پھیلا جو ان علاقوں کو فتح کرنے گئی تھیں اس لیے کہ ان فوجوں میں چاہے کتنے ہی اچھے تیغ زن کیوں نہ شامل ہوں لیکن اسلام اور اس کے اعلیٰ نظام زندگی کو جاننے والے بہت کم تھے پھر اس حقیقت سے بھی انکار ناممکن ہے کہ جزبیِ سورماؤں کی تلواریں سروں کو تو جھکا سکتی تھیں لیکن دلوں کو نہیں جھکا سکتی تھیں۔ دلوں پر قبضہ شمشیر کی نوک سے نہیں ہوتا علم، اخلاق، محبت اور روحانیت کی طاقت سے ہوا کرتا ہے۔ یہ کام جنگ آزما سپاہیوں کا نہیں ہے پر امن مبلغین اور علمائے امت کا ہے۔ امیر المومنینؑ ایک اعلیٰ درجے کے مبلغ

اور نفسیات انسانی کے ایک بے پناہ ماہر کی حیثیت سے اس حقیقت کو خوب جانتے تھے چنانچہ آپ نے تلوار کی فتح کو محبت کی فتح میں اور سروں کے جھکاؤ کو دلوں کی تسخیر میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ادھر مسلمان ایک ملک فتح کرتے تھے ادھر صلحائے امت اس ملک میں تبلیغ کرنے پہنچ جاتے تھے اور آج اسی سیاست کا یہ کرشمہ ہے کہ ایران و مصر و شام سینکڑوں سیاسی انقلابات کے باوجود اسلام کے حلقہ بگوش نظر آ رہے ہیں۔

امیرالمومنین علیہ السلام اس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے کہ جن علاقوں پر مسلمان نوک شمشیر قبضہ کریں گے وہاں کے لوگوں میں فطری طور پر مسلمانوں کی مخالفت پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے کہ ان میں یہ احساس عام ہو گا کہ مسلمانوں نے ان کی سلطنت اور آزادی کا خاتمہ کر دیا ہے ان کے تہذیب و تمدن کو فنا کر دیا ہے ان کے معابد کو ویران اور ان کے مذہب کو تاراج کیا ہے اور محض قوت کے بل پر ان کو عرب سلطنت کا غلام بنا دیا ہے اس احساس کے نتیجہ میں وہ اپنے دل کے پردوں میں مسلمانوں کے دشمن رہیں گے۔ مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف رہیں گے اور جیسے ہی ان کو موقع ملے گا وہ مسلمانوں کے خلاف بغاوت کر کے عربوں کے ساتھ ہی اسلام کو بھی اپنے ملک سے بے دخل کر دیں گے۔ عرب فاتحین اس حقیقت کو نہیں سمجھ رہے تھے چنانچہ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ اگر امیرالمومنینؑ نے مفتوحہ ممالک میں تبلیغ کا بندوبست نہ کر دیا ہوتا تو عربوں کے سیاسی زوال کے ساتھ ہی ان علاقوں سے اسلام کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔

ہمارے اس دعوے کا ثبوت خود اسلامی تاریخ ہے۔

تلوار کی فتح اتنی بے اثر اور عارضی ثابت ہوئی کہ مصریوں نے محض چند ہی سال کے اندر تیسری خلافت کا خاتمہ کر کے حجازی عربوں کے طمطراق کو خاک میں ملا دیا اور وہی مصری جن کو ابھی پندرہ سال قبل عربوں نے شکست دی تھی مدینہ کے سیاہ و سفید کے مختار بن گئے۔ یہی نہیں بلکہ مصریوں نے "فاتحین" کے پورے گروہ کو جو مصریوں

کے خوف سے گھروں میں کنڈیاں لگائے بیٹھا تھا نظر انداز کرتے ہوئے اس شخص کو تخت خلافت سونپ دیا جسے یہ جماعت پورے پچیس سال تک اپنے مقاصد کی راہ میں سنگ گراں تصور کرتے ہوئے ٹھکراتی رہی تھی۔ اور نام نہاد عرب "فاتحین" کا یہ عالم تھا کہ ان کو چارو ناچار اسی شخص کی بیعت کرنا پڑی جسے وہ اپنے شہنشاہیت پسندی کے عزائم کا سب سے بڑا دشمن تصور کرتے تھے۔

شامیوں نے تلوار کی فتح کا جو بدلہ دیا وہ اسلامی تاریخ کا ایک انتہائی خونچکاں افسانہ ہے۔ دنیا نے یہ تماشہ دیکھا کہ وہی شامی جن کو مدینہ والوں کی شمشیر براں نے اپنا محکوم بنایا تھا محض تیس سال کی مختصر مدت میں خود مدینہ کے حاکم ہو گئے۔ اسلامی سیاست کا مرکز مدینہ سے دمشق منتقل ہو گیا اور مکہ اور مدینہ کو شامیوں کی شمشیر انتقام کی بدولت بار بار تاراجی کا منہ دیکھنا پڑا۔

ایرانیوں نے اپنی شکست کا انتقام اس طرح لیا کہ ایک صدی کے اندر ہی اندر بنی عباس کے پردہ میں عربوں پر ایرانیوں کا تسلط قائم ہو گیا!

ان تاریخی حقائق سے بھلا کیسے انکار ہو سکتا ہے؟

یہ واقعات بجائے خود اس کا ثبوت ہیں کہ امیر المومنین نے حالات کا بہت صحیح اندازہ لگایا تھا اور آپ کا یہ فیصلہ بالکل صحیح تھا کہ تلوار کی فتح چونکہ عارضی اور بے اثر ہے اس لیے اخلاقی، علمی، روحانی اور ذہنی فتح حاصل کی جانی چاہیے تاکہ مفتوحہ ممالک پر اسلام کا اثر قائم رہ سکے۔ آپ ہمیشہ اسی کوشش میں مصروف رہے چنانچہ آپ کی کاوشوں کا جو نتیجہ نکلا وہ آج بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔

عرب فاتحین نے قادسیہ، نہاوند اور یرموک میں خون کی ندیاں بہا کر ایران و مصر و شام و عراق پر جو پرچم فتح لہرایا تھا وہ تو چند ہی سال میں سرنگوں ہو گیا لیکن امیر المومنین نے روحانی، ذہنی اور مذہبی میدان میں جو پرچم فتح نصب کیا تھا وہ آج تک پوری شان سے

جلوہ گر ہے۔ چنانچہ ایران چلے جائیے۔ آج وہاں سعد بن وقاص کی فتح کا کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ نہاوند کے میدان میں جو خون بہا تھا وہ مدتیں ہوئیں خشک ہو چکا نہ معلوم کتنی سلطنتیں بنیں اور بگڑ گئیں چودہ سو برس میں نہ معلوم کتنے بادشاہ آئے اور گئے لیکن ایران پر امام علی رضاؑ کی حکومت بدستور قائم ہے اور امیرالمومنینؑ کے اس فرزند کو وہ دائمی حکمرانی حاصل ہے جو صرف دلوں کی تسخیر سے حاصل ہوا کرتی ہے۔ عراق پر مثنی بن حارث شیبانی کی لشکر کشی اور خالد بن ولید کی یلغار آج تاریخ کا ایک ورق پارینہ ہے اور اسلامی تاریخ کے طلبہ کے علاوہ اس عارضی ملک گیری کی داستان بھی کسی کو معلوم نہیں لیکن نجف، کربلا، کاظمین اور سامرہ علوی فتح روحانی کے وہ نقوش جمیل ہیں جو آج بھی دنیا کو آل رسولؐ کی فتح مبین کے مشاہدہ کی دعوت دے رہے ہیں۔ آل رسولؐ کے ان مآثر متبرکہ کے علاوہ سلمان، جابر بن عبداللہ انصاری اور حذیفہ یمانی کے مزارات اپنی مرجعیت کے ذریعہ امیرالمومنینؑ کی اصابت فکر کی گواہی دے رہے ہیں۔

شام میں یرموک کی فتح بھلائی جا چکی، خالد کی تلوار کسی عجائب گھر میں بھی موجود نہیں لیکن زینبؑ و ام کلثومؑ کے ناموں سے منسوب مزارات آج بھی مرجع خلائق ہیں۔ اور امیرالمومنینؑ کی حقانیت کا اعلان کر رہے ہیں۔ آج شام میں جا کے دیکھ لیجئے کہ اس ملک میں جو آل رسولؐ کے دشمنوں کا سب سے بڑا مرکز کہلاتا تھا اسلام کے مآثر کس ذات پاک سے تعلق رکھتے ہیں؟ آج شام پر مدینہ کی قرشی حکومت نہیں مدینہ والوں کی سلطنت کا کوئی عکس موجود نہیں تلوار کی فتح کی کوئی نشانی موجود نہیں لیکن آل رسولؐ کی مظلومانہ تبلیغ کے آثار چپہ چپہ پر موجود ہیں۔ حضرت زینبؑ حضرت ام کلثومؑ حضرت سکینہؑ حضرت ام حبیبہ، حضرت مقداد، حضرت حجر بن عدی، حضرت بلال، حضرت ابی بن کعب، حضرت رقیہ بنت الحسینؑ حضرت عبداللہ ابن جعفر، حضرت عبداللہ بن امام زین العابدینؑ حضرت فاطمہؑ بنت الحسینؑ اور حضرت عبداللہ بن امام جعفر صادق کے

مزارات قید خانہ شام، مشہد راس الحسینؑ، منبر سید سجادؑ، بازار شام کا پھاٹک اور سرہائے شہدائے کربلا، آج بھی شام میں اسلام کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں۔ تلوار کی فتح کے آثار مٹ گئے لیکن امیر المومنینؑ اور خانوادہ رسالت کی روحانی فتح شام کو اسلامی ممالک کا گہوارہ بنائے ہوئے ہے۔

لبنان میں محض ایک تاریخی عمارت ہے اور وہ ہے امیر المومنینؑ کے صاحبزادے حضرت محمد بن حنفیہ کا روضہ جو لبنان کے مسیحی ماحول میں بھی اسلام کی یاد تازہ کرتا رہتا ہے۔

مصر میں مشہد راس الحسینؑ کو جو مرجعیت حاصل ہے وہ کسی دوسری عمارت کو حاصل نہیں۔

یمن تلوار سے فتح نہیں ہوا، امیر المومنینؑ کی تبلیغ سے فتح ہوا۔ لیکن علوی تبلیغ کا اثر کچھ اتنا گہرا تھا کہ اسے اسلام سے وابستہ رکھنے کے لیے سرزمین یمن پر نہ تو کوئی قربانی دینا پڑی اور نہ علیؑ کے بعد کسی دوسرے کو اس علاقہ میں تبلیغ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آج یمن میں اسلام کی بقا اس حقیقت کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ اسلام کو کسی عسکری فتح کی ضرورت نہیں تھی۔ اسلام پرامن طریقہ پر ہی پھیل سکتا تھا اور پھیلا شام وایران و عراق اگر آج مسلمان ہیں تو اس لیے نہیں کہ ان علاقوں کو بزور شمشیر اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا گیا تھا بلکہ ان علاقوں میں اسلام کا وجود آل رسولؐ کے روحانی اور تبلیغی مجاہدات اور ان کی بے مثل قربانیوں کا صدقہ ہے یمن چونکہ تبلیغ سے مسلمان ہوا تھا اس لیے وہاں کسی قربانی کی ضرورت نہیں تھی۔ عراق، ایران اور شام تلوار سے فتح ہوئے تھے اس لئے وہاں دلوں کی تسخیر ضروری تھی۔ یہ کام فاتحین نے نہیں کیا، خانوادہ رسالت نے انجام دیا چنانچہ آج اگر یہ ممالک اسلام کے حلقہ بگوش ہیں اور عرب سلطنت کے خاتمہ کے ساتھ ہی دوبارہ اپنے آبائی مذاہب کی طرف نہیں پلٹ گئے تو یہ

فیض ہے اس دلوں کی فتح کا۔ اس روحانی اقتدار کا اس سچی مظلومانہ تبلیغ کا جس کے علمبردار امیرالمومنینؑ تھے۔

مزید یقین کی ضرورت ہو تو اندلس پر نظر ڈال لیجیے، میقلیہ کو دیکھ لیجیے، قبرص اور روڈی کینز کو ملاحظہ فرما لیجیے، جنوبی اطالیہ کے حالات پر نگاہ ڈال لیجیے۔ ان علاقوں میں صرف تلوار کی فتح ظہور میں آئی۔ تبلیغ علوی کا مظاہرہ نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جیسے ہی مسلمانوں کی سیاسی اور عسکری قوت میں زوال پیدا ہوا ان علاقوں سے اسلام کا بھی خاتمہ ہو گیا شام و ایران و عراق و مصر کا بھی یہی حال ہوتا لیکن آل رسولؐ نے دلوں کی فتح کا جو بندوبست کیا تھا اسی کے نتیجہ میں یہ علاقے سینکڑوں سیاسی انقلابات کے باوجود مسلمان ہیں اور اس خاموش سعی و جہد کی گواہی دے رہے ہیں جو امیرالمومنینؑ اسلام کے لیے فرما رہے تھے۔

امیرالمومنینؑ کی فتح مبین کا اس سے زیادہ کھلا اور روشن مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ جن ممالک کو ان لوگوں نے فتح کیا تھا جو امیرالمومنینؑ کو مسند خلافت سے دور رکھ کر آل رسولؐ گوشہ گمنامی میں پھینک دینا چاہتے تھے انہیں ممالک کے عوام آل رسولؐ کے مزارات انور کی خاک کو توتیائے چشم بنا رہے ہیں اور آج جبکہ عرب فاتحین اور ان کے سرداروں کے نام صرف ارباب تاریخ کو یاد رہ گئے ہیں عوام نجف و کربلا و خراسان کی روحانی عظمت کے سامنے سرنگوں نظر آ رہے ہیں یہ ہے دلوں کی اس فتح کا مظاہرہ جو امیرالمومنینؑ نے حاصل فرمائی اور جس کے نقوش انتہائی ظلم و ستم کے باوجود آج تک اسلامی عالم میں ہیرے کی طرح جگمگاتے نظر آ رہے ہیں۔

تحریک اسلامی کے قائد کے عظیم تدبر اور اس کی بے پناہ تبلیغی صلاحیتوں کا اس سے شاندار مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے تحریک اسلامی کے جواہر پاروں اور اسلام کے پرامن مبلغوں کو خانہ جنگی کی بھینٹ چڑھنے سے بچا لیا اور چند سال تک تخت

خلافت سے محروم ہونے پر صبر فرمالیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دولت اور سلطنت کے پروانوں نے قیصرو کسریٰ کے سے دشمنان اسلام کی کمر توڑ دی' دور دراز ممالک اسلام کے ظاہری ڈھانچہ سے واقف ہو گئے اور آل رسولؐ کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے خاموش مجاہدات اور پر امن تبلیغ سے ان علاقوں کو ہمیشہ کے لیے اسلام کا حلقہ بگوش بنالیں۔

(۷) اگر تحریک اسلامی کا قائد اعظم دور فتوحات میں مسلمانوں سے ظاہری تعاون کا مظاہرہ نہ کرتا تو تبلیغ اسلام کے یہ زریں مواقع اسے ہرگز نصیب نہ ہوتے یہی وجہ ہے کہ اس حکیم اسلام نے اس کا لحاظ نہیں کیا کہ تاج شاہی کس کے سر پر جگمگا رہا ہے۔ یا تاریخ کن شخصیتوں کے ساتھ فاتح ایران و شام کے الفاظ استعمال کرے گی' ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی فکر چھوٹے قلب و دماغ کے لوگ کرتے ہیں۔ حکمت ربانی کے امین ایسی ادنیٰ باتوں پر نظر نہیں ڈالتے' ان کو صرف اپنے اعلیٰ مقاصد کی فکر رہتی ہے اور وہ ان مقاصد کے اعتبار سے ہی اپنے اقدام تجویز کرتے ہیں' امیر المومنینؑ کے سامنے غیر ممالک میں اسلام کی تبلیغ کا سوال تھا قیصرو کسریٰ کی سی اسلام دشمن قوتوں کو ختم کر دینے کا مسئلہ تھا۔ اسلامی سرحدوں کو محفوظ بنا دینے کی ضرورت تھی اور آپ کو وہ طرز عمل اختیار کرنا تھا جو آپ کے ان مقاصد کو پورا کر سکے چنانچہ آپ نے ایک دور بین قائد کی حیثیت سے تخت خلافت کے حصول میں اپنی قوتیں ضائع نہیں کیں بلکہ وہ انداز کار اختیار فرمایا جس کے نتیجہ میں آپ کے تمام مقاصد خود بخود حاصل ہو گئے۔ مومنین کو آگ اور خون کی ہولی نہیں کھیلنا پڑی۔ سلمان و ابوذر تلوار کی آنچ سے بھی محفوظ رہے۔ سچے انقلابیوں کو قیصرو کسریٰ سے ٹکراؤ بھی نہیں لینا پڑا اور دنیا نے دیکھا کہ دشمنان اسلام کی قوت پارہ پارہ ہو گئی۔ اسلام کی سرحدیں ان لوگوں نے جن کو انقلاب اسلامی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور جو صرف دولت کے لیے لڑ رہے تھے قائدہ اٹھایا تحریک اسلامی کے ان شیدائیوں نے جو جنگ سے دور امن کی فضا میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ لڑنے

والے سلطنت کے لیے مرتے رہے اور صلحائے امت بقائے اسلام کے لیے جیتے رہے۔ اس سے زیادہ مدبرانہ قیادت اور تحریک اسلامی کی بصیرت افروز لیڈر شپ اور کیا ہو سکتی ہے؟

امیر المومنین علیہ السلام کو اس امر کا بخوبی اندازہ تھا کہ مفتوحین میں ہمیشہ فاتحین کے خلاف نفرت کا ایک جذبہ موجود رہتا ہے اور یہ نفرت صرف فاتحین کی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ ان کے مذہب' تمدن' تہذیب اور روایات تک سے مفتوحین کو شدید نفرت ہوا کرتی ہے یہ اور بات ہے کہ فاتحین کے رعب و دبدبہ کے نتیجہ میں مفتوحین خاموش رہیں لیکن یہ خاموشی رضا مندی کا ثبوت نہیں ہوتی۔ مصر و عراق و ایران و شام بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ ان ممالک میں بسنے والی قومیں بھی علم للاقوام کے اس دستور سے الگ نہیں چل سکتی تھی۔ وہ بھی اس نفسیاتی رد عمل کا مظاہرہ کرنے پر مجبور تھیں اور بہت ممکن تھا کہ ان ملکوں میں بھی اسلام کا وہی حشر ہوتا جو اسپین میں ہوا لیکن آل رسولؐ نے اپنی مظلومیت' حق پرستی تبلیغ اور روحانی برتری کے سہارے اس رد عمل کو وجود میں آنے سے روک دیا اور ان ممالک پر یہ حقیقت آشکار کر دی کہ اسلام فاتحین کی خونریز تلواروں کا نام نہیں ہے۔ کربلا کی داستان مظلومی کا نام ہے۔ اسلام حرص کشور کشائی کا مظاہرہ نہیں ہے ایک بلند تر اخلاقی اور روحانی نظام کا نام ہے اور اسلام کا مقصد مفتوحین کی دولت پر ڈاکہ ڈالنا نہیں ہے۔ خود بھوکے رہ کر غریبوں کا پیٹ پالنا اسلام کی تعلیم ہے' عراق' ایران' مصر و شام کی مفتوح قوموں نے یہ سمجھ لیا کہ اسلام کے حقیقی نمائندے وہ فاتحین نہیں تھے جنہوں نے ان ممالک کو روند ڈالا تھا بلکہ اسلام کی سچی تصویر وہ آل رسولؐ تھی جس نے خود اپنے خون میں نہا کر عروس اسلام کے رخ پُر نور کو نکھار دیا تھا۔ اسپین اور قادسیہ کے لوگوں کو یہ تجربہ نہیں ہوا انہوں نے صرف بنی امیہ کی تلواریں دیکھیں' آل رسولؐ کی قربانیوں اور ان کی محبت آفریں تبلیغ کا

منظر نہیں دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے موقع ملتے ہی مسلمانوں کے ساتھ ہی اسلام کا بھی خاتمہ کر دیا لیکن عراق و ایران و مصر و شام نے آل رسولؐ کو دیکھا' سیاست علویہ کے بے پناہ کمال کو دیکھا یعنی سچے اور نکھرے ہوئے اسلام کو دیکھا اور یہی وجہ ہے کہ جہاں انھوں نے مدینہ والوں کی فرمانروائی کا جال توڑ ڈالا وہیں اسلام کی حبل المتین میں خود اس طرح جکڑے گئے کہ آج تک وہاں آفتاب اسلام کی ضیاء پاشیاں جاری ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام نے جن عظیم مصالح کی بنیاد پر کوفہ کو اپنا دار الحکومت قرار دیا ان میں ایک بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ عراق اور ایران کے لوگ جن کے دلوں میں اپنی سلطنت اور عجمی تہذیب کی بربادی پر غم و غصہ کے شرارے بھڑک رہے تھے اور جو اسلام کو عرب شہنشاہیت کا مترادف سمجھ رہے تھے اسلام کے پیکر حقیقی کو امیر المومنینؑ اور آل رسولؐ کی شکل میں دیکھ لیں' ان لوگوں نے اب تک مسلمانوں کی تلوار کو دیکھا تھا اور حرص کشور کشائی کو اسلام سمجھا تھا اب ان کے سامنے آل رسولؐ کے محترم افراد پیش کیے گئے تاکہ وہ سمجھ لیں کہ اسلام نام ہے اس اعلیٰ اور برتر ذہنی' روحانی' علمی اور انقلابی تحریک کا جس کا مظہر اتم علیؑ' حسنؑ' حسینؑ اور ان کے ساتھی ہیں۔ اسلام کا یہ روپ پیش ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عجمیوں کے دل اسلام کے لیے جیت لیے گئے اور مسلمان فاتحین کی عارضی شہنشاہیت اسلام کی دائمی فتح میں تبدیل ہو گئی۔

شام کا معاملہ البتہ بہت ٹیڑھا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ شام خلافت دوم کے ابتدائی عہد میں فتح کر لیا گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھی کہ ابتدا سے ہی شام اس آل ابوسفیان کے ہاتھوں میں دے دیا گیا تھا جسے اسلام ظاہری تک سے دلچسپی نہیں تھی اور جس نے خود مسلمانوں کی تلوار کے خوف سے اسلام قبول کیا تھا۔ ایسی حالت میں شام میں حاکم اور محکوم' راعی اور رعایا دونوں وہ تھے جو اسلام سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے

خواہش مند تھے اور یہ چاہتے تھے کہ جس طرح مسلمانوں نے ان کے اقتدار' ان کی سلطنت' ان کے تمدن اور ان کے مذہب کو مٹایا ہے اسی طرح وہ اسلام اور اس کے تمام آثار کا خاتمہ کردیں شامی آل ابوسفیان کے محض اس لیے فدائی تھے کہ وہ یہ جانتے تھے کہ ابوسفیان نے خلافت ثالثہ قائم ہوتے ہی جنت و نار کا مضحکہ اڑایا ہے اور حاکم شام کا فرزند کھلم کھلا وحی کا مذاق اڑاتا ہے۔ ایسی حالت میں شامی یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ آل ابوسفیان کے پردہ میں اسلام اور مسلمانوں سے اپنی شکست کا پورا پورا انتقام لے سکیں گے۔ اسی طرح امیر معاویہ کو شامی عزیز تھے اس لیے کہ موصوف یہ جانتے تھے کہ کفار مکہ کا خاتمہ ہو جانے کے بعد اب شامی لشکروں کی مدد سے ہی اسلام کی انقلابی تحریک کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے' اسی حالت میں راعی اور رعایا دونوں کا مفاد' دونوں کا مقصد نصب العین ایک تھا دونوں اسلام دشمنی کے مسئلہ پر متحد تھے' یہ صحیح ہے کہ دونوں کے چہروں پر اسلام کی نقاب پڑی ہوئی تھی لیکن دلوں کا حال تو بس خدا ہی کو معلوم تھا شامی عیسائی محض تلوار کے بل پر اسلام کو حق نہیں مان سکتے تھے اس لیے پیشانیوں پر ہلال آویزاں کر لینے کے باوجود ان کے دل کے کلیسا صلیب سے معمور تھے۔ ان کی زبانوں پر توحید کا کلمہ ضرور تھا لیکن دل تثلیث کے پرستار تھے۔ وہ ظاہر میں بہ خوف شمشیر اسلام کے آگے تھے لیکن باطن میں مسیحیت کے شیدائی تھے اس لیے کہ یہ تو ایک حقیقت ہے کہ جبر سے دل یا مذہب تبدیل نہیں ہوا کرتا عقائد نہیں بدلا کرتے۔ تلوار کی طاقت زبان سے چاہے کچھ کہلوا لے لیکن تصورات کی دنیا پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ عربوں کی تلوار نے شامیوں پر اسلام "مسلط" کر دیا تھا لیکن ان کے دلوں سے مسیحیت ختم نہیں کی تھی۔ امیر معاویہ اس حقیقت کو خوب جانتے تھے چنانچہ انہوں نے شامی عیسائی کی دلجوئی کے لیے ہی وہ رویہ اختیار کیا تھا جس پر حضرت عمر کو یہ تاریخی جملہ ادا کرنا پڑا تھا کہ "معاویہ عرب کا قیصر ہے" امیر معاویہ کے صلیب گلے میں ڈال کر مرنے میں بھی یہی رمز پوشیدہ

تھا، موصوف خوب جانتے تھے کہ آپ کی رعایا کا اصلی مذہب کیا ہے اور ایک ہوشیار سیاستدان کی حیثیت سے رعایا کے جذبات سے کھیلنا بھی خوب جانتے تھے" آپ نے اپنی ان تدابیر سے شامیوں پر اچھی طرح سے یہ حقیقت واضح فرمادی کہ آپ ان لوگوں میں نہیں ہیں جنہوں نے شام کی مسیحی سلطنت، مسیحی تہذیب، قدیم شامی زبان اور مسیحی تمدن کو مٹایا ہے بلکہ آپ بھی دراصل انہیں لوگوں کے زخم خوردہ ہیں اور صرف اسی حد تک مسلمان ہیں جس حد تک تلوار نے شامیوں کو مسلمان بنا دیا ہے۔ ایسی حالت میں بنی امیہ اور شامیوں میں جس حد تک بھی اتحاد نہ ہو جاتا وہ کم تھا اس اتحاد نے پہلے تو یہ کیا کہ خلافت دوم و سوم کے زمانہ میں اسلام حقیقی کے علمبرداروں کو شامی سرحد میں داخل ہونے سے روکے رکھا چنانچہ ابوذر شام گئے تو نکالے گئے اور جو دوسرے ممتاز صحابہ رسولؐ اسلامی نظام زندگی کو سمجھتے تھے ان کو بھی شام سے دیس نکالا دے دیا گیا تاریخ میں بے شمار واقعات اس قسم کے بھرے ہوئے ہیں جس کا جی چاہے دیکھ لے اور جب دولت کی فراوانی اور ایمانی جذبہ کی کمی نے مرکز اسلام کو کمزور کیا تو یہی اتحاد شامی و سفیانی اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ ڈالنے صدر اسلام کو فنا کر دینے اور اسلامی انقلاب کا نام و نشان محو کر ڈالنے کے لیے صفین کے میدان میں خیمہ زن ہو گیا۔

شام کا مکار عیسائی یہ جانتا تھا کہ اگر اس نے اسلام کی ردا اتار کے مسیحیت کا جامہ پہن لیا تو سارے مسلمان شامیوں کے مقابلہ میں صف آرا ہو جائیں گے اور اس مرتبہ یرموک سے بھی زیادہ ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑے گا اس لیے وہ اسلام کی نقاب اوڑھ کے اسلام پر حملہ کرنا چاہتا تھا، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس نے نبیؐ اور آل نبیؐ کو مٹانے کا نام لیا تو مسلمان مشتعل ہو جائیں گے اس لیے اس نے نبیؐ اور خانوادہ نبوت کے بجائے علیؑ اور آل علیؑ کا لفظ گھڑ لیا اور یہ اعلان کیا کہ وہ علیؑ اور ان کی آلؑ سے لڑ رہا ہے وہ جانتا تھا کہ رسولؐ و آل رسولؐ اور علیؑ و آل علیؑ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ علیؑ و آل

علیؑ کو مٹا دیا تو رسولؐ اور ان کے خاندان کا نام تاریخ سے محو کر دیا لیکن پیغمبر اسلامؐ کے خلاف جنگ کا اعلان کرنے میں یہ خطرہ تھا کہ سارے مسلمان مقابلہ میں صف آرا ہو جاتے علیؑ و آل علیؑ کے خلاف اعلان جنگ کرنے میں یہ خطرہ باقی نہیں رہتا تھا بلکہ یہ یقین تھا کہ وہ منافقین رجعت پسند اور دولت کے بندے جو ہمیشہ علیؑ کو اپنے عزائم کی راہ میں سنگ گراں سمجھتے رہے ہیں نہ صرف یہ کہ علیؑ کے ساتھ نہیں آئیں گے بلکہ اپنے دل کے پردوں میں شامیوں کی طرف داری کریں گے' اس طرح عرب دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ اسلام کا درد رکھنے والے علیؑ کے ساتھ ہوں گے اور بقیہ لوگ گھروں میں بیٹھے رہیں گے۔ نتیجہ میں علیؑ کو شکست ہو جائے گی۔ اسلام کے شیدائی مارے جائیں گے اور شامی عیسائی مکہ اور مدینہ میں داخل ہو کر آثار اسلامی کا خاتمہ کر دیں گے۔ شامیوں کی خوش قسمتی کہ اسی زمانہ میں حضرت عائشہ اور ان کے ساتھیوں نے قصاص خون عثمان کا ڈھونگ ایجاد کر دیا یہ چیز بھی شامی عیسائی کے لیے مفید مطلب تھی۔ اس لیے کہ قصاص خون عثمان کا نام لے کر وہ ان پرستاران دولت کو بھی تحریک اسلامی کے قائد اعظم کا ساتھ دینے سے روک سکتا تھا جو حضرت عثمان کے ہمنوا اور ہوا خواہ تھے' چنانچہ مکہ کے بت پرستوں کے سردار ابو سفیان کے بیٹے اور شامی عیسائیوں نے مل کے اس موقع کو اسلام کے مٹا دینے کا بہترین موقع تصور کرتے ہوئے بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔

تحریک اسلامی کے قائد اعظم کے سامنے اب مندرجہ ذیل سوالات تھے۔

۱۔ شام کے عیسائی اور وہ بنی امیہ جو بدر' احد و خندق میں مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھا کر صرف تلوار کی طاقت سے مسلمان ہوئے اسلام کو مٹا دینے کے لیے متحد ہو گئے تھے اور ایک ایسا لشکر تیار ہو گیا جو اپنے مذہب کا بدلہ لینے کے جذبہ میں آگے بڑھ رہا تھا ایسی حالت میں ان سپاہیوں کی حالت ان سپاہیوں سے مختلف

تھی جو کسی بادشاہت یا دنیوی سلطنت کے لیے لڑتے ہیں مذہب کے لیے لڑنے والا سپاہی جان پر کھیل جانا ثواب جانتا ہے اس لیے اس کا موریل (کردار) اعلیٰ ہوتا ہے اور وہ آخری دم تک لڑتا رہتا ہے۔

۲۔ شامی لشکر نے قصاص خون عثمان کا نعرہ لگا کر اپنی جنگ کا اصلی مقصد مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا اس کا مقصد اصلی تو تھا اسلام کو فنا کر دینا اور مکہ و مدینہ کو نیست و نابود کر دینا لیکن اگر یہ مقصد اصلی مسلمانوں کے سامنے آجاتا تو سارے مسلمان خلیفہ وقت کی پشت پر جمع ہو جاتے اس لیے اس نے قصاص خون عثمان کا نعرہ لگایا تاکہ مسلمان اس دھوکے میں رہیں کہ علیؑ اور معاویہ میں خانہ جنگی ہو رہی ہے اور اس حقیقت کو نہ سمجھنے پائیں کہ صفین کے میدان میں دراصل اسلام اور زخم خوردہ مسیحیت میں جنگ ہو رہی ہے اس سے شامیوں کو ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ جنگ سے الگ رہا اور اسلام کی حفاظت و صیانت کی ساری ذمہ داری صرف کوفہ اور عراق کے لوگوں پر آگئی۔

۳۔ شامی علیؑ و آل علیؑ کو اپنا حریف قرار دے کر ان مسلمانوں کو بھی اسلام و کفر کے اس سنگین معرکہ سے علیحدہ کر دینے میں کامیاب ہو گئے جو امیرالمومنینؑ کو عرب شہنشاہیت کا مخالف جانتے تھے اور اس اعتبار سے آپ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ یہ لوگ اگر یہ سمجھتے کہ شامی عیسائی عربوں کے سیاسی اقتدار اعلیٰ کو چیلنج کر رہا ہے تو اپنی قومی عصبیت کے نتیجہ میں یہ ضرور میدان میں آجاتے لیکن ان کو یہ سمجھا کے چپ کرا دیا گیا کہ لڑائی مدینہ والوں یا عربوں کی سلطنت کے خلاف نہیں ہے صرف علی اور آل علیؑ سے ہے جن کو یہ لوگ خود بھی اپنی شہنشاہیت کا مخالف جانتے تھے۔

۴۔ شامی لشکروں کو اگر عربستان میں داخل ہو کر جنگ کرنے کی اجازت دے دی تو

کعبہ اور قبر رسولؐ کو مٹا دینے کا جذبہ شامی عیسائی میں تیز تر ہو جاتا اور پھر وہ انتہائی خوفناک طریقہ پر جنگ کرتا تاکہ اسلام کے ان مآثر متبرکہ کو مٹا کے اپنے کلیساؤں کی ویرانی کا بدلہ لے لے۔ بسر بن ارطاط کی سرکردگی میں مکہ پر شامی چھاپہ ماروں کا حملہ ان کے اس جذبہ کی پوری غمازی کر رہا ہے اور بعد میں یزیدی فوجوں نے صدر اسلام کے ان شہروں کے ساتھ جو سلوک کیا' کعبہ پر جس طرح آتشبازی کی گئی اور مدینہ کی جو بے حرمتی ہوئی وہ شامیوں کے ان عزائم کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہیں جو ان کے دلوں میں پوشیدہ تھے۔

مدینہ میں بیٹھ کر شامیوں کا مقابلہ کرنے میں ایک اور قباحت یہ تھی کہ خود مدینہ اور مکہ میں جو مخالفین موجود تھے وہ عین اس وقت جبکہ امیرالمومنینؑ اسلام اور مسیحیت کی یہ فیصلہ کن جنگ لڑ رہے ہوتے مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دینے سے نہیں چوکتے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مسلمان ہار جاتے' تحریک اسلامی کے سچے علمبردار قتل ہو جاتے مکہ اور مدینہ کے اسلامی آثار فنا کر دیئے جاتے اور دنیا سے اسلام کا خاتمہ ہو جاتا۔

بعض نافہم حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ امیرالمومنینؑ نے مدینہ کے بجائے کوفہ کو دارالحکومت کیوں قرار دیا؟ لیکن اگر وہ ممالک اسلامیہ کے نقشہ پر چند لمحات کے لیے بھی نظر ڈالیں تو ان کو خود یہ احساس ہو جائے گا کہ امیرالمومنینؑ نے دارالحکومت تبدیل کر کے اسلام پر احسان عظیم فرمایا تھا امیرالمومنینؑ اگر مدینہ میں موجود رہتے تو شامی لشکر تبوک اور خیبر کے راستوں سے گذرتا مدینہ پر حملہ آور ہو جاتا اور ایسی حالت میں صدر اسلام کو جس تباہی کا سامنا کرنا پڑتا اس کا تصور بھی ہمارے لیے محال ہے شامی عیسائی اپنی منزل کو قریب دیکھ کر جنگمیں جانیں لڑا دیتے اور ادھر ان کا طوفانی جوش دیکھ کر مکہ اور مدینہ میں جو منافقین اور

مفاد پسند موجود تھے وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتے امیر المومنینؑ کا لشکر دو طرف سے گھر کے ختم ہو جاتا اور شامی مدینہ اور مکہ کا اس سے بدتر حشر کرتے جو مسلمہ بن عقبہ کی سرکردگی میں ان کی اس دوسری نسل نے کیا جو واقعی مسلمان ہو چکی تھی یا کم از کم مسلمان کہلاتے ہوئے پلی بڑھی تھی —— آپ کا کوفہ کو دارالحکومت قرار دے دینا اور خود شام کی شمال مشرقی سرحدوں پر پہنچ جانا شامیوں کے اس عزم کی راہ میں حائل ہو گیا اور اب شامی مجبور ہو گئے کہ عراق کی سرزمین پر آپ سے جنگ کریں اس طرح ایک طرف تو منافقین اور قریش کے پٹے ہوئے مہرے شامیوں کی کوئی مدد نہیں کر سکے' دوسرے مراکز اسلام دور ہونے کی وجہ سے شامیوں کا جذبہ انتقام تیز تر نہ ہو سکا' تیسرے آپ کو عراق کے سورما وفاع اسلام کے لیے مل گئے جو مدینہ میں ملنا محال تھے جس کا ثبوت اسی سے مل جاتا ہے کہ جنگ جمل کے لیے مدینہ سے آپ کو دو ہزار سے زیادہ آدمی نہیں ملے تھے مدینہ کے لوگ تھکن کا شکار تھے اور ان کا جذبہ جہاد سرد پڑ چکا تھا' اس لیے وہ ایک لاکھ چالیس ہزار شامی لشکر کو دیکھ کر سوا اس کے کہ گھروں میں بیٹھ رہتے اور مسجد نبویؐ کی پامالی کا نظارہ کرتے رہتے اور کچھ کرنے والے نہیں تھے ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں شکست کے علاوہ اور کچھ نتیجہ نہ نکلتا مدینہ والوں کی اس بزدلی کے ثبوت کے لیے مدینہ پر یزیدی لشکر کے حملہ کے واقعات کافی ہیں۔

آپ نے کوفہ کو دارالحکومت قرار دے کر شامیوں کا سارا نقشہ جنگ پلٹ دیا مکہ اور مدینہ کو تاراج کر کے شامی کلیساؤں کا انتقام لینے کے خواب دیکھنے والے عراق کے ریگزاروں میں الجھا دیے گئے اور عراقیوں کی مدد سے لیلۃ الہریر کے معرکہ میں ان کو ایسی ہولناک شکست دی گئی کہ ان کے دلوں سے مکہ اور مدینہ کو تاراج دیکھنے کا خبط ہمیشہ کے لیے دور ہو گیا شمشیر آزمائی کی قوتیں افسردہ پڑ گئیں

اور تیغ و تبر کی جنگ کی جگہ سیاسی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ حکمین مقرر ہوئے دومتہ الجندل میں حکمین کا قضیہ چلتا رہا اور اس طرح وہ جنگ جو اسلام کو فنا کر دینے کے جذبہ میں شروع ہوئی تھی بے نتیجہ طریقہ پر ختم ہو گئی۔

کوفہ کو دارالحکومت قرار دینے میں جہاں یہ مصلحت تھی کہ شامی عیسائیوں کا سیلاب عربستان میں داخل نہ ہو وہیں اس میں یہ مصلحت بھی تھی کہ شامیوں سے جنگ کے دوران میں عراق ایران اور مصر پر تسلط قائم رہے اور وہاں کے غیر مسلم مرکز اسلام میں جنگ و جدل دیکھ کر بغاوتیں نہ کر دیں۔ فرض کیجئے کہ اگر امیر المومنینؑ مدینہ میں رہتے اور شامیوں کو تبوک یا خیبر میں روک کر جنگ کرتے تو ظاہر ہے کہ عربستان اور مصر کے مابین رسل و رسائل کا راستہ منقطع ہو جاتا اس لیے مصری باسانی سلطنت اسلامی کے خلاف بغاوت کر کے عربوں کو اپنے ملک سے بے دخل کر دیتے' ایرانی جو خلیفہ ثالث کے زمانہ میں بھی بار بار بغاوتیں کر چکے تھے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے اور ان کی شہ پر عراق میں بھی بغاوت ہو جاتی' نتیجہ میں اسلامی سلطنت پارہ پارہ ہو جاتی اور دنیا سے اسلام کا نام و نشان مٹ جاتا امیر المومنینؑ نے کوفہ کو دارالحکومت بنا کر اسلام کو بھی بچایا' اسلام کے مقدس آثار کا بھی تحفظ فرمایا اور اسلامی سلطنت کو بھی محفوظ فرما دیا جو سیاست علویہ کا ایک عدیم النظیر مظاہرہ تھا۔

۶۔ شامیوں کو میدان جنگ میں شکست دے دینا بازوئے خیبر شکن کے لیے آسان کام تھا لیکن یہ فتح بھی تلوار کی ہوتی اور اسی طرح عارضی ہوتی جس طرح عربوں کی ابتدائی فتح عارضی تھی' شامی پھر کوئی بہانہ تراش کے بغاوت کرتے اور اسلام کو مٹانے کے لیے میدان میں آجاتے' ایسی حالت میں ضرورت اس کی تھی کہ شامیوں کے قلوب پر فتح حاصل کی جائے' ان کے سامنے اسلام کے حقیقی خدوخال

پیش کیے جائیں ان کو بتلایا جائے کہ اسلام وہ نہیں ہے جسے انہوں نے خالد کی تلوار یا آل ابوسفیان کے قیصری کردار میں دیکھا ہے بلکہ اسلام ایک اعلیٰ اخلاقی اور روحانی نظام ہے جس کی علمبرداری رسول اللہؐ کی اولادِ کر رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں تھا' شامیوں کے دلوں میں بھڑکتی ہوئی آگ پر پانی ڈالنا' مسیحیت کا زنگ دور کر کے ان کے دل کے شیشوں میں اسلام کا رنگ بھرنا آل ابوسفیان کی عیاریوں کا جال توڑ کے اسلام کی حقانیت کو واضح کرنا اور شامی عیسائی کو اسلام کا علمبردار بنا دینا اور وہ بھی اس وقت جبکہ نیزے لچک رہے ہوں تلواریں چمک رہی ہوں تیر سنسنا رہے ہوں اور موت کا عفریت سروں پر منڈلا رہا ہو' بڑا دقت طلب کام تھا اس کے لیے قیادت کی ملکوتی اور مافوق البشری قوتیں درکار تھیں' یہ کام عام انسانی سطح سے بہت بالاتر سطح انسان کا تھا اور اسلام خوش قسمت تھا کہ اسے اپنی قیادت کے لیے امیرالمومنینؑ کی شکل میں ایسا ہی قائد میسر تھا۔ چنانچہ آپ نے وہ کیا جو صرف حکمت ربانی کے امین سے ہی ممکن تھا اور دنیا نے دیکھا کہ وہی شخص جس نے ہمیشہ قریش کے سلحشوروں کو چند گھنٹوں میں راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا جس نے جمل اور نہروان کے معرکے ایک ایک دن میں سر کر لیے جس نے باب خیبر کی چولیں ہلا کے یہودیوں کا غرور "انا" خاک میں ملا دیا وہی شخص تین چار سال تک شامیوں کے مقابلہ میں خیمہ زن ہے اور فیصلہ کن فتح حاصل نہیں کرتا وجہ صاف ظاہر ہے اگر فیصلہ کن ٹکراؤ کر کے شامیوں کو ایک دن میں شکست دے دی جاتی (جو امیرالمومنینؑ کے لیے مشکل نہیں تھا) یہ تو فتح تلوار کی ہوتی' علیؑ کی ہوتی' اسلام کی نہ ہوتی۔ اس کے برعکس جنگ کو طویل دیا گیا تاکہ شامی اسلام کا علوی روپ دیکھ لیں۔ شامیوں کو معلوم ہو کہ اسلام اس عظیم خلاقی اور روحانی تحریک کا نام ہے جس کے مظہر اتم خود علیؑ ہیں۔ اسلام خونریز

شہنشاہیت کا نام نہیں ہے ایک برتر نظام زندگی کا نام ہے۔ اسلام کا مقصد بنی امیہ کے شاہزادوں کی عیاشی کے لیے عوام کی دولت لٹانا نہیں ہے بلکہ تقسیم بالسویہ کے ذریعہ ایک عادلانہ معاشی نظام کو وجود میں لانا ہے اسلام وحشی چنگیزوں کے مظاہرہ قوت کا نام نہیں ہے بلکہ آل رسولؐ کی تہذیب نفس کا نام ہے امیر المومنینؑ نے فیصلہ کن جنگ نہیں کی، شامی کو تلوار سے زیر نہیں کیا بلکہ آپ نے جنگ کو طول دے کر شامیوں کو اسلامی تحریک کو سمجھنے اور اسلام کے حقیقی خدو خال معلوم کرنے کا موقع دیا اس سیاست کے نتیجہ میں امیر المومنینؑ فاتح شام تو نہیں کہلائے لیکن شامیوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف جو زہر بھرا ہوا تھا اسے آپ نے کم کر دیا۔ علیؑ بہ حیثیت خلیفہ وقت تو جنگ نہیں جیتے لیکن مسیحیت کے مقابلہ میں اسلام ضرور جیت گیا اور یہی امیر المومنینؑ کا مقصود تھا۔

امیر المومنینؑ نے صرف یہی کامیابی حاصل نہیں کی کہ شامیوں کو خود ان کی سرحد پر جنگ میں الجھا کے صدر اسلام کے مراکز کو محفوظ رکھا یا جنگ کو طول دے کر شامیوں کے سامنے اسلام کا اصلی روپ پیش کر دیا اور اس کے نتیجہ میں ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف جو نفرت تھی اسے بڑی حد تک دور کر دیا بلکہ جنگ کو طول دے کر ایک اور عجیب و غریب کامیابی حاصل فرمائی جس پر مورخین کی نظر بالکل نہیں جاتی ہے۔ اور وہ کامیابی یہ تھی کہ آپ نے۔

شامیوں کا مقصد جنگ تبدیل کر دیا!

شامی اور ان کے ہم نوا بنی امیہ دراصل اس لیے میدان میں آئے تھے کہ اسلام کو مٹا دیں، امیر معاویہ ہوں یا شامی ان کو اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ صرف اس لیے لڑ رہے تھے کہ اسلام کی انقلابی تحریک کو مٹا کے پرانا جاہلی نظام واپس لے آیا جائے۔ یہ مقصد تھا وہ جو دلوں کے پردوں میں مستور تھا، زبانوں سے جو مقصد ظاہر کیا جا

رہا تھا وہ قتل عثمان کا قصاص تھا لیکن جنگ کو طول دیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ۔

امیر معاویہ نے خلافت کا دعویٰ کر دیا

بادی النظر میں اسے امیر المومنینؑ کی کامیابی سے تعبیر کرنا بہت عجیب سی بات ہے لیکن جو لوگ سیاست علویہ کے طریق کار اور اس کے مقصد کو سمجھتے ہیں کہ وہ اسے نہ صرف یہ کہ امیر المومنینؑ کی کامیابی قرار دینے پر مجبور ہیں بلکہ شاید اس امر کا اعتراف کرنے پر بھی مجبور ہیں کہ یہ امیر المومنینؑ کی درخشاں حیات طیبہ کی سب سے بڑی کامیابی تھی!

وفات رسولؐ کے بعد امیر المومنینؑ کو مدینہ کے جن لوگوں سے سابقہ پڑا تھا وہ رجعت پسند منافقین کے علاوہ باقی سب کے سب مسلمان تھے یہ صحیح ہے کہ ان میں دولت کے شیدائی تھے بعض سطحی فکر رکھنے والے جاہ پرور تھے، بعض اسلام کے سچے فدائی تھے لیکن تھے سب مسلمان اور اسلام کی شوکت ظاہری مسلمانوں کے غلبہ و اقتدار اور کفار کے مقابلہ میں مسلمانوں کی حفاظت و صیانت کے نام پر سب متحد ہو سکتے تھے۔ ان لوگوں سے اسلامی سرحدوں کی حفاظت کا کام لے لینا ان کے ذریعہ مرتدین کی قوت کا خاتمہ کرا دینا اور ان کو قیصر و کسریٰ کی اسلام دشمن قوتوں کے مقابلہ میں صف آرا کر دینا آسان کام تھا اور محض مسئلہ خلافت پر خاموشی اختیار کر کے ان سے یہ کام لے لیا گیا لیکن بنی امیہ اور شامی عیسائیوں کی اس قوت کو جو اسلام کو مٹانے کے لیے وجود میں آگئی تھی اسلام کے اعلان پر مجبور کر دینا صرف اسی شخص کا کام ہو سکتا تھا جسے اللہ نے عقل و حکمت کی ان مافوق البشری منزلوں پر فائز کر دیا ہو جن تک انسان کی رسائی قطعاً محال ہے امیر المومنینؑ نے جنگ کو طول دیا جس کے نتیجہ میں حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ معاویہ خلافت کے مدعی ہو گئے اور ظاہر ہے کہ خلافت اسلامی کا دعویدار خواہ ذاتی حیثیت سے کتنا ہی غلط اور خراب شخص کیوں نہ ہو اسلام اور سلطنت اسلامی کو فنا کر دینے کا

اعلان نہیں کر سکتا' وہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے پر مجبور ہے۔ اسلام سے ظاہری دلچسپی رکھنے پر مجبور ہے اور دکھاوے کے لیے ہی سہی لیکن ارکان اسلامی کی بجا آوری پر مجبور ہے۔ خلافت کا مطالبہ کر دینے کے بعد امیر معاویہ حضرت علی علیہ السلام کے خلاف تو جنگ جاری رکھ سکتے تھے لیکن اسلام کے خلاف جنگ کرنے ماثر اسلامی کو مٹا دینے' قرآن کو (جس کے وحی ربانی ہونے پر بنی امیہ کا جتنا ایمان تھا وہ یزید نے سر حسینؑ دیکھنے کے بعد ظاہر کر دیا تھا) فنا کر دینے یا ارکان و عقائد اسلام کو ختم کر دینے کا اعلان ہرگز نہیں کر سکتے تھے' وہ آل رسولؐ پر دشنام طرازی کا سلسلہ جاری کر کے اپنے دل کے پھپھولے تو پھوڑ سکتے تھے لیکن قبر رسولؐ کو مسمار کر کے بدر و احد کی شکست کا بدلہ لینے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے' وہ خانوادہ رسالت کے حامیوں اور سچے مسلمانوں کو تیغ ستم کا نشانہ بنا سکتے تھے اور اس طرح سرور کائناتؐ کی روح کو تڑپا سکتے تھے لیکن ظاہری طور پر اسلام کو ختم کر کے اپنے آبائی مذہب کو رائج کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔۔۔۔ اس لیے کہ وہ "اسلامی خلافت" کے دعویدار تھے اور اس اقتدار سے اپنے آپ کو دنیا کی نگاہوں میں مسلمانوں اور اسلام کا ہمدرد ثابت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ امیر معاویہ کو میدان صفین میں شکست دے دی جاتی تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ بنی امیہ اور شامی عیسائی پھر مسلمانوں کی تلوار کے سامنے سرنگوں ہو جاتے لیکن ان میں تخت خلافت کی تمنا پیدا ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ:۔

۱۔ شامی عیسائیت اور ابو سفیانی دور جاہلیت کے دوبارہ ابھرنے یا اسلام سے ٹکر لینے کا امکان ختم ہو گیا۔

۲۔ شامیوں کو مسیحیت کی جانب لوٹ جانے کے بجائے مسلمان بنے رہنا پڑا اور اس طرح آل رسولؐ کو کچھ عرصہ کے بعد یہ موقع مل گیا کہ وہ قید خانۂ شام کی مظلومانہ تبلیغ کے نتیجہ میں ان کو ہمیشہ کے لیے اسلام کا حلقہ بگوش بنا لیں۔

۳۔ دنیائے اسلام کے اندر اسلام کے لیے جو عظیم خطرہ معاویہ اور اس کے ساتھیوں کی شکل میں موجود تھا اور جس کے نتیجہ میں عرب کے دور جاہلیت کے دوبارہ ظہور میں آجانے کا امکان تھا اس کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا یہ موک کا مورچہ سر کرنے والوں نے عارضی طور پر شام کو عربی سلطنت کے لیے فتح کر لیا تھا لیکن شام کو اسلام کے لیے فتح کرنے کا سہرا امیر المومنینؑ کے سر ہے اگر آپ معاویہ اور اس کے ساتھیوں کو صفین میں اسی طرح شکست دے دیتے جس طرح بدر اور خندق میں دے چکے تھے تو دنیا تاریخ کا یہ عجوبہ نہ دیکھتی کہ ابوسفیان کی نسل جو خود دل سے اسلام کی قائل نہیں تھی اسلام کے نام پر کافروں سے لڑتی رہی اسلام کے لیے ممالک فتح کرتی رہی اور شرک و الحاد کے ان مرکزوں کو مٹانے کا کام انجام دیتی رہی جس کی وہ خود اپنے دل کے پردوں میں علمبردار تھی۔

امیر معاویہ کا دعوئ خلافت خود ان کی شکست تھی۔ اس لیے کہ یہ دعوی کر دینے کے بعد ان کو اسلام سے روگردان ہونے کا موقع باقی نہیں رہا اسی طرح ان کے حامی شامی جو اپنے دل کے پردوں میں عیسائی تھے اور مسلمان بن کے تحریک اسلامی کے قائد کے مقابلہ میں جنگ کر رہے تھے اس پر مجبور ہو گئے کہ اپنے چہروں پر اسلام کی نقاب ڈالے رہیں اس طرح بظاہر مسلمانوں اور بباطن اسلام دشمنوں کی وہ نسل جو اسلام کو مٹانے کا تہیہ کر کے میدان میں آئی تھی۔ مسلمانوں کے سامنے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے مسلمان بنی رہی اور اس کے بظاہر مسلمان بنے رہنے کے نتیجہ میں ان کی اولادیں اپنے آبائی دین کو بھول کر واقعی مسلمان بن گئیں۔ تحریک اسلامی کے قائد کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی اس لیے کہ امیر المومنینؑ بادشاہ نہیں تھے جن کو عسکری فتح کی ضرورت ہوتی آپ دراصل اسلام کے مبلغ اور اس الٰہی تحریک کے داعی تھے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا اس لیے آپ کا اصل مقصد لوگوں کو مسلمان بنانا تھا نہ کہ ان

سے اپنی حکومت تسلیم کرانا صفین کی جنگ طولانی ہو جانے کے نتیجے میں آپ کا مقصد حاصل ہو گیا شامی مسلمان ہو گئے اور اس طرح سیاست علویہ کے نتیجے میں شام کو ہمیشہ کے لیے اسلام کا حلقہ بگوش بنا لیا گیا جو اسلام دشمنوں کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔

اندرونی اصلاح

تحریک اسلامی کے قائد کو جہاں مرتدین کی شورش، منافقین کی ریشہ دوانیوں اور قیصر و کسریٰ کی یلغار کے سیاسی خطرات کا سامنا تھا وہیں عربوں کے دلوں میں اسلام کی تعلیمات پوری طرح راسخ کر دینے اور صدر اسلام کو گھیرنے والے مذہبی خطرات سے محفوظ کر دینے کی ذمہ داری بھی اسی عظیم المرتبت قائد پر تھی۔ اس کی دور رس نگاہیں یہ تماشہ دیکھ رہی تھیں کہ:-

ب۔ فتوحات کے نتیجہ میں مسلمانوں کا واسطہ غیر اقوام سے پڑنے لگا۔ اس لئے ان کے تصورات مسلمانوں پر ضرور اثر انداز ہوں گے۔ آپ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے کہ عرب خود ایک جاہل قوم تھے، لیکن وہ جن ممالک کو فتح کر رہے تھے وہ علم اور فلسفہ کا مخزن تھے۔ ایران، شام اور مصر قدیمی علوم کے گہوارے تھے اور ان ممالک میں داخلہ کے بعد مسلمان ان ممالک کے علوم اور ان کے تصورات سے غیر متاثر نہیں رہ سکتے تھے۔ ایسی حالت میں یہ یقینی تھا کہ ایران جانے والے مسلمان مزدکیت، ثانویت اور نوافلاطونیت کا شکار ہوں گے اور شام کی سرسبز وادیوں میں گلگشت کرنے والے سیدھے سادے عرب یونانی اور شامی فلسفہ کے سامنے سربسجود ہو جائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ عربوں کے عقائد متاثر ہوں گے۔ ان کا دین مسخ ہو جائے گا۔ اسلام کی نئی نئی تعبیرات وجود میں آئیں گی اور مسلمان چٹانوں کے سے بلند اور مضبوط عقائد رکھنے کی بجائے عجمی و یونانی فلسفہ کے خشک بیابانوں میں بھٹکنے والی قوم بن جائیں گے۔

ج۔ غیر ملکیوں سے اختلاط کا نتیجہ یہ ہو گا کہ عربی زبان اپنی سادہ خصوصیات کھو

دے گی۔ اس میں زبردست تبدیلیاں ہو جائیں گی اور وہ زبان جس میں قرآن اترا تھا عربوں کے لئے غریب ہو جائے گی۔ جس کے نتیجہ میں آئندہ نسلوں کو قرآن سمجھنا مشکل ہو جائے گا۔

۳۔ جنگوں کے نتیجہ میں احادیث اور مسائل فقہ کے جاننے والے سینکڑوں صحابہ قتل ہوتے جا رہے تھے اور یہ اندیشہ تھا کہ ان علمی جواہر پاروں کو منضبط نہ کر لیا گیا تو حدیث اور فقہ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لئے کہ جہاں ایک طرف راویان حدیث تلواروں کی چھاؤں میں موت سے ہمکنار ہوتے جا رہے تھے وہیں دوسری طرف فرمانروایان وقت اس پر مصر تھے کہ حدیث کی کتابت نہ ہونے دی جائے۔ روایت حدیث پر لوگوں کو سزائیں دی جاتی تھیں اور جو لوگ احادیث کو لکھتے تھے ان کے جمع کردہ صحیفے جلا ڈالے جاتے تھے۔ حکمران جماعت کا قول تھا کہ علم کو کتابوں میں قید کرنا حرام ہے اور اس مہمل تصور کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی علوم فنا ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

۴۔ حکومت وقت کی جانب سے نشر علوم تہذیب نفس یا تبلیغ احکام کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ عوام کو اسلام کے عظیم اخلاقی اور روحانی ورثہ سے مالا مال کرنے کی کوئی سعی نہیں کی جا رہی تھی اور اندیشہ یہ تھا کہ دولت کی فراوانی، سامان عشرت کی کثرت اور علم سے تہی دامنی عربوں کے اخلاق و کردار اور ان کے نظم و ضبط کا خاتمہ کر دے گی۔

۵۔ حکمران طبقہ قرآن میں تفکر و تعقل کا بھی حامی نہیں تھا اور بعض حضرات ایسے بھی تھے جو تاویل و تفسیر کو حرام جانتے تھے۔ اس کا انجام یہی ہو سکتا تھا کہ خدا کی ہستی تک کا دعویٰ کر دیا جائے اور مسلمانوں میں ایسے مہمل عقائد پیدا ہو جائیں جن پر

ہزار خندہ کفرست بر مسلمانی

کا مفہوم صادق آجائے۔

تھا۔ حکمران طبقہ کو اس درجہ جاہل رکھنے پر تلا ہوا تھا کہ تقریباً ایک صدی کے بعد عبدالمالک بن مروان کو یہ تاریخی جملہ کہنا پڑا کہ "عجمیوں نے صدیوں حکومت کی لیکن ان کو کبھی عربوں کی مدد کی ضرورت نہیں پڑی اور عرب ایک صدی بھی حکومت کا کاروبار عجمیوں کی مدد کے بغیر نہ چلا سکے"۔ سلطنت اسلامی پر عجمیوں کے اس بے پناہ اثر و نفوذ کی وجہ صرف یہی تھی کہ حکمران طبقہ کو فتوحات کی تو فکر تھی لیکن نشر علوم پر اس کی کوئی توجہ نہیں تھی۔ آگے چل کر اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرب تلوار کی جنگ تو جیت گئے لیکن علم، تہذیب اور فلسفہ کی جنگ اس بری طرح ہارے کہ بنی امیہ اور بنی عباس کے دور سلطنت میں مسلمانوں میں نت نئے مذاہب وجود میں آگئے اور عجمی و یونانی فلسفوں نے مسلمانوں کے عقائد تک تاراج کر دیئے۔

تحریک اسلامی کا قائد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی مسند روحانی کا وارث اسلام کے ان داخلی فتنوں سے چشم پوشی نہیں کر سکتا تھا، وہ اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ مسلمان علمی اور تہذیبی جنگ ہار جائیں یا مسلمانوں کے نفوس پر دور جاہلیت کے کردار کے نقش کے پرت پڑ جائیں۔ چنانچہ دفن رسولؐ سے فرصت پاتے ہی امیرالمومنینؑ نے جو پہلا تاریخی اعلان فرمایا وہ یہ تھا کہ:

"میں اس وقت تک اپنے دوش پر عبا نہیں ڈالوں گا جب تک کہ قرآن جمع نہ کر لوں۔"

یہ وہ وقت تھا جب حضرت ابوبکر اور حضرت زید بن ثابتؓ نے حضرات تدوین و کتابت قرآن کے متعلق یہ رائے قرار دے رکھی تھی کہ:

"ہم وہ کام (تدوین و کتابت قرآن) کیسے کر سکتے ہیں جسے نبی کریمؐ نے بھی اپنی زندگی میں انجام نہیں دیا۔"

اس زمانہ میں جبکہ مسلمانوں کا برسراقتدار طبقہ تدوین و کتابت قرآن کی بھی

حالت کر رہا تھا۔ امیر المومنین نے نہ صرف یہ کہ قرآن مجید کو ترتیب نزول کے مطابق جمع فرمایا بلکہ اس کے ساتھ ہی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے تفسیری ارشادات بھی حاشیہ پر جمع فرما دیئے تاکہ آنے والی نسلوں میں فہم قرآن کے متعلق اختلافات پیدا نہ ہوں اور ع

احکام ترے حق ہیں مگر ان کے مفسر
تفسیر سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پاژند

کی نوبت نہ آنے پائے لیکن ملت اسلامیہ کی بد قسمتی کہ قرآن حکیم کا یہ نادر نسخہ دنیا کے سامنے پیش نہیں ہو سکا اور تفسیر رسالت گم ہو جانے کے نتیجہ میں مسلمان فہم قرآن کے سلسلہ میں ان اختلافات کا شکار ہو گئے جن سے تحریک اسلامی کا قائد ان کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

قرآن پاک کے سلسلہ میں آپ کی دوسری عظیم خدمت یہ تھی کہ آپ نے علم نحو کے اصول مرتب فرمائے اور اپنے شاگرد ابو الاسود دوئلی کو ان اصولوں کے مطابق کتاب مرتب کرنے کی ہدایت فرمائی۔ اس طرح آپ نے عربی زبان اور اس کے قواعد کو جو غیر ملکیوں سے اختلاط کے نتیجہ میں برباد ہو سکتی تھی محفوظ فرما دیا۔ ابو الاسود نے آپ کی اسی خدمت جلیلہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"آپ نے ہم عربوں کو زندہ کر دیا اور ہماری زبان کو بقائے دوام عطا کر دی۔"

قرآن پاک پر نقطے اور اعراب لگانے کی سعادت بھی ابو الاسود دوئلی کو حاصل ہے۔

احیائے معارف اسلامیہ کے سلسلہ میں آپ کی دوسری عظیم خدمت یہ تھی کہ آپ نے احادیث کا ایک صحیفہ مرتب فرمایا تھا جس میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی وہ تمام احادیث جمع کر دی تھیں جن کی امت کو ضرورت تھی۔ یہ صحیفہ ۷۰ گز

لیکن پوست آہو پر تحریر کیا گیا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ علمی مجموعہ بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے ورنہ شاید حدیث سازی کے نتیجہ میں مسلمانوں کو جو روزِ بد دیکھنا پڑا اس سے وہ محفوظ رہتے۔

اس زمانہ میں جبکہ خلیفہ وقت تدوین حدیث پر لوگوں کو سزائیں دے رہا تھا اور جلیل القدر صحابہ تازیانوں کے خوف سے سرمایہ حدیث کو دلوں میں محفوظ رکھنے پر مجبور تھے یہ تحریک اسلامی کے قائد اعظم ہی کا دل جگر تھا کہ اس نے حدیث کے اس گراں قدر سرمائے کو کتابی شکل دے دی جو بعد میں آئمہ آل رسول کے ذریعہ امت تک پہنچا رہا۔

اسلامیات کا وہ نادر روزگار خزانہ جسے علم فقہ سے موسوم کیا جاتا ہے امیر المومنینؑ ہی کی کاوشوں کا طفیل ہے چنانچہ شیعہ ہوں یا سنی دونوں کا سرمایہ فقہ جن حضرات کے ذریعہ فراہم ہوا ہے وہ امیر المومنینؑ ہی کے خرمن علم کے خوشہ چین تھے۔

اسلامی علم کلام کے موجد بھی امیر المومنینؑ ہی ہیں چنانچہ نہج البلاغہ کے نام سے آج بھی اس حکیم ربانی کے ان مفکرانہ ارشادات کا ذخیرہ ہمارے سامنے موجود ہے جو ذات باری، جبر و قدر، مقصد تخلیق انسانی، معاش و معاد، قضا و قدر اور اسی قسم کے دوسرے شعبوں مسائل علمیہ میں اسلام کے نقطہ نظر کی صحیح ترین ترجمانی کرتا ہے۔ ابن ابی الحدید معتزلی نے اس مسئلہ پر پوری تفصیل سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اسلام کے تمام خلاصے حقائق و معارف دین کے باب میں امیر المومنینؑ ہی کے مکتب فکر کے پروردہ اور دانش و حکمت کے سلسلہ میں آپ ہی کے خرمن کے خوشہ چین ہیں۔

زمانہ قبل اسلام میں عربی شاعری کو کافی عروج حاصل ہو چکا تھا لیکن نثر پر عروج کی توجہ بالکل نہیں تھی، حالانکہ علوم و فنون کی تدوین نثر ہی کے سہارے ہوا کرتی ہے عرب میں فصاحت و بلاغت کا سارا مظاہرہ نظم میں ہوتا تھا نثر کم سوادی کی دلیل تصور کی جاتی تھی عربی نثر کی پہلی قابل ذکر کتاب قرآن پاک ہے جس نے عربوں کو شعر و

شاعری کے مقابلہ میں نثر کی قوت و صلاحیت سے آشنا کیا لیکن قرآن بہرحال کتاب الٰہی تھا۔ اس لئے عربوں کا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ نثر میں عام انسان بھی اپنی صلاحیتوں کا پورا پورا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے مکاتیب، خطبات، توقیعات اور فرامین کے ذریعہ عربوں کو نثر کی قدر و قیمت سے آگاہ کیا اور اس طرح عربی زبان کو جو محض شعر و شاعری تک محدود تھی ایک علمی زبان بننے میں مدد دی۔ آپ نے صرف یہی نہیں کیا کہ عربی نثر پر توجہ فرما کر خود چند علمی چیزیں تحریر فرمادیں بلکہ اپنے اصحاب اور شاگردوں کو توجہ دلائی کہ وہ عربی زبان میں کتابیں تصنیف فرمائیں۔ چنانچہ آپ کے زیر اثر دنیائے اسلام میں مصنفین کی ایک اچھی خاصی جماعت تیار ہو گئی اور عربی زبان ایک علمی تحریک کا مرکز بن گئی۔ آج یہ عرض کرنا مبالغہ نہیں ہے کہ عربی زبان میں علوم و معارف کا جتنا بھی خزانہ موجود ہے وہ طفیل ہے امیرالمومنین کا اس لئے کہ آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں جس نے عربوں کی توجہ شاعری سے ہٹا کر نثر پر مبذول فرمائیں۔ خود متعدد چیزیں تصنیف فرمائیں اور عربوں میں تصنیف و تالیف کا ذوق بیدار کر کے اپنے شاگردوں سے کتابیں لکھوائیں۔ اس طرح عربی زبان میں علمی تصانیف کا آغاز آپ ہی کا کارنامہ ہے اور یہ آپ ہی کی دکھائی ہوئی راہ کا نتیجہ ہے کہ آج عربی زبان علوم و معارف کی خزینہ دار نظر آرہی ہے۔

ایک طرف وہ مسلمان تھے جو فتوحات ملکی میں مصروف تھے، دولت اور خزانے سمیٹ رہے تھے، مال غنیمت بٹور رہے تھے اور تحریک اسلامی کو قطعاً فراموش کر چکے تھے اور دوسری طرف امیرالمومنین تھے جو مسجد نبوی کو نشر علم اور تہذیب اخلاق کا گہوارہ بنائے ہوئے تھے۔ آپ پابندی سے مسجد نبوی میں الہیات، اخلاقیات، تفسیر، حفاظ اور فقہ وغیرہ پر تقریریں فرماتے رہتے تھے اور اس طرح مسلمانوں کو ان کا وہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتے رہتے تھے جسے وہ دولت اور سلطنت کی دھن میں فراموش کر چکے تھے۔

ایک طرف شیطان تھا جو مسلمانوں کو دولت و مملکت کا فریب دے کر دولت ایمان لوٹ لینے پر تلا ہوا تھا اور دوسری طرف تحریک اسلامی کا قائد تھا جو علم و معرفت کی نور آگیں شمعیں روشن کئے عربوں کو اس عظیم روحانی اور اخلاقی تعلیم کی جانب دعوت دے رہا تھا جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کو دی تھی۔ شیطان دولت کی دیواریں کھڑی کر کے جہل کی ظلمت عام کرنا چاہتا تھا۔ علیؑ علم کا نور پھیلا کے ایمان و معرفت کی دولت لٹا رہے تھے۔ شیطان اپنی مہم میں ہارا۔ علیؑ جیتے۔ اسلامی علوم باقی رہ گئے اور حق کو وہ فتح مبین حاصل ہوئی جس کے اثرات آج تک دنیا کے گوشہ گوشہ میں نظر آ رہے ہیں۔

نشر علم و تزکیہ اخلاق امیرالمومنینؑ کے نزدیک اتنی اہمیت کے مالک تھے کہ اپنی خلافت ظاہری کے زمانہ میں بھی جب آپ کو جمل، صفین اور نہروان کے معرکے درپیش تھے آپ روزانہ مسجد میں صبح کے وقت درس اور موعظہ ضرور فرماتے تھے اور مسلمانوں کو ان گرانقدر علمی، اخلاقی اور روحانی اقدار سے باخبر رکھتے تھے جن کا احیاء ہی اسلام کا منشاء و مقصود تھا۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ابتدائی خلافتوں کے دور میں مسلمانوں میں جو بھی علمی کاوشیں ظہور میں آئیں وہ امیرالمومنینؑ کی مرہون منت تھیں اور علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت کا کام تنہا آپ نے انجام دیا۔ اس طرح آپ نے اندرونی اصلاح کا کام جو بہ حیثیت امام وقت اور بہ حیثیت جانشین رسولؐ آپ ہی کا فریضہ تھا پوری طرح انجام دیا اور مسلمانوں کو اسلام کی اس صراط مستقیم پر قائم رکھا جسے جہل کی ظلمتیں اور دولت کی فراوانی ان کی نگاہوں سے اوجھل کر دینے پر تلی ہوئی تھی۔

اندرونی اصلاح کا کام تبلیغ و ہدایت سے ہی انجام پا سکتا تھا اور اس کی صلاحیت امیرالمومنینؑ کے برابر کسی میں نہیں تھی۔ آپ امت کے بہترین خطیب اور عدیم النظیر

مقرر تھے۔ آپ کے خطبات آج بھی مدون شکل میں موجود ہیں اور ان سے آپ کی تبلیغی صلاحیتوں کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

اس حقیقت سے انکار محال ہے کہ اسلام پر یونانی اور عجمی فلسفہ کے زبردست اثرات مرتب ہوئے، ان غیر اسلامی افکار کے نتیجہ میں مسلمانوں میں متعدد فرقے وجود میں آئے جن میں سے بیشتر اب ختم ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کے موجودہ فرقوں کے عقائد میں بھی ان عجمی و یونانی افکار کا اثر صاف جھلکتا ہے۔ مسلمانوں کے عقائد، ان کی تفاسیر، ان کے علوم اور ان کی تصانیف میں ان افکار باطلہ کا بڑا ذخیرہ شامل ہے۔

عہد حاضر کے مفکرین اسلام بھی اس حقیقت کو تسلیم کر رہے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے اس بے پروائی اور علم کی جانب سے اس چشم پوشی کا جو دور فتوحات میں برتی جا رہی تھی مسلمان ملک تو فتح کرتے رہے لیکن ان کی سطح ذہنی میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا، ان کا علمی و تمدنی معیار بلند کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی اور ان علوم اسلامیہ کو مدون و منضبط کرنے پر کوئی توجہ نہیں کی گئی جو عجمی و یونانی افکار کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ نتیجہ میں مسلمان ذہنی حیثیت سے پیچھے رہ گئے اور مفتوحہ علاقوں کے جاہلی و غیر اسلامی افکار کا شکار ہو گئے۔ امیرالمومنینؑ کی دور رس نگاہیں یہ تماشا دیکھ رہی تھیں، چنانچہ آپ نے اس دور میں جسے آپ کی سیاسی خاموشی کا دور کہا جاتا ہے معارف اسلامی کی اشاعت کا دور قرار دیا اور آپ کی اسی کاوش علمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آل رسولؐ سے علم دین کی تعلیم حاصل کرنے والے ہمیشہ غیر اسلامی افکار و تصورات کے اثر سے آزاد رہے۔ چنانچہ آج ہم پورے فخر کے ساتھ یہ اعلان کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں میں صرف فرقہ شیعہ اثنا عشری ہی وہ فرقہ ہے جس کے عقائد و افکار پر کبھی غیر اسلامی افکار کا اثر غالب نہیں ہوا اور یہ فرقہ ہمیشہ اسلام کے پاکیزہ اور اصلی روپ پر قائم رہا جو سرور کائناتؐ نے دنیا کے سامنے پیش فرمایا تھا۔

سیاسی خلفشار

مدینہ اسلامی دنیا کے قلب کی حیثیت رکھتا تھا اور اسلامی تاریخ میں اس شہر کی اہمیت ناقابل انکار تھی۔ اسلامی سلطنت کے دارالخلافہ ہونے کے علاوہ یہی وہ شہر تھا جہاں کے لوگوں نے لسانِ رسالت سے تعلیم اسلام حاصل کی تھی۔ یہی وہ شہر تھا جو حدیث اور فقہ کا مرکز تھا۔ اسی شہر میں قرآن پاک کے وہ احکام نازل ہوئے تھے جن پر شریعت اسلامیہ کا انحصار تھا اسی لئے یہ ضروری تھا کہ اس شہر اور اس کے رہنے والوں کی پوری حفاظت کی جاتی اور اسے تحریک اسلامی کا سب سے بڑا مرکز بلکہ اس کا گہوارہ باقی رکھا جاتا لیکن پیغمبر اسلامؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی حکومت کے سوال پر مسلمانوں میں پھوٹ پڑی قریش نے سرکار رسالتؐ سے اپنی قرابت کا نعرہ بلند کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ انصار پس پشت ڈال دیئے گئے اور سعد بن عبادہ نے نئی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو وہ کسی "جن کے ہاتھوں" موت کے گھاٹ اتر گئے۔ تاریخ اسلام میں یہ پہلے دعویدار سلطنت تھے جن کو موت کا شکار ہونا پڑا۔ اس سے انصار پر دہشت طاری ہو گئی اور وہ ہمیشہ کے لئے اسلامی سلطنت کے دعوے سے دست بردار ہو گئے۔ لیکن انصار کی یہ روش راضی خوشی کا سودا نہیں تھی بلکہ یہ نتیجہ تھا اس سیاسی شکست کا جو ان کو قریش کے ہاتھوں اٹھانا پڑی تھی اور جس کے نتیجہ میں ان کو حکومت کے ساتھ ہی سعد بن عبادہ کی زندگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ انصار پر مکمل بزدلی طاری ہو جانا اور ان کا اسلامی سیاست سے کنارہ کش ہو جانا مدینہ کی زندگی پر کوئی اچھا اثر مرتب نہیں کر سکتا تھا اس لئے کہ مدینہ کی اکثریت بہرحال انصار پر مشتمل تھی اور اس اکثریت کا اسلامی دنیا

کے تمام مسائل سے بے تعلق ہو جانا جو خراب اثرات پیدا کر سکتا تھا وہ سیاسی بصیرت رکھنے والے کسی فرد سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ پھر انصار نے یہ تماشا بھی دیکھا کہ مال غنیمت کی تقسیم میں نیز بیت المال سے تقسیم ہونے والے اموال میں بھی ان سے امتیازی سلوک برتا جاتا ہے چنانچہ خلیفہ دوم نے مہاجرین قریش کا وظیفہ انصار سے زیادہ مقرر فرمایا تھا۔ ان سب واقعات نے انصار کو حد درجہ بددل کر دیا اور وہ طبقہ جس نے پیغمبر اسلامؐ کو ان کی روحانی تحریک کو کامیاب بنانے میں سب سے زیادہ مدد دی تھی۔ سیاسی اور علمی دونوں میں ایک عضو مفلوج نظر آنے لگا۔ بظاہر یہ معمولی سی بات تھی لیکن بالآخر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدینہ کی مرکزی حیثیت ختم ہو گئی اور اقتدار حکومت مہاجرین قریش کے ہاتھوں سے نکل کر اسلام کے دشمن بنی امیہ کے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا۔ وہ مہاجرین قریش جو دنیائے اسلام کے تاج بخش بنے ہوئے تھے دولت اور حکومت کے باب میں کتنے ہی آگے کیوں نہ سہی لیکن دینی جوش اور مذہبی جذبہ میں انصار سے بہت کم تھے جس کا ثبوت خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے دور کے غزوات و سریات سے مل سکتا ہے جن میں اپنی جانیں دے کر اسلام کو کامران و منصور کرنے کا سہرا ہمیشہ انصار کے سر رہا اور مہاجرین نے بار بار فرار کے ایسے دردناک مظاہرے پیش کیے جن پر آج تک ہمارا سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔ پھر بنی امیہ ان کے رشتہ دار تھے اس لئے اگر اسلامی حکومت بنی امیہ کے ہاتھوں میں جا رہی تھی تو ان کو اس ہولناک سیاسی و مذہبی تبدیلی کی مخالفت کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ انصار البتہ اس صورت حال کی مخالفت کر سکتے تھے۔ وہ بدر و احد و خندق وغیرہ میں بنی امیہ کے مقابلہ میں تلوار کھینچ چکے تھے اور اس گروہ کی اسلام دشمنی کا خوب تجربہ رکھتے تھے ایسی حالت میں وہ مدینہ کی سیاسی اور علمی حیثیت کو بچانے کے لئے میدان میں ضرور آ سکتے تھے لیکن ان کو کچلا جا چکا تھا۔ مفلوج بنایا جا چکا تھا۔ اسلامی مسائل سے بے دخل کیا جا چکا تھا۔ چنانچہ وہ بھی

چپ رہے اور نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا مرکز مدینہ سے دمشق منتقل ہوا اور وہاں سے بغداد منتقل ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے اسلام کے جاننے والے مدینہ میں تھے لیکن ان کی سرپرستی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ کسمپرسی کا شکار ہو گئے اور اسلام ان عقائد و افکار کا نام بن گیا جو دمشق اور بغداد کے حکمرانوں کو پسند تھے۔ ان حکمرانوں کی مصلحت ہوئی تو مسلمانوں نے مسئلہ جبر و قدر کو مان لیا اور ان کی خواہش ہوئی تو خلق قرآن کا عقیدہ رائج کر دیا گیا۔ غرض اسلام مدینہ سے نکل کر سلاطین کا کھلونا بن گیا۔ لسان رسالت سے تعلیم پانے والے افراد مدینہ کا چونکہ عوام پر کوئی اثر نہیں رہا تھا اس لئے دمشق اور بغداد سے اٹھتی ہوئی ہر صدا امین دین مان لی گئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام بعد میں یونانی و عجمی فلسفہ اور اسرائیلی خرافات کا نام بن گیا۔ یہ نتیجہ تھا سقیفۂ بنی ساعدہ کے فیصلہ حکومت کا۔ انصار کے پس پشت ڈال دیئے جانے کا اور اسلامی سیاست پر ان مہاجرین قریش کے حاوی ہو جانے کا جو سیاسی جوڑ توڑ میں باکمال سہی لیکن اپنی بزدلی حکومت پرستی اور زر طلبی کے لحاظ سے ہرگز اس قابل نہیں تھے کہ اسلام کی عنان اقتدار ان کے ہاتھوں میں سونپ دی جائے۔ سعد بن عبادہ کے "جن کے ہاتھوں" قتل ہونے سے انصار کی کمر تو ضرور ٹوٹ گئی لیکن دنیائے اسلام میں سیاسی خونریزیوں (Political Murders) کا دروازہ بھی کھل گیا۔ چنانچہ قریش نے جو بویا تھا وہی کاٹا اور چند ہی سال کے اندر قریش کے دوست یعنی حضرت عمر اور حضرت عثمان تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے اور ایک ایسی قبیح رسم کا آغاز ہو گیا جس کے نتیجہ میں اسلام کی تیرہ سو سال کی تاریخ قتل و خون کی ایک بھیانک داستان بن گئی۔ رسول اللہؐ کے انتقال کے بعد دنیائے اسلام کی نئی سیاست کا یہ پہلا رخ تھا جو امیرالمومنینؑ کے سامنے آیا لیکن ابھی بہت سی سیاسی کروٹیں باقی تھیں اور امیرالمومنینؑ ان سب کا ایک ساتھ تدارک کرنا چاہتے تھے چنانچہ سقیفہ بنی ساعدہ کے

فیصلہ پر احتجاج کر لینے کے بعد آپ خاموش ہو گئے اور ان حالات کا مطالعہ کرنے لگے جو اس فیصلہ خلافت کے نتیجہ میں دنیائے اسلام میں پیدا ہونے والے تھے۔

جمہوری فیصلہ

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آنکھ بند ہوتے ہی سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کے قبیلے بنی اوس اور بنی خزرج اس مقصد سے جمع ہوئے کہ آئندہ حکمران کا فیصلہ کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی تجہیز و تکفین چھوڑ کر انصار کا اس طرح خاموشی سے مدینہ سے نکل جانا اور دوسرے مسلمانوں کو خبر کئے بغیر مملکت اسلامیہ کے مستقبل کا فیصلہ کرنا اس امر کا ثبوت ہے کہ انصار کو مہاجرین پر کوئی اعتماد نہیں تھا اور ان کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر حکومت مہاجرین کے ہاتھوں میں آ گئی تو ان سے انصاف نہیں برتا جائے گا۔ انصار یہ جانتے تھے کہ اسلام کو جو کچھ عروج حاصل ہے وہ ان کی جانفشانیوں کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے اسلام کے لئے زبردست قربانیاں دی تھیں۔ مہاجرین کو نہ صرف یہ کہ پناہ دی تھی بلکہ برسوں ان کے آذوقہ تک کا بندوبست کیا تھا۔ خود بھوکے رہ کر قریش کو پالا تھا لیکن وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ مہاجرین کا یہ طبقہ قطعاً "خود غرض اور مطلب پرست ہے۔ اس کے دل میں انصار کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ اسلام قبول کر لینے کے باوجود اپنی قبائلی عصبیت میں اتنا غرق ہے کہ انصار سے مساوانہ سلوک کرنے پر تیار نہیں ہے۔ وہ میدان جہاد سے تو گریز پائی اختیار کرتا ہے لیکن مال غنیمت کی تقسیم کے وقت آن موجود ہوتا ہے۔ اسے اسلام سے زیادہ اپنا قبائلی اقتدار عزیز ہے اور وہ ہر موقع پر یہ چاہتا ہے کہ جوڑ توڑ سے کام لے کر دنیائے اسلام کی قیادت اور حکومت اپنے ہاتھوں میں رکھے۔ وہ حصول اقتدار کی مہم میں پیغمبر اسلامؐ کی مخالفت کرنے سے بھی نہیں چوکتا ہے اور نبیؐ کو قدم قدم پر ذہنی اذیت میں مبتلا کرتا رہتا ہے اس نے میدان

غدیر کا الٰہی فیصلہ بھی قبول نہیں کیا ہے اور اس حکومت پر قبضہ کرنے کی سازشوں میں مصروف ہے جس کی تعمیر و تشکیل میں اس کا بہت ہی کم حصہ ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ انصار کے دل مہاجرین کی جانب سے صاف نہیں تھے اور وہ قریش پر کوئی اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں ان کا اجتماع ان کے اسی جذبہ کی پوری غمازی کرتا ہے۔

انصار کی پہلی بدقسمتی تو یہ ظاہر ہوئی کہ ان کے اس اجتماع کی خبر حضرت عمر کو ہو گئی اور وہ حضرت ابوبکر کو ساتھ لے کر سقیفہ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں ابوعبیدہ جراح مل گئے تو ان کو بھی ساتھ لے لیا گیا۔ چنانچہ قریش کے طرف یہی تین آدمی تھے جو سقیفہ پہنچے۔ اور انہوں نے پہنچتے ہی انصار کی بازی الٹ دینے کا بندوبست کر دیا۔ انصار کی دوسری بدقسمتی یہ تھی کہ ان میں خود بھی اتحاد نہیں تھا۔ بنی خزرج نے سعد بن عبادہ کو خلافت کے لئے نامزد کیا تھا اور بنی اوس کے دلوں میں اس تجویز سے حسد کی چنگاریاں بھڑک اٹھی تھیں۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔ بنی اوس کو خوب بھڑکا دیا گیا اور پھر یہ دلیل پیش کر کے کہ:

"حکومت رسول اللہ کی تھی اس لئے اس کے وارث ان کے اعزہ ہی ہو سکتے ہیں۔"

سعد بن عبادہ کے حق حکمرانی سے انکار کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ حضرت عمر نے سعد بن عبادہ پر تلوار کا وار بھی کر دیا جس سے حاضرین پر سناٹا چھا گیا۔ بنی خزرج سہم گئے۔ انصار دہشت زدہ ہو گئے اور جب نوبت یہاں تک پہنچا دی گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی

"وراثت"

کا سوال اٹھا کر حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی۔ بنی اوس کو چونکہ بنی خزرج

کے اقتدار کے خلاف شدید حسد پیدا کرایا جا چکا تھا اس لئے انھوں نے بھی "وراثت" کے اصول کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی اور اس طرح سقیفہ کا وہ مایہ ناز الیکشن ختم ہو گیا جس کی اساس پر آج اسلام کو دنیا کا سب سے بڑا جمہوری مذہب قرار دیا جاتا ہے۔

اس الیکشن کے سلسلہ میں جو امور خاص طور پر قابل لحاظ ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ جس وقت یہ الیکشن ہوا اس وقت حجاز، یمن، نجران، عمان، حضرموت، خیبر اور تبوک وغیرہ کے سارے علاقے مسلمان ہو چکے تھے، سیکڑوں قبائل دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ ان میں سے سقیفہ بنی ساعدہ میں مدینہ کے صرف دو انصاری قبائل کے چند افراد اور تین قریش حاضر تھے جن کی حاضری میں خلیفہ کا تقرر عمل میں آیا۔ ایسی حالت میں اسے دنیائے اسلام کا "انتخاب" قرار دینا قطعاً مہمل سی بات ہے۔

۲۔ ان چند حاضرین میں سے بھی جن پر اس الیکشن کا مدار رکھا جاتا ہے بنی خزرج اس انتخاب کے مخالف تھے۔

۳۔ مخالف امیدوار پر تلوار چلا کے حاضرین کو دہشت زدہ کر دیا گیا۔ ایسی حالت میں اسے آزادانہ انتخاب کہنا غلط ہے بلکہ یہ نتیجہ ہے اس دہشت زدگی کا جو تیغ آزمائی کے ذریعہ پیدا کر دی گئی تھی۔

۴۔ اسلام کے دو قبیلوں میں پھوٹ ڈلوا دی گئی اور اس طرح سازش کی مدد سے کام نکالا گیا جو ایک اچھے انتخاب کی شان نہیں ہو سکتی۔

۵۔ دلیل یہ تراشی گئی کہ حکومت رسول اللہ صلی علیہ والہ وسلم کی املاک تھی اس لئے ان کے ورثاء کو ملنا چاہیے اور "وراثت" کا فیصلہ یہ ہوا کہ اولاد کے بجائے

خسر کو وارث ہونا چاہیے۔

۶۔ اس دلیل کا مقصد یہ ہوا کہ رسولؐ کے گھرانے کے علاوہ اسلامی دنیا پر کبھی کوئی دوسرا شخص حکمران نہیں ہو سکتا۔ یہیں سے اس جمہوریت کا خاتمہ کر دیا گیا جس پر مسلمان بڑا ناز کرتے ہیں اس لئے کہ حق حکمرانی جمہور اسلام کو نہیں دیا گیا بلکہ صرف قبیلہ قریش کو عطا کر دیا گیا۔

۷۔ مدینہ کے علاوہ اسلامی دنیا کے کسی حصہ کے افراد کو الیکشن میں حصہ لینے کا حق عطا نہیں کیا گیا۔ گویا ووٹ کا حق بھی صرف مدینہ تک محدود کر دیا گیا۔

سقیفہ بنی ساعدہ سے واپسی پر مدینہ والوں کے سامنے اس "جمہوری فیصلہ" کا اعلان کر دیا گیا اور ان کی بیعت کی دعوت دی گئی۔

مہاجرین نے اس لئے بیعت کر لی کہ وہ ابھی ابھی انصار کے افتراق باہمی کا نتیجہ دیکھ چکے تھے اور یہ جانتے تھے کہ اگر ان میں ذرا بھی پھوٹ پڑی تو حکومت انصار کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔ پھر حکومت انہیں کے ایک فرد کے ہاتھوں میں آئی تھی اور یہ شخص ایسا تھا کہ جو قریش کے اجتماعی مفادات کی تکمیل میں پوری طرح معاون ہو سکتا تھا۔ ایسی حالت میں مہاجرین کی جانب سے کسی اختلاف کا اندیشہ نہیں ہو سکتا تھا۔

انصار میں بنی اوس نے تو بنی خزرج کے حسد میں بیعت کر لی تھی' رہ گئے تھے بنی خزرج تو ان کو مظاہرہ شمشیر سے حضرت عمر نے دہشت زدہ کر دیا تھا۔ اس لئے اب ان کی جانب سے بھی مخالفت کا امکان نہیں تھا۔ سعد بن عبادہ نے البتہ بیعت سے انکار کیا تو ان کو کسی نامعلوم "جن" نے قتل کر دیا! اس طرح راہ کا یہ کانٹا بھی دور ہو گیا۔

امیر المومنینؑ کے لئے یہ وقت نہایت نازک تھا اس لئے کہ امت ایک غلط فیصلہ کا ارتکاب کر رہی تھی اور کی دوررس نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ اس فیصلہ کے نتیجہ میں مسلمانوں کو بڑے روز بد کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آپ یہ سمجھ رہے تھے کہ:۔

۱۔ اگر آج امت کے چند افراد کو حق حاصل ہو گیا کہ وہ خلافت کے سے اہم دینی امر کا فیصلہ خود اپنی رائے کر لے تو کل افراد امت کو یہ بھی حق حاصل ہو گا کہ وہ قرآن کی جو چاہیں تغیر کریں فقہ میں جو چاہیں مسائل وضع کر لیں' شریعت کو جس طرف چاہیں موڑ دیں' عقائد میں جو چاہیں ترمیمات کر دیں' عبادات میں جو چاہیں انداز اختیار کر لیں۔ غرض یہ کہ دین کا وہ سارا ضابطہ جو سرکار دوعالم نے مقرر فرمایا تھا افراد امت کی مرضی کا شکار ہو جائے گا اور ملت اسلامیہ سیکڑوں فرقوں میں بٹ جائے گی۔

۲۔ اگر آج مدینہ کے چند آدمی جوڑ توڑ' سازش اور دہشت انگیزی کے نتیجہ میں اپنی مرضی کا خلیفہ مقرر کر سکتے ہیں تو کل جس کا جی چاہے گا وہ انہیں حربوں کو استعمال کر کے خلافت پر قبضہ کر سکے گا اور اس طرح خلافت جو دین اور شریعت کا ایک اہم جزو تھی۔ تخت و تاج کے پروانوں کی باہمی کشمکش کا شکار ہو جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ خلافت کے نام پر مسلمانوں میں دائمی خانہ جنگی جاری رہے گی جس کا خاتمہ اسی وقت ہو گا جب مسلمان تنگ آ کر خود خلافت کے تصور ہی کو ختم کر دیں گے۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ مسلمانوں میں صدیوں خلافت کے نام پر جنگ جاری رہی اور آخر تنگ آ کر مسلمانوں نے ۱۹۲۳ء میں خلافت ہی کا خاتمہ کر دیا۔

۳۔ خلافت کا فیصلہ کسی اصول کی بنیاد پر نہیں ہوا تھا' سقیفہ میں جو کچھ ہوا تھا اسے نہ انتخاب کہا جا سکتا ہے اور نہ وراثت۔ وراثت اس لئے نہیں کہ رسول اللہؐ کی وراثت کسی قاعدہ سے حضرت ابو بکر کو نہیں پہنچتی اور الیکشن اس لئے نہیں کہ انصار کے مقابلہ میں قصہ چھیڑ کر حضرت عمر نے حضرت ابو بکر کی بیعت کا اعلان کر دیا تھا جو کسی حالت میں جمہوری انتخاب نہیں کہا جا سکتا۔ خلافت کے سلسلہ میں

یہ پہلی بے اصولی بعد میں ہر بے اصولی کو جائز قرار دینے کی دلیل بنی۔ چنانچہ مسلمان اس حد پر پہنچ گئے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول مذہب میں داخل کر لیا گیا اور قہر و غلبہ کو دلیل خلافت مان لیا گیا۔

۳۔ مسلمانوں نے غدیر کے الٰہی اور رسالت پناہی فیصلہ کے خلاف بغاوت کی اور اس طرح پیغمبرؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی مسلمانوں میں دین کے خلاف "اللہ اور رسولؐ کے خلاف بغاوت کی عادت پیدا ہو گئی۔ بظاہر صرف ایک حکم کی مخالفت کی گئی لیکن جب احکام رسالت کی مخالفت کا مادہ قوم میں پیدا کر دیا گیا تو یہ ایک ہی بات تک محدود رہنے والا نہیں تھا۔ اس ننھے سے پودے نے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ پیغمبر اسلامؐ کے انتقال کو ایک صدی بھی نہیں گزرنے پائی کہ مسلمانوں کے دارالامارہ شاہی میں شراب پانی کی طرح بہنے لگی، ناچ رنگ کی محفلیں آراستہ ہو گئیں اور مملکت اسلامیہ میں کھلم کھلا خدا اور رسولؐ کے احکام کی خلاف ورزی کی جانے لگی۔

امیرالمومنینؑ یہ سب کچھ سمجھ رہے تھے۔ مستقبل آپ کے سامنے آئینہ کے مانند موجود تھا۔ اس فیصلہ کے نتائج سے آپ بخوبی واقف تھے اس لئے آپ نے ملت اسلامیہ کے سامنے جو حق تھا اسے پیش کر دیا۔ دربار خلافت میں آپ نے بغیر کسی خوف اور جھجک کے احقاق حق فرمایا اور ایسے محکم دلائل پیش فرمائے کہ بشیر بن سعد انصاری جن کے سہارے سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکر کو خلافت حاصل ہوئی تھی۔ خود پکار اٹھے کہ:

"اگر ہمیں پہلے یہ باتیں معلوم ہو گئی ہوتیں تو ہم آپ ہی کو اپنا امیر منتخب کرتے لیکن اب کیا کریں، جو ہونا تھا وہ ہو گیا"۔

یہی امیرالمومنینؑ کی جیت تھی، آپ کے جواب میں دربار خلافت کی جانب سے

کوئی دلیل پیش نہیں کی جا سکی۔ خلافت کے ستون اعظم بشیر انصاری نے آپ کے حق کا کھلے الفاظ میں اعتراف کر لیا اور عامۃ المسلمین پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جو کچھ ہوا ہے وہ غلط ہوا ہے۔ اس سے زیادہ امیر المومنینؑ کو کچھ اور درکار بھی نہیں تھا۔ آپ بادشاہت کے تمنائی بھی نہیں تھے جو اس موقع پر شمشیر بکف ہو جاتے۔ آپ تحریک اسلامی کے قائد تھے اور آپ کو اسلام کا مفاد دیکھنا تھا۔ خانہ جنگی اسلام کے مفاد کے خلاف تھی اس لئے آپ نے وہ رخ اختیار فرمایا جو اسلام کے لئے مفید تھا اور اس سیاست علویہ سے قوم کو جو فائدے پہنچے ان کا ذکر ہم سابقہ ابواب میں کر چکے ہیں۔

☆═══☆☆═══☆

اقتصادی پہلو

تاریخ کی تشکیل میں سیاست کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے لیکن خود سیاست کی تشکیل میں معاشی اور اقتصادی حالات کا بہت بڑا حصہ ہوا کرتا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ کے سلسلہ میں معاملہ کے اس پہلو کو ہمیشہ نظرانداز کیا جاتا رہا اور یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ کو سمجھنے میں زیادہ تر غلطیاں کی جاتی رہی ہیں۔

قریش کا غدیر کے فیصلہ سے انحراف زیادہ تر مندرجہ ذیل وجوہ پر مبنی بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ قریش کے بہت سے سردار امیرالمومنینؑ کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے اس لئے قریش امیرالمومنینؑ کے خلاف تھے۔

۲۔ امیرالمومنینؑ قبیلہ بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے۔

۳۔ امیرالمومنینؑ کی فتوحات اور خدمات جلیلہ کے نتیجہ میں لوگ آپ سے حسد کرنے لگے تھے۔

۴۔ لوگ دنیا کی جانب مائل ہو گئے تھے۔

میں یہ عرض نہیں کرتا کہ یہ اسباب سراسر غلط ہیں' بے شک ان میں کافی حد تک صداقت ہے لیکن محض ان اسباب کی بنا پر امیرالمومنینؑ کا خلافت سے محروم کردیا جانا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ:۔

۱۔ چند قرشی کافروں کا امیرالمومنینؑ کے ہاتھوں قتل ہونا زیادہ سے زیادہ ان کے قریبی رشتہ داروں کو امیرالمومنینؑ کا مخالف بنا سکتا تھا۔ قریش کی بڑی اکثریت کا اس بنیاد

پر آپ کا مخالف ہو جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

۲۔ آپ کا بنی ہاشم سے ہونا بھی آپ کی مخالفت کی وجہ نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ایسی حالت میں صرف بنی امیہ آپ کے مخالف ہو سکتے تھے جو بنی ہاشم کے دشمن تھے دوسرے قبائل قریش کا اس بنیاد پر آپ کا مخالف ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا پھر مزہ کی بات تو یہ ہے کہ خلافت بنی تیم کے ایک فرد کو ملی تھی اور خلافت دلانے والے بزرگ بنی عدی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان قبائل کی بنی ہاشم سے کوئی دشمنی نہیں تھی، رہے بنی امیہ تو ان کو اس انتخاب خلافت سے ابتدائی طور پر کوئی دلچسپی نہیں تھی جس کا ثبوت ابوسفیان کی وہ گفتگو ہے جو اس نے امیرالمومنینؑ سے کی تھی اور جس میں اس نے صاف طور پر بنی تیم کے ایک فرد کے خلیفہ مقرر ہو جانے پر اظہار ناپسندیدگی کیا تھا۔ ایسی حالت میں آپ کا بنی ہاشم سے ہونا قوم کے اس فیصلہ پر اثر انداز ہوتا نظر نہیں آتا، اس لئے کہ جن لوگوں کو بنی ہاشم سے سخت دشمنی تھی یعنی بنی امیہ ان کا اس فیصلہ کے وجود میں آنے میں کوئی حصہ نہیں تھا اور وہ اس فیصلہ کو پسند بھی نہیں کرتے تھے۔

تیسری وجہ البتہ کافی حد تک صحیح ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے ایک طبقہ میں امیرالمومنینؑ کے خلاف حسد کے جذبات موجود تھے لیکن یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ اس مرض میں صرف چند ہی افراد مبتلا ہو سکتے تھے۔ قوم کے بڑے طبقہ کا حسد میں مبتلا ہو جانا درست نہیں کہا جا سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ خلافت کے باب میں قریش کا جو فیصلہ تھا اس میں بڑی حد تک اقتصادی عوامل کارفرما تھے۔ قریش پیشہ کے اعتبار سے تاجر تھے چنانچہ قدیمی عربی زبان میں قریش کے معنی ہی تاجر کے تھے۔ یہ طبقہ نہ صرف یہ کہ اندرون ملک کی تجارت پر حاوی تھا بلکہ غیر ملکی تجارت میں بھی پیش پیش تھا۔ چنانچہ زمانہ قبل اسلام میں بھی قریش کے تجارتی قافلے غیر ممالک میں جایا کرتے تھے اور ان کی غیر ملکی تجارت اتنے اعلیٰ پیمانہ

کی تھی کہ غیر ملکی حکومتیں تک ان کا احترام کرتی تھیں۔ قیصر اور نجاشی تک سے ان کے تعلقات تھے اور ان کی اس بین الاقوامی حیثیت کا سارا انحصار ان کی تجارتی ترقی پر تھا۔

تاجروں کا مفاد ظاہر ہے کہ نفع اندوزی میں ہوتا ہے۔ ان کو اپنے مال کے لئے منڈیاں درکار ہوتی ہیں اور اس مال کی قیمت دگنی' چوگنی بلکہ موقع ملے تو سوگنی بھی درکار ہوتی ہے۔ یہ تاجر کی فطرت ہے اور قریش اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی حیات طیبہ میں اسلامی حکومت کے قیام اور عرب قوم کی ابھرتی ہوئی طاقتوں نے اس تاجر طبقہ کے لئے حصول منفعت کی بہت سی راہیں کھول دی تھیں اور وہ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ یہ طبقہ اس حقیقت سے بکماحقہ واقف تھا کہ حکومت حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں میں آگئی تو اسے ناجائز نفع اندوزی اور معاشی استحصال کے وہ مواقع ہرگز حاصل نہیں ہو سکتے جن کے وہ دور رسالت میں خواب دیکھتا رہا تھا۔ اس لئے لازمی طور پر اسے ایک ایسے حکمران کی ضرورت تھی جو اس کے معاشی مفادات کی تکمیل کر سکے جس کی حکومت میں اسے حصول دولت کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہو سکیں' جو اسے اپنے مال کی کھپت کے لئے زیادہ سے زیادہ منڈیاں دے سکے اور جو ایسی صورتیں پیدا کر سکے جن میں اس کے مال کی قیمتیں دگنی چوگنی ہو جائیں۔ یہ مقصد تبھی پورا ہو سکتا تھا جب حکومت ایسے افراد کے ہاتھوں میں آئے جو اس تاجر طبقہ کے مفادات پورے کر سکیں۔ چنانچہ جب قریش نے دیکھا کہ تخت خلافت پر ایک ایسا شخص متمکن ہو رہا ہے جو اسی تاجر طبقہ کا ایک فرد ہے تو وہ اس حکمران کے ساتھ ہو گئے اور اس حکومت کی تائید پر متفق ہو گئے جو قریش تاجروں کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہو سکتی تھی۔

اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ اس حکومت سے قریش نے جو امیدیں وابستہ کی تھیں وہ پوری ہوئیں' وہی لوگ جو دانہ دانہ کو محتاج تھے چند ہی سال میں کروڑ

پتی بن گئے۔ طلحہ، زبیر، سعد بن وقاص، عبدالرحمٰن بن عوف اور دوسرے ارکان سلطنت نے اتنی دولت جمع کی جس کا جواب طلسم ہوشربا کی داستانوں میں ہی مل سکتا ہے۔ جھونپڑوں میں رہنے والے محلات و قصور کے مالک بن گئے۔ لوگ ورثہ میں اتنا سونا چھوڑنے لگے جو کلہاڑوں سے کاٹ کر ورثاء میں تقسیم ہوتا تھا اور قریش کے گھروں پر ہن برسنے لگا۔ یہ نتیجہ تھا جنگ کے اس لامتناہی سلسلہ کا جو غیر ممالک کے خلاف جاری کر دیا گیا تھا۔ ان جنگوں کے نتیجہ میں منہگائی بڑھ گئی۔ مال کی قیمتیں چڑھ گئیں۔ ممالک فتح ہوئے تو سرداران قریش کو بڑی بڑی جاگیریں مل گئیں۔ جگہ جگہ عربوں کی نو آبادیات قائم ہو گئیں، زرخیز علاقوں کی دولت حجاز میں آنا شروع ہو گئی۔ مفتوحہ ممالک کی شکل میں قریش تاجروں کو نئی اور اچھی منڈیاں حاصل ہو گئیں۔ شام، عراق اور مصر کے بازاروں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ فوجی تسلط کے نتیجہ میں ان کو غیر ملکی مقابلہ سے نجات مل گئی۔ غرض یہ کہ نفع اندوزی کے ہزاروں دروازے کھل گئے اور عربوں نے اس کے نتیجہ میں اتنی دولت کمائی جس کی نظیر ان کی تاریخ میں ملنا محال ہے۔

عربوں نے جنگ اور فتوحات سے وہی فائدہ اٹھایا جو ہر شہنشاہیت پسند (Imperialist) قوم اپنی فتوحات ملکی سے اٹھایا کرتی ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ عراق، مصر اور شام کی دولت پر قبضہ کر لیا بلکہ ان ممالک کو مستقل طور پر اپنی نو آبادیوں میں تبدیل کر دیا۔ ان کی زبان، تہذیب اور رہن سہن کے طریقے تک بدل ڈالے اور ان کو پورے طور پر عرب ملکوں میں تبدیل کر دیا۔ ایران میں یہ صورت تو نہیں ہو سکی لیکن پھر بھی ایرانی زبان اور تہذیب پر عربوں نے جو نقوش چھوڑے وہ ایرانیوں کی شدید قومی عصبیت کے باوجود آج تک محو نہیں ہو سکے ہیں۔

دولت اور حکومت پر قبضہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عرب اپنے آپ کو حکمران قوم تصور کرنے لگے اور جن ممالک پر انہوں نے قبضہ کیا تھا ان کو اسلام قبول کر لینے کے

کی تھی کہ غیر ملکی حکومتیں تک ان کا احترام کرتی تھیں۔ قیصر اور نجاشی تک سے ان کے تعلقات تھے اور ان کی اس بین الاقوامی حیثیت کا سارا انحصار ان کی تجارتی ترقی پر تھا۔

تاجروں کا مفاد ظاہر ہے کہ نفع اندوزی میں ہوتا ہے۔ ان کو اپنے مال کے لئے منڈیاں درکار ہوتی ہیں اور اس مال کی قیمت دگنی، چوگنی بلکہ موقع ملے تو سوگنی بھی درکار ہوتی ہے۔ یہ تاجر کی فطرت ہے اور قریش اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی حیات طیبہ میں اسلامی حکومت کے قیام اور عرب قوم کی ابھرتی ہوئی طاقتوں نے اس تاجر طبقہ کے لئے حصول منفعت کی بہت سی راہیں کھول دی تھیں اور وہ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ یہ طبقہ اس حقیقت سے بکماحقہ واقف تھا کہ حکومت حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں میں آگئی تو اسے ناجائز نفع اندوزی اور معاشی استحصال کے وہ مواقع ہرگز حاصل نہیں ہو سکتے جن کے وہ دور رسالت میں خواب دیکھتا رہا تھا۔ اس لئے لازمی طور پر اسے ایک ایسے حکمران کی ضرورت تھی جو اس کے معاشی مفادات کی تکمیل کر سکے جس کی حکومت میں اسے حصول دولت کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہو سکیں، جو اسے اپنے مال کی کھپت کے لئے زیادہ سے زیادہ منڈیاں دے سکے اور جو ایسی صورتیں پیدا کر سکے جن میں اس کے مال کی قیمتیں دگنی چوگنی ہو جائیں۔ یہ مقصد تبھی پورا ہو سکتا تھا جب حکومت ایسے افراد کے ہاتھوں میں آئے جو اس تاجر طبقہ کے مفادات پورے کر سکیں۔ چنانچہ جب قریش نے دیکھا کہ تخت خلافت پر ایک ایسا شخص متمکن ہو رہا ہے جو اسی تاجر طبقہ کا ایک فرد ہے تو وہ اس حکمران کے ساتھ ہو گئے اور اس حکومت کی تائید پر متفق ہو گئے جو قریش تاجروں کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہو سکتی تھی۔

اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ اس حکومت سے قریش نے جو امیدیں وابستہ کی تھیں وہ پوری ہوئیں، وہی لوگ جو دانہ دانہ کو محتاج تھے چند ہی سال میں کروڑ

پتی بن گئے۔ طلحہ' زبیر' سعد بن وقاص' عبدالرحمٰن بن عوف اور دوسرے ارکان سلطنت نے اتنی دولت جمع کی جس کا جواب طلسم ہوشربا کی داستانوں میں ہی مل سکتا ہے۔ جھونپڑوں میں رہنے والے محلات و قصور کے مالک بن گئے۔ لوگ ورثہ میں اتنا سونا چھوڑنے لگے جو کلہاڑوں سے کاٹ کر ورثاء میں تقسیم ہوتا تھا اور قریش کے گھروں پر ہن برسنے لگا۔ یہ نتیجہ تھا جنگ کے اس لامتناہی سلسلہ کا جو غیر ممالک کے خلاف جاری کر دیا گیا تھا۔ ان جنگوں کے نتیجہ میں منگائی بڑھ گئی۔ مال کی قیمتیں چڑھ گئیں۔ ممالک فتح ہوئے تو سرداران قریش کو بڑی بڑی جاگیریں مل گئیں۔ جگہ جگہ عربوں کی نو آبادیات قائم ہو گئیں' زرخیز علاقوں کی دولت حجاز میں آنا شروع ہو گئی۔ مفتوحہ ممالک کی شکل میں قریش تاجروں کو نئی اور اچھی منڈیاں حاصل ہو گئیں۔ شام' عراق اور مصر کے بازاروں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ فوجی تسلط کے نتیجہ میں ان کو غیر ملکی مقابلہ سے نجات مل گئی۔ غرض یہ کہ نفع اندوزی کے ہزاروں دروازے کھل گئے اور عربوں نے اس کے نتیجہ میں اتنی دولت کمائی جس کی نظیر ان کی تاریخ میں ملنا محال ہے۔

عربوں نے جنگ اور فتوحات سے وہی فائدہ اٹھایا جو ہر شہنشاہیت پسند (Imperialist) قوم اپنی فتوحات ملکی سے اٹھایا کرتی ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ عراق' مصر اور شام کی دولت پر قبضہ کر لیا بلکہ ان ممالک کو مستقل طور پر اپنی نو آبادیوں میں تبدیل کر دیا۔ ان کی زبان' تہذیب اور رہن سہن کے طریقے تک بدل ڈالے اور ان کو پورے طور پر عرب ملکوں میں تبدیل کر دیا۔ ایران میں یہ صورت تو نہیں ہو سکی لیکن پھر بھی ایرانی زبان اور تہذیب پر عربوں نے جو نقوش چھوڑے وہ ایرانیوں کی شدید قومی عصبیت کے باوجود آج تک محو نہیں ہو سکے ہیں۔

دولت اور حکومت پر قبضہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عرب اپنے آپ کو حکمران قوم تصور کرنے لگے اور جن ممالک پر انہوں نے قبضہ کیا تھا ان کو اسلام قبول کر لینے کے

باوجود محکوم قوم کا درجہ دیا جانے لگا۔ عجمیوں کو عرب عورتوں سے شادی کی ممانعت کر دی گئی۔ غیر عرب بچوں کو میراث کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ عام عربوں کو قرشی خواتین سے عقد کی ممانعت کر دی گئی۔ حکمران نسل کے افراد کو محکوم قوموں کے افراد سے بیگار لینے کا حق عطا کر دیا گیا اور عبادہ بن صامت نے تو غضب ہی کر دیا کہ خلیفہ دوم کو یہ سمجھا دیا کہ کسی ذمی کے قتل کے بدلہ میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کی تبدیلیوں نے عربوں کی سامراجی ذہنیت میں زبردست اضافہ کر دیا اور اسلامی دنیا حاکم اور محکوم ممالک میں تقسیم ہو گئی۔

آج مسلمانوں کا ایک طبقہ صدر اسلام کے مسلمانوں کی دولت اور خوشحالی پر بڑا فخر کرتا ہے لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس فراوانی دولت کے اندر ہی اس سامراجی اور سرمایہ دارانہ نظام کے مقاصد کے جراثیم بھی پوری قوت کے ساتھ پروان چڑھ رہے تھے۔ سرمایہ کی زیادتی کے پردہ میں ہی سرمائے کی تباہی کے عناصر بھی ابھر رہے تھے اور مدینہ کے حکمران جس غلط راہ پر چل کھڑے ہوئے تھے وہی ان کے زوال اور تباہی کا سبب بننے والی تھی۔ ایران' مصر اور عراق میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ان ممالک کے عوام اس معاشی لوٹ پر غضبناک ہوتے جا رہے تھے اور قرشی حکمرانوں کے خلاف ان کے دلوں میں نفرت کا ایک جذبہ بڑھتا جا رہا تھا جو آخر ایک دن رنگ لا کے رہا اور دنیا نے یہ تماشا دیکھا کہ مدینہ کے جس تاج بخش طبقہ کا اقتدار افغانستان کی سرحدوں سے لے کر افریقہ کے ساحل تک مسلّم تھا وہ پچیس سال سے زیادہ دنیائے اسلام پر حکومت نہ کر سکا اور اسے زوال کا وہ روز بد دیکھنا پڑا کہ اس کے دوبارہ ابھرنے کے امکانات ہی ختم ہو گئے۔

قرشی تاجروں کی سرمایہ پرستانہ لوٹ اسلامی سیاست پر بھی اپنے اثرات ڈالے بغیر نہ رہ سکی چنانچہ حضرت ابوبکر نے یہ دیکھتے ہوئے کہ جنگ آزمائی کی پالیسی نے جہاں

گرانی اور فتوحات کے ذریعہ قریش کے اونچے طبقہ کو مالا مال کر دیا ہے وہیں غریب طبقہ میں شدید بے چینی بھی پیدا کر دی ہے۔ خلافت کے سلسلہ میں انتخاب کا خطرہ مول لینے سے قطعاً" انکار کر دیا اور حضرت عمر کو جو قریش کے تاجرانہ مفاد کی حفاظت کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے اپنا جانشین مقرر کر دیا۔

حضرت ابوبکر یہ جانتے تھے کہ اگر خلافت کو انتخاب پر چھوڑ دیا گیا تو حکومت قریشی تاجروں کے ہاتھوں سے نکل جائے گی' اس لئے کہ جنگ اور گرانی کے نتیجہ میں غریب طبقہ اتنا پریشان ہو چکا ہے کہ وہ کسی حالت میں سرمایہ دار قریشی سرداروں کو حکومت پر قبضہ کر لینے کی اجازت نہیں دے گا بلکہ اس شخص کو خلیفہ بنا دے گا جو عوام کو جنگ' گرانی اور معاشی لوٹ سے نجات دلا کے سکون کی زندگی عطا کر سکے۔ ایسی حالت میں امیرالمومنین" کے خلیفہ منتخب ہو جانے کا "خطرہ" پوری شدت سے پیدا ہو گیا تھا۔ عوام میں آپ کا اثر بڑھتا جا رہا تھا اور سقیفہ بنی ساعدہ کے فیصلہ کے دو سال کے اندر ہی عوام کو من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ کی صحت و اصابت کا یقین پیدا ہونے لگا تھا عام مسلمان یہ سمجھنے لگے تھے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس اعلان کا مقصد حکومت کو اپنے گھرانے میں محدود رکھنا نہیں تھا جیسا کہ قریشی سرداروں نے عوام کو سمجھا رکھا تھا بلکہ اس فرمان رسالت کا مقصد مسلم عوام کی بھلائی تھی۔ مسلم عوام کے اس بڑھتے ہوئے احساس کا اندازہ حکمران طبقہ کو بھی تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ خلافت کے باب میں الیکشن کی بجائے نامزدگی کا اصول اختیار کرنے میں اپنی عافیت تصور کر رہا تھا۔

امیرالمومنین" کی بہت بڑی کامیابی تھی کہ سقیفہ کے فیصلہ کے محض دو سال کے اندر ہی اندر قریشی حکمران انتخاب کرانے یا عوام کے سامنے کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہے ہیں اور انہوں نے اپنی زبان سے نہ سہی اپنے عمل سے یہ تسلیم کر لیا کہ اگر خلافت کے لئے انتخاب کی اجازت دے دی جاتی تو حکومت قریشی تاجروں کے ہاتھوں میں نہ

رہتی علیؑ کے ہاتھوں میں چلی جاتی جو معاشی استحصال کے مخالف اور عوام کی حقیقی خوشحالی کے علمبردار تھے۔

امیرالمومنینؑ کی اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی تھی کہ ابھی ۱۱ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو خلافت کے لئے نامزد کیا تھا تو قریش نے اس نامزدگی کے اصول کو ماننے سے انکار کر دیا تھا اور اس کے بجائے الیکشن کا نعرہ بلند کیا تھا لیکن ۱۳ھ میں ایسا نقشہ بدلا کہ نامزدگی کے اصول کی مخالفت کرنے والے خود اس کے علمبردار بن گئے اور حضرت عمر کی نامزدگی بے چون و چرا قبول کر لی گئی ظاہر ہے کہ مذہبی حیثیت سے حضرت ابوبکر کو رسول اللہؐ پر فضیلت دینے کی کوئی جسارت نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ رسول اللہؐ کو خلافت کے سے شرعی معاملہ میں اپنا جانشین نامزد کرنے کی اس لئے اجازت نہیں دی گئی کہ ان کا فیصلہ غلط اور حضرت ابوبکر کا فیصلہ اس لئے مان لیا گیا کہ وہ صحیح تھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو شریعت نے اپنا جانشین مقرر کرنے کا حق نہیں دیا تھا اور حضرت ابوبکر کو یہ حق بھی حاصل تھا کیونکہ یہ باتیں تو وہی کہہ سکتا ہے جو اسلام کی بنیادوں کو منہدم کر دے اس لئے ہمیں یہی ماننا پڑے گا کہ رسول اللہؐ کا فیصلہ اس لئے نہیں مانا گیا کہ وہ قریش کے تاجرانہ مفاد کے خلاف تھا اور حضرت ابوبکرؓ کے فیصلہ کی اس لئے توثیق کر دی گئی کہ اس سے قرشی سرمایہ داروں کے مفادات وابستہ تھے۔

امیرالمومنین علیہ السلام کی یہ بھی ایک بڑی کامیابی تھی کہ مسلم عوام نے اکابر قریش کی بے اصولی کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور یہ حقیقت ان کے سامنے آ گئی کہ جن لوگوں کو قوم کا ستون اور ملت کا عمود تصور کیا جاتا تھا وہ اتنے بے اصول اور مطلب پرست دوست تھے کہ جس وقت جو بات ان کے مفید مقصد ہوتی تھی وہی کہنا شروع کر دیتے تھے اور عوام کے مفاد کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر موقع پر خود اپنے مفاد کو

پیش نظر رکھتے تھے جس وقت وہ الیکشن کے نام پر حکومت حاصل کر سکتے تھے اس وقت انہوں نے رسولؐ اللہ کے فیصلہ کی بھی پروانہ کی اور جیسے ہی ان کو آزادانہ انتخابات میں اپنے اقتدار کو خطرہ نظر آیا ویسے ہی وہ خود نامزدگی کے دامن میں منہ چھپانے لگے مسلم عوام کے سامنے اس حقیقت کا آجانا امیرالمومنینؑ کی ایک شاندار کامیابی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس اصول خلافت کی کھلی ہوئی فتح تھی جس کا اعلان آپ نے غدیر خم میں فرمایا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ مسلم عوام کے اس احساس کا کوئی عملی نتیجہ تاریخ کے صفحات پر نظر نہیں آتا لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ قیصر اور کسریٰ کی قوتیں اسلامی سرحدوں پر موجود تھیں اور ایسے پر آشوب حالات میں مسلم عوام کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ مسئلہ خلافت پر حکمران طبقہ سے کوئی اختلاف کر کے دشمن کو قوی اور اپنے آپ کو کمزور بنا لیں یہی وجہ ہے کہ عوام نے اس نامزدگی کو خاموشی سے قبول کر لیا اور مسلمانوں کے اتحاد اور مملکت اسلامیہ کے دفاع کی خاطر قرشی تاجروں کی حکومت چند سال تک اور برداشت کرنے پر تیار ہو گئے لیکن مسلم عوام کی اس خاموشی کو خوشی یا ان کی رضامندی تصور کر لینا غلط ہے بے چینی کا مظاہرہ بار بار ہوتا رہا ہے اور اس کا تدارک اس "درۂ فاروقی" سے کیا جاتا رہا ہے جسے خلیفہ وقت کے "جلال و جبروت" کی فخر آفریں نشانی قرار دیا جاتا ہے۔

حضرت خلیفہ دوم کے متعلق یہ عام طور پر مشہور ہے کہ آپ کافی سخت گیر تھے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آپ عوام کے "محبوب رہنما" اور "جمہوری قائد" تھے تو آپ کو قدم قدم پر اپنے "جلال" کے مظاہرہ کرنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوا کرتی تھی؟ جلال اور غضب کا مظاہرہ یا تشدد پر عمل وہیں ہوتا ہے جہاں عوام میں حکمرانوں یا ان کے طرز عمل کے خلاف بے چینی ہوا کرتی ہے۔ عرب کی دنیا بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں

تھی چنانچہ وہاں بھی جو "مظاہرہ جلال و جبروت" ہو رہا تھا اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ مدینہ کے ظاہری سکون کی تہہ میں طوفان کی پرورش ہو رہی تھی عوام بے چین تھے قریش تاجروں کے اقتدار کی مخالفت بڑھتی جا رہی تھی اور حکمران طبقہ اسی بے چینی کو دور کرنے کے لئے اس درۂ فاروقی کا سہارا لے رہا تھا جس پر عقیدت کے مارے مسلمان آج تک فخر کی ٹوپیاں اچھالا کرتے ہیں۔

حضرت عمر کو خلافت مل گئی لیکن ایک ہوشیار سیاستدان کی حیثیت سے ان کو اس چیز کا پورا احساس تھا کہ حکومت کی اساس ہل چکی ہے عوام بے چین ہو رہے ہیں اور قریش کا اقتدار اعلیٰ متزلزل ہو رہا ہے اس لئے انہوں نے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے

۱ قریش کے بڑے بڑے سرداروں اور مسلمانوں کے لمبے لمبے وظیفے مقرر کر دیئے تاکہ ان کے اثرات سے فائدہ اٹھا کے عوام پر قابو رکھا جا سکے۔

۲ جنگ کے سلسلہ کو طول دے دیا تاکہ عوام کی توجہ لڑائیوں پر مبذول ہو جائے اور وہ فتوحات کی خبروں سے خوش ہو کے اپنی معاشی تباہ حالی اور مملکت پر قریشی سرمایہ داروں کی گرفت کو فراموش کر دیں۔

۳ بنی امیہ کو شام کی گورنری دے کر خرید لیا تاکہ عوام پر ان کے سابقہ اثرات سے فائدہ اٹھایا جائے

۴ درۂ فاروقی کی خوب خوب نمائش کی گئی تاکہ عوام دہشت زدہ ہو جائیں اور وہ حکومت کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہ کریں

۵ عربوں میں شدید قومی عصبیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ وہ قریش کے حکمران طبقہ کو اپنے قومی اقتدار کا مظہر تصور کرتے ہوئے اس کی حکومت پر مطمئن ہو جائیں۔

۶ حضرت علی علیہ السلام، امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کے بھی بڑے بڑے وظائف مقرر کر دیئے تاکہ عوام اس غلط فہمی کا شکار ہو جائیں کہ وہ جن لوگوں سے اپنی قیادت اور نجات کی آس لگائے بیٹھے ہیں وہ بھی قریش کی سرکاری مشین کا ایک پرزہ ہیں اور اس طرح عوام اپنے انقلابی رجحانات کے لئے کوئی مناسب قیادت نہ پاتے ہوئے اپنی قسمت پر شاکر ہو جائیں۔

۷ عراق، شام اور مصر وغیرہ میں عرب نو آبادیات قائم کر کے عربوں کی آبادی کو کافی حد تک منتشر کر دیا گیا کوفہ اور بصرہ کے شہر اسی پالیسی کا نتیجہ ہیں

۸ عوام کی علمی اور ذہنی سطح کو پست رکھنے کی تدابیر پر پوری شدت سے عمل کیا گیا چنانچہ کتابت حدیث پر لوگوں کو سزائیں دی گئیں اور مساجد میں یہ قائدہ مقرر کر دیا گیا کہ صرف حکومت کے منظور کردہ حضرات ہی خطبہ دیا کریں۔

عوام کی بے چینی پر قابو حاصل کرنے کی یہ اور دوسری بہت سے تدابیر اختیار کی گئیں لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ حالات بگڑتے چلے گئے اور آخر حضرت عمر کو یہ ہمت نہ ہو سکی کہ وہ اپنے بعد کے لئے کوئی خلیفہ مقرر کر دیں چنانچہ آپ نے بڑے غور و فکر کے بعد وہ تدابیر اختیار کی جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ حکومت پر قریشی تاجروں کا قبضہ بھی قائم رہے اور عوام کی جانب سے اختلافی صدائیں بلند ہونے کا بھی امکان باقی نہ رہے وہ تدبیر یہ تھی کہ آپ نے چھ آدمیوں کی کمیٹی مقرر فرما دی اور یہ اعلان کر دیا کہ یہ لوگ آپس میں جس شخص کو منتخب کر لیں وہی اسلامی دنیا کا حکمران ہو گا۔

اس کمیٹی میں آپ نے تدبیر یہ کی کہ قریش کے سرمایہ دار طبقہ کے پانچ نمائندے رکھے اور چھٹا آدمی وہ رکھا جو غریب مسلم عوام کی امیدوں کا آخری سہارا تھا۔ کمیٹی کے ارکان میں حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد بن وقاص، حضرت عثمان اور حضرت

عبدالرحمٰن بن عوف سرمایہ دار طبقہ کے نمائندے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کروڑپتی تھا۔ ہر ایک کے بڑے بڑے کاروبار تھے۔ بڑی بڑی جاگیریں تھیں کئی کئی محلات تھے۔ ہر ایک کے پاس سونے چاندی کا اتنا انبار تھا کہ ان کی دولت آج کے راک فیلر فورڈ اور ٹاٹا کو شرم سے آب آب کر دینے کے لئے کافی ہے۔ ان کی دولت کے ہوشربا افسانے پڑھ کر انسان آج بھی دنگ رہ جاتا ہے ظاہر ہے کہ خلافت ان میں سے جن بزرگ کو حاصل ہوتی وہ اسے قریش کے سرمایہ داروں کے مفاد کے لئے استعمال کرتا اور چونکہ کمیٹی میں ۶/۵ اکثریت انہیں حضرات کی تھی اس لئے یہ لازمی تھا کہ حکومت انہیں کے ہاتھوں میں بہ الفاظ دیگر قریش کے اُنہیں تاجروں کے ہاتھوں میں رہے گی جو اسے اپنے قبیلہ کے تاجرانہ مفاد کے لئے استعمال کرتے رہیں گے۔

قریشی سرمایہ داروں کو ۶/۵ اکثریت عطا کر دینے پر بھی حضرت عمر مطمئن نہیں تھے۔ آپ کو اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی موت کے بعد رائے عامہ کا دباؤ کمیٹی کے دو تین ممبروں پر اثرانداز ہو جائے اور خلافت اس شخص کے ہاتھوں میں چلی جائے جو قریش کی تاجرانہ لوٹ اور جاگیردارانہ طمطراق کا سخت مخالف تھا اس لئے اپ نے یہ حکم بھی لگا دیا کہ اگر کمیٹی کے ممبران کے ووٹ برابر سے بٹ جائیں تو وہ فریق کامیاب سمجھا جائے گا جسے عبدالرحمٰن بن عوف کا ووٹ حاصل ہو گا اور اس طرح آپ نے اس طبقہ کی حکومت یقینی بنا دی جس کے آپ خود نمائندے تھے۔ عبدالرحمٰن بن عوف کے متعلق آپ کو یقین تھا کہ وہ اپنے خالہ زاد بھائی حضرت عثمان کا ساتھ دیں گے اس طرح حضرت عثمان اور حضرت ابن عوف کے دو ووٹ ایک ساتھ ہوں گے اور ان کو کامیابی کے لئے صرف ایک ووٹ کی ضرورت ہو گی اس لئے کہ ایک ووٹ حاصل ہو جانے کے بعد ابن عوف کا ایک ووٹ دو ووٹ کے برابر ہو جائے گا اور قریشی سرمایہ دار طبقہ اپنی حکومت کے قیام میں کامیاب ہو جائے گا۔

حضرت عمر اس حقیقت کو جانتے تھے کہ عوام اب جنگ گرانی اور معاشی بدحالی سے تنگ آچکے ہیں اس لئے اگر کمیٹی میں صرف قرشی تاجروں کے نمائندے رکھے گئے تو ان کا فیصلہ عوام کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا اس لئے انھوں نے محض عوام کی اشک شوئی کے لئے کمیٹی میں حضرت علیؑ کا نام بھی رکھ دیا تھا لیکن اس کا پورا بندوبست کردیا تھا کہ ان کو کسی حالت میں خلافت کا تخت دستیاب نہ ہونے پائے عبدالرحمٰن بن عوف کے ہاتھوں میں خلیفہ سازی کی قوتیں مرکوز کردینے کا مقصد صرف یہی تھا۔

بہرحال اس کمیٹی میں حضرت علی علیہ السلام کے اسم گرامی کی شمولیت جہاں عوامی قوتوں کی ایک بڑی فتح تھی اور اس ثبوت تھا کہ قرشی سرمایہ داروں پر رائے عامہ کا دباؤ بڑھتا جارہا ہے وہیں یہ امیرالمومنینؑ علیہ السلام کے اصولوں اور آپ کے طرز عمل کی بھی ایک بہت بڑی کامیابی تھی اس لئے کہ آج قریش کے کروڑ پتی حکمران اس پر مجبور ہو رہے تھے کہ اس شخص کو جسے ابھی چند سال قبل تشدد سے باب خلافت تک لے جایا گیا تھا جسے اسلامی سیاست سے دور رکھنے کی ہر امکانی سعی کی جاتی رہی تھی جس کے خلاف خاندانی اور نسلی تعصب کو خوب ابھارا جاچکا تھا جسے فدک کی ضبطی اور خمس سے محرومی کے نتیجہ میں مالی طور پر برباد کیا جاچکا تھا اور جس کے شرف و منزلت پر پردہ ڈالنے کی ہر امکانی تدابیر عمل میں لائی جاچکی تھی اسی کو "مستحقین خلافت کی کمیٹی" میں شامل کیا گیا اور یہ کام خود انھیں حضرت عمر کو انجام دینا پڑا جنھوں نے آج سے محض پندرہ سال قبل اسی شخص کو قصر خلافت سے بے دخل کرنے میں سب سے بڑا کردار انجام دیا تھا۔

تقدیر اور حالات کا یہ کتنا بڑا عجوبہ ہے کہ انھیں حضرت عمر کو جنھوں نے حضرت کو خلافت سے محروم کرنے میں سب سے نمایاں کردار ادا فرمایا تھا مرتے وقت یہ تسلیم کرلینا پڑا کہ عوام اگر کسی شخص کی حکومت میں مسرت اور اطمینان کی زندگی بسر کرسکتے ہیں تو وہ

حضرت علیؑ ہی ہیں اور چار و ناچار ان کو علیؑ کا نام اس فہرست میں شامل کرنا پڑا جو آپ نے مستحقین خلافت کی تیار فرمائی تھی۔

حضرت عمر کی آنکھ بند ہوتے ہی کمیٹی کے چھ ارکان میں سے چار حضرات دعوائے خلافت سے دست بردار ہو گئے اور اب صرف دو حضرات باقی رہ گئے جن میں سے کسی ایک کا خلافت کے لئے انتخاب ہونا تھا ان دو میں ایک حضرت عثمان اور دوسرے حضرت علیؑ بظاہر اسے معمولی بات تصور کیا جائے گا لیکن واقعات کا یہ رخ اختیار کرنا دراصل اس عظیم ٹکراؤ کا پتہ دیتا ہے جو قرشی سرمایہ داروں اور عوامی قوتوں میں ہو رہا تھا حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کے دلوں میں تمنائے خلافت کا وجود جنگ جمل کے حالات سے بخوبی ظاہر ہے لیکن اس موقع پر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پیچھے ہٹ گئے حالانکہ حصول خلافت کا یہ بہت اچھا موقع تھا سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ بظاہر ان کے اس اقدام کی مندرجہ ذیل وجوہ ہو سکتی ہیں:۔

۱ یہ حضرات عوام کی بے چینی سے کماحقہ واقف تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ عوام زیادہ عرصہ تک ان سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کو برداشت نہیں کر سکیں گے جو قرشی تاجروں اور جاگیرداروں نے پیدا کر دیئے تھے اور جلد یا بدیر حکمران وقت کے خلاف بغاوت ہو گی جس کا ان کو وہی خمیازہ بھگتنا پڑے گا جو بالآخر حضرت عثمان کو بھگتنا پڑا۔

۲ ان کو امید تھی کہ اگر حضرت عثمان خلیفہ بنا دیئے گئے تو بنی امیہ کی پوری قوت قرشی سرمایہ داروں کی پشت پر آجائے گی اور ابو سفیان کو دور جاہلیت میں عوام پر جو اثر و نفوذ حاصل رہا تھا اس کی مدد سے سرمایہ داروں کا راج قائم رہ سکے گا۔

۳ بنی امیہ اپنی روایتی سخت گیری، ظلم اور سیاسی جوڑ توڑ سے قرشی سرمایہ داروں کے لرزتے ہوئے ایوان حکومت کو انہدام سے بچا لیں گے اور ان کو جلب

منفعت کے جو راستے سابقہ حکومتوں کے دور میں حاصل ہو چکے تھے وہ قائم رہیں گے۔

۴ حضرت عثمان کی پشت پر سارا بر سر اقتدار طبقہ متحد نظر آنے کے نتیجہ میں عوام کا جذبہ انقلاب افسردہ ہو جائے گا۔

بہرحال یہ بھی امیرالمومنینؑ کی ایک بڑی کامیابی تھی کہ آج قریش کا سارا بر سر اقتدار طبقہ یہ تسلیم کر رہا تھا کہ علیؑ اتنی بڑی قوت ہیں کہ میدان انتخاب سے ان کو بے دخل نہیں کیا جا سکتا اور ان کو نظر انداز کر کے خلافت کا معاملہ طے کرنا حد درجہ مشکل ہے۔ وہی علیؑ جن کو گزشتہ دو مواقع پر انتہائی بے فکری سے نظر انداز کر دیا گیا تھا آج عوام میں اتنے ہر دلعزیز اور اتنے باا‌ثر ہو چکے تھے کہ ان کو نظر انداز کر کے کام چلانا ناممکن خیال کیا گیا اور بر سر اقتدار طبقہ کو اپنے نمائندہ کے مقابلہ میں چاروناچار ان کا نام رکھنا پڑا۔ یہاں سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے خلیفہ کے انتخاب کا اختیار عبدالرحمن بن عوف کو کیوں دیا تھا؟ اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر حق انتخاب سرمایہ دار طبقہ کے ایک فرد کے ہاتھوں میں نہ سونپ دیا گیا ہوتا بلکہ اسے عوام کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہوتا تو حضرت عمر کے بعد ہی وہ شخص خلیفہ ہو جاتا جو بالآخر حضرت عثمان کے قتل کے بعد خلیفہ بنایا گیا!

یہاں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ حضرت عثمان اور ان کے ساتھی قرشی سرمایہ دار تو حصول خلافت کے لئے بے چین تھے لیکن امیرالمومنینؑ اس باب میں انتہائی بے پروائی کا مظاہرہ کر رہے تھے اس کی وجہ ظاہر ہے قرشی سرمایہ داروں کو اپنا ایوان اقتدار متزلزل نظر آ رہا تھا اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اب عوام کو زیادہ دنوں تک دھوکے میں مبتلا رکھ کر ان پر حکومت کرتے رہنا اور اس حکومت کے نتیجہ میں خزانے جمع کرتے رہنا مشکل ہے اور امیرالمومنینؑ کو اپنی قوت پر پورا اعتماد تھا۔ آپ یہ دیکھ رہے تھے کہ عوام تو اپنی سابقہ

غلطیوں کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا جارہا ہے اور وہ الٰہی نظام حکومت کی خوبی نیز سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے انتخاب خلافت کی اصابت کا اعتراف کرنے لگے ہیں انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جن لوگوں پر وہ اعتماد کر رہے تھے انہوں نے ان کو دھوکہ دے کر ان پر الٰہی حکومت کے بجائے سرمایہ داروں کا راج قائم کردیا ہے اور وہ اس حقیقت کو سمجھنے لگے ہیں کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے علیؑ کی خلافت پر جو اصرار کیا تھا وہ حکومت کو اپنے خاندان میں مرکوز رکھنے کی خاطر نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ علیؑ ہی اسلامی دنیا میں وہ واحد شخص تھے جو حکومت الٰہیہ قائم کرنے اور ملت اسلامیہ کی عظیم انقلابی تنظیم کو برقرار رکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

امیرالمومنینؑ عوام کے اس نئے رجحان کا پورا اندازہ رکھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی آپ یہ چاہتے تھے کہ عوام کو کچھ اور تجربات ہو جائیں تاکہ الٰہی نظام حکومت کی صحت کے باب میں ان کو کوئی شبہ باقی نہ رہے اور آئندہ بھی اکابر قریش کو یہ موقع نہ ملنے پائے کہ وہ عوام کو بہکا سکیں یہی وجہ ہے کہ باوجود اس امر کے کہ آپ کا نام کمیٹی میں شامل کر دیا گیا تھا اور پھر چار امیدوار دست بردار ہو جانے کے نتیجہ میں آپ کے مقابلہ میں صرف ایک امیدوار رہ گیا تھا جو کسی حالت میں آپ کا مدمقابل قرار نہیں دیا جاسکتا تھا آپ نے حصول خلافت پر کوئی توجہ نہیں فرمائی اور عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت عثمان کو خلیفہ بنانے کی جو چال چلی تھی اسے کامیاب ہونے کا موقع دے دیا۔ یہ سیاست علویہ کا بڑا دلچسپ مظاہرہ تھا اس لئے کہ اس کے نتیجہ میں

۱ عوام نے یہ دیکھ لیا کہ حکمران قریشی تاجر طبقہ اپنے اقتدار کی بقا کے لئے کس حد تک سازشی ماحول تیار کرسکتا ہے

۲ عبدالرحمٰن بن عوف کی اسلام دوستی اور ایمانداری کا پول دنیا پر کھل گیا

۳ ایک قریشی سرمایہ دار کے ہاتھوں میں انتخاب خلافت کا حق سونپ دیئے جانے کا

نتیجہ عوام نے دیکھ لیا اور ان کو معلوم ہو گیا صحابیت اور رسول اللہ سے رشتہ داری کے باوجود ایک قرشی سرمایہ دار کس حد تک عدل اور عوام دوستی کا مظاہرہ کر سکتا ہے؟

۴ نئے خلیفہ کے سلسلہ میں عوام کو یہ تجربہ ہو گیا کہ کسی شخص کا صحابی ہونا یا مہاجر ہونا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ربیبہ لڑکیوں کا شوہر ہونا بھی ہرگز یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ الہی حکومت کی ذمہ داریاں سنبھال سکتا ہے

۵ جس بزرگ نے خلافت اسلامیہ کی قسمت ابن عوف کے ہاتھوں میں دے دی تھی ان کی دیانتداری، اصابت فکر، عدل پروری، صحت رائے اور مردم شناسی کا بھی اچھا خاصہ مظاہرہ ہو گیا۔

غرض یہ کہ امیرالمومنینؑ نے اس موقع پر مسئلہ خلافت کے سلسلہ میں جو بے اعتنائی ظاہر فرمائی اس کے نتیجہ میں آپ نے

(۱) خلیفہ سابق، (۲) خلیفہ جدید، (۳) خلافت ساز ارکان اور (۴) قریش کے حکمران طبقہ کو ایک ساتھ برا فگندہ نقاب کر دیا اور ان کے چہروں پر صحابیت، عدالت، اسلامیت اور عوام دوستی کی جتنی نقابیں پڑی ہوئی تھیں وہ سب ایک ساتھ نوچ کے پھینک دیں تاکہ عوام یہ سمجھ لیں کہ صحابیت، تقدس، شرف ہجرت اور نسبی بلندی کے سارے افسانوں کے باوجود قریش کا طبقہ اعلی در حقیقت کیا ہے؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ اور حکومت الہیہ یا خلافت اسلامیہ کے باب میں اس پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

حضرت عبدالرحمن بن عوف نے انتخاب خلافت کے سلسلہ میں جو اصول وضع فرمایا تھا وہ بھی کافی حد تک دلچسپ اور قریش کے تاجرانہ مفاد کا پورا پورا مظہر تھا آپ نے حضرت علیؑ اور حضرت عثمان دونوں سے یہ وعدہ چاہا کہ وہ

"کتاب اللہ، سنت رسولؐ اور سیرت خلفائے راشدین پر عمل کریں گے"۔

اس جملہ میں کتاب اللہ اور سنت رسول کے ٹکڑے تو محض "برائے وزن بیعت" تھے ورنہ اصل سوال تو سیرت خلفائے راشدین کا تھا جو یہ تھی کہ:۔

۱ قریش کے بڑے بڑے لوگوں کو بیت المال سے جو لمبی لمبی رقمیں ملا کرتی تھیں وہ دی جاتی رہیں گی۔

۲ فتوحات کا سلسلہ جاری رہے گا اور ان ممالک کی زرخیز زمینیں "حسب دستور قدیم" عرب سرداروں میں تقسیم ہوتی رہیں گی۔

۳ قریش کا نسبی تفاخر عام عربوں پر اور عام عربوں کی نسلی برتری غیر عربوں پر قائم رہے گی۔

۴ تقسیم بالتسویہ کا وہ اصول جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور حکومت میں جاری تھا دوبارہ جاری نہیں کیا جائے گا۔

۵ لڑائیوں کا سلسلہ قائم رہے گا تاکہ گرانی باقی رہے اور قرشی تاجروں کو نفع اندوزی کا پورا موقع حاصل ہوتا رہے۔

٦ قریشی عوام کے انقلابی رجحانات کو کچلنے کی پوری کوشش کی جائے گی تاکہ غیر قرشی عربوں اور مفتوحہ ممالک کے مسلمانوں میں قریش کی معاشی لوٹ کے خلاف جو بے چینی پھیلی ہوئی ہے وہ دبی رہے۔

۷ عوام کو جاہل رکھنے کی پوری کوشش کی جائے تاکہ وہ قرآن اور حدیث کی روشنی میں اپنے ان حقوق کا مطالبہ نہ کرنے پائیں جو اللہ نے ان کو عطا کیے تھے۔

یہ تھی وہ سیرت شیخین جو سرمایہ داران قریش کے مفاد کی تکمیل کرتی تھی اور جس پر عمل کرنے کا عبدالرحمٰن بن عوف نئے خلیفہ سے عہد لینا چاہتے تھے۔ امیرالمومنینؑ نے اس پر عمل کرنے سے انکار کر دیا لیکن حضرت عثمان نے یہ شرط منظور

فرمائی۔ چنانچہ آپ خلیفہ مقرر کر دیئے گئے۔

حضرت عثمان کے خلیفہ ہوتے ہی جہاں عوام کی امیدوں پر اوس پڑ گئی وہیں خود اکابر قریش نے بھی یہ محسوس کیا کہ وہ خود اپنے بنائے ہوئے جال میں پھنس گئے ہیں اس لئے کہ نئے خلیفہ نے منفعت کے وہ تمام راستے جو سارے قریش کے لئے کھلے ہوئے تھے صرف بنی امیہ کے لئے مخصوص کر دیئے مروان اور سعد بن العاص وغیرہ وزارت کی کرسیوں پر فائز ہو گئے صوبوں کی گورنری بنی امیہ کے سپرد کر دی گئی بیت المال ایک مخصوص خانوادہ کی ملکیت قرار دے دیا گیا۔ طلحہ اور زبیر کے سے عمائد سلطنت نظرانداز کئے جانے لگے۔ بی بی عائشہ کی سی سیاسی قوت کو بھی پس پشت ڈال دیا گیا ایوان سلطنت دولت کی کنجیوں سمیت ایک مخصوص قبیلہ کے قبضہ میں آگیا اور مہاجرین قریش نے جس حکومت کو اپنانے کے لئے اللہ اور رسول کے احکام تک سے سرتابی کی تھی وہ حکومت بنی امیہ کی ایک ایسی خاندانی املاک میں تبدیل ہو گئی جس میں قریش کے دوسرے گھرانوں کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا۔

قریش کو حالات کے اس رخ پر جتنی مایوسی ہوئی اس کا مظاہرہ خود عبدالرحمن بن عوف کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو موصوف نے مرتے وقت ارشاد فرمائے تھے اور جن میں اس امر پر انتہائی افسوس اور پشیمانی ظاہر کی گئی تھی۔ کہ آپ ہی کی مساعی جمیلہ کے نتیجہ میں حضرت عثمان مسلمانوں کے امیر اور خلیفہ مقرر ہو گئے۔

قریش یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے علیؑ کے مقابلہ میں عثمان کو خلیفہ بنا کر ایک بڑی کامیابی حاصل کی ہے لیکن واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کی یہی کامیابی ان کی ایسی عبرت انگیز شکست کا سبب بنی کہ حضرت عمر کے بعد قریش کے کسی قبیلہ کے کسی فرد کو تخت خلافت نصیب نہیں ہوا۔ اسلام کی بادشاہت یا تو بنی امیہ کے ہاتھوں میں رہی یا پھر بنی عباس کی شکل میں انہیں بنی ہاشم کو حاصل ہو گئی جن کو ایوان حکومت سے دور رکھنے

ئی کوشش کی جاتی تھی۔ قریش کے دوسرے قبائل ہمیشہ کے لئے حکومت سے محروم ہو گئے اور یہ سب نتیجہ تھا اس خوفناک سیاسی غلطی کا جو حضرت عثمان کو خلیفہ مقرر کر کے عبدالرحمن بن عوف نے کی تھی یا پھر عبدالرحمن بن عوف کو خلیفہ مقرر کرنے کا حق دے کر ان حضرت عمر نے کی تھی جن کے سیاسی تدبر اور دور بینی پر مسلمانوں کا سواد اعظم آج تک ناز کرتا ہے۔

قریش کے سیاسی دیوالیہ پن کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ انہوں نے جس حکومت کے حصول کے لئے غدیر کے رسالت پناہی فرمان کو ٹھکرا دیا اور جسے باقی رکھنے کے ان کے پاس مذہب کی بے پناہ قوت بھی موجود تھی اسے بھی وہ پندرہ سال سے زیادہ قائم نہ رکھ سکے اور آخر حرص حکومت میں ایسی مہلک سیاسی غلطی کر بیٹھے کہ ہمیشہ کے لئے ان کے اقتدار کا آفتاب غروب ہو گیا اور چند ہی سال میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مکہ اور مدینہ کا وہ حکمران طبقہ جس کا اقتدار دنیا کے کئی ممالک میں مسلم تھا۔ خود دمشق اور بغداد کے حکمرانوں کا محکوم ہو گیا اور سیاسی اعتبار سے ایسا مفلوج ہوا کہ اس کے لئے دوبارہ حصول اقتدار کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہا۔ اس کے برعکس امیرالمومنین کا سیاسی تدبر ملاحظہ فرمایئے کہ قریش اور بنی امیہ کی مشترکہ طاقتوں کے برخلاف آپ کو وہ حکومت مل کے رہی جس سے آپ کو محروم رکھنے کے لئے بے اصولی اور سازش کو جائز قرار دے رکھا گیا تھا اور خود اس قوم کو آپ سے حکومت کی درخواست کرنا پڑی جو پچیس سال تک آپ کو نظرانداز کرتی رہی تھی۔

حضرت عثمان کی حکومت نہ عوام میں مقبول تھی نہ خواص میں، اسلامی تاریخ کا یہ دور صرف بنی امیہ کی لوٹ اور ستم رانیوں کی ایک دردناک داستان ہے۔ اس دور سلطنت میں مروان بن حکم، یعلیٰ بن منبہ، مغیرہ بن شعبہ، ولید بن عتبہ، عبداللہ بن عامر اور عبداللہ بن ابی سرح کے سے بدترین افراد ملت پر حاکم ہو گئے جنہوں نے اپنی لوٹ،

زراندوزی اور مظالم کے نتیجہ میں مسلمانوں کو بے حد مشتعل کر دیا۔ عوام کا پیمانہ صبر چھلک پڑا، اصلاح حال کی جو کوششیں کی گئیں ان کو خود خلیفہ وقت نے برباد کر دیا اس لئے کہ حضرت عثمان کا یہ خیال تھا کہ وہ حضرت عمر کی سی سخت گیری پر عمل کر کے عوام پر قابو رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمارؓ اتنے پیٹے گئے کہ ان کی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ حضرت ابوذرؓ جلاوطن کر دیئے گئے۔ اچھے اور نیک لوگوں پر ہر قسم کا تشدد روا رکھا گیا۔ سمجھا یہ گیا کہ اس تشدد کے نتیجہ میں عوام کو دبا لیا جائے گا لیکن

ع   مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

سازش اور تشدد کے حربے چند دن تو کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتے، آخر ان کے خلاف عوام ابھرتے ہیں اور پھر عوامی غصہ کا سیلاب ایسا تیز و تند ہوتا ہے کہ بڑی بڑی طاقتوں کو بہا لے جاتا ہے۔ چنانچہ مصریوں کے ساتھ جو فریب کاری کی گئی اس نے بارود کے اس تودے میں دیا سلائی دکھا دی جو مسلمانوں کے دلوں میں تیار ہو چکا تھا۔ خلیفہ کا مکان گھیر لیا گیا اور مٹھی بھر مصریوں نے محض اس لئے بساط سلطنت الٹ دی کہ نہ قریش خلیفہ کا ساتھ دینے پر تیار تھے اور نہ انصار فرمانروائے وقت کے حامی۔ سارے مسلمان خلیفہ کے کردار و عمل سے زچ آچکے تھے اس لئے کوئی ان کی مدد کرنے پر تیار نہیں تھا اور جو لوگ مدد کر سکتے تھے ان کو دولت اور عشرت نے اتنا ناکارہ بنا دیا تھا کہ ان میں مصریوں کے مقابلہ کی سکت باقی نہیں رہی تھی، آخر حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے اور ان کی نعش کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ ان جذبات کا پورا مظہر ہے جو اس وقت کے مسلمانوں میں آپ کے متعلق موجود تھے۔

آج کے مسلمان حضرت عثمان پر عقیدت کے جتنے چاہیں پھول برسائیں اور بنی امیہ کے دور میں گھڑی ہوئی احادیث کی بنیاد پر ان کی محبت کو جتنا چاہیں ضروری قرار دیں لیکن اس حقیقت سے انکار محال ہے کہ دور اول کے ان مسلمانوں نے جو صحابہ اور

تابعین پر مشتمل تھے نہ صرف یہ کہ حضرت عثمان سے عقیدت و محبت کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ان کو یہودیوں کے قبرستان میں دفن کر کے آنے والی نسلوں کے لئے بھی ایک سرمایہ عبرت اور ایک دعوت فکر چھوڑ گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ ہمارے مقابلہ میں حضرت عثمان کے "فضائل و مناقب" ان کے کردار و عمل اور ان کے محاسن و مدارج کو زیادہ بہتر طریقہ سے جانتے تھے اس لئے فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت خلیفہ ثالث کی دستگیری کیوں نہ کی؟ ان کی نعش کی بے حرمتی کیوں قبول کی؟ ان کی موت پر اشک غم بہانے کے بجائے گھروں میں کیوں بیٹھے رہے؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ عوام موصوف کی حکومت سے تنگ آچکے تھے اور آپ کی حکومت کے جو کوائف عوام کے سامنے پیش ہوئے تھے انہوں نے عوام کو اس درجہ پریشان اور دلگیر کر دیا تھا کہ وہ آپ سے اور آپ کی حکومت سے نجات حاصل کرنے میں ہی اپنی سلامتی تصور کرنے لگے تھے۔

اس موقع پر ایک چیز اور قابل ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان دونوں قتل کئے گئے۔ اگر یہ حضرات قوم میں ہر دلعزیز ہوتے تو ان کی موت پر یقیناً عوام کے جذبات بھڑک اٹھتے اور لوگ اس نظام حکومت کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے جس کے وہ علمبردار تھے لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان دونوں حضرات کے قتل پر عام مسلمان بالکل خاموش رہے، ان کے جذبات میں کوئی تموج پیدا نہیں ہوا اور جب بنی امیہ نے اپنے مخصوص سیاسی مصالح کے پیش نظر انتقام خون عثمان کا شور برپا کرنا چاہا تو سارے سچے مسلمان ان کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو کے میدان میں آگئے اور آخر خود بنی امیہ کو یہ احساس ہو گیا کہ اس نام پر ان کا مقصد پورا ہونے والا نہیں۔ چنانچہ انہوں نے انتقام خون عثمان کا نعرہ ترک کر کے حصول خلافت کی مہم کا نعرہ بلند کر دیا۔ یہ چیز بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان کا قتل مسلمانوں کی نظر میں کوئی

اصولی یا مذہبی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کی حیثیت عام مسلمانوں کے نزدیک اس قسم کے خالص سیاسی قتل کی تھی جس کا سابقہ عام طور پر ان بادشاہوں کو پڑا کرتا ہے جو اپنے عوام میں ہر دلعزیزی کھو دیتے ہیں یا ایسی سخت گیریوں سے کام لیتے ہیں جن سے عوام میں ان کے خلاف بیزاری اور بغاوت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

اسلامی دنیا کے ان پُر آشوب سیاسی حالات میں امیرالمومنینؑ خاموش پالیسی پر عامل رہے، اس لئے کہ حالات کا ہر نیا رخ اور سیاست کا ہر نیا موڑ آپ کی کامیابی کی دلیل بنتا جا رہا تھا، مسلمان خود اپنے تجربات کی روشنی میں یہ دیکھ رہے تھے کہ اجماع سے خلافت بنی تو اس نے گمراہی اور جنگ کے دروازے کھول دیئے۔ نامزدگی کا اصول اختیار کیا گیا تو اس نے مسلمانوں کو معاشی بنیادوں پر اونچے اور نیچے طبقوں میں بانٹ دیا۔ نیز ان میں عربی و عجمی کا فرق پیدا کر کے باہمی منافرت کا بیج بو دیا اور سیرت شیخین کی بنیاد پر شوریٰ کی راہ اختیار کی گئی تو بنی امیہ کے بدترین افراد امت پر حکمران ہو گئے۔ یہ باتیں اگر زبان سے کہی گئی ہوتیں تو ان پر کسی کو یقین نہ آتا بلکہ شاید پیغمبرؐ کی ذات پر بھی یہ الزام عائد کر دیا جاتا کہ وہ اپنے خاندان میں حکومت مرکوز رکھنے کے لئے ایسی باتیں کہہ رہے ہیں اس لئے امیرالمومنینؑ نے یہ چاہا کہ مسلمان خود "حکومت غیر معصوم" کا تماشا دیکھ لیں اور یہ تجربہ کر لیں کہ جب نبیؐ کے پہلو نشین غیر معصوم کی حکومت یہ رنگ دکھا سکتی ہے اور اتنی غلط ہو سکتی ہے کہ بالآخر عوام کو بغاوت اور خونریزی کی راہ اختیار کر کے فرمانروائے وقت سے نجات حاصل کرنا پڑے تو دوسرے غیر معصوم حکمرانوں کی فرمانروائی جسے علیٰ منہاج الرسالۃ ہونے کا شرف بھی حاصل نہ ہو کیا گل کھلا سکتی ہے؟ امیرالمومنینؑ نے خاموش رہ کے نہ صرف یہ کہ اس وقت کے مسلمانوں پر یہ ثابت کر دیا کہ حکومت الٰہیہ کا کام وہی چلا سکتا ہے جسے نبی نے اللہ کے حکم سے اس امر عظیم پر مامور فرمایا ہے بلکہ ہمیشہ کے لئے مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح فرما دی کہ سرکار دوعالم صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان غدیر اسی خلوص اور بے لوثی پر مشتمل تھا' جس خلوص اور بے لوثی پر شریعت کا ہر حکم مبنی تھا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کی وصایت وولایت کا جو اعلان فرمایا تھا اس میں خود قوم کی بھلائی تھی۔ رسولؐ یا آل رسولؐ کا اس میں کوئی ذاتی یا خاندانی فائدہ نہیں تھا۔

حضرت عثمان کا قتل جن حالات میں ظہور میں آیا وہ حد درجہ پر آشوب تھے مسلمانوں میں شدید ذہنی انتشار پھیلا ہوا تھا' بغاوت کی تیز و تند آندھیوں نے مدینہ کے در و دیوار ہلا دیئے تھے۔ قریش کے اقتدار کا محل زمین بوس ہو چکا تھا۔ مصر اور بصرہ میں شورش کے آثار پورے طور پر نمایاں تھے۔ حاکم اور محکوم جو غیر اسلامی امتیاز سابقہ حکومتوں نے پیدا کر دیا تھا اس کے نتیجہ میں ہر سمت نفرت اور عتاب کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ شام سے ملوکیت کا شیطان اپنے سینگ بر آمد کر رہا تھا۔ معاشی بنیادوں پر طبقات میں تقسیم کی ہوئی قوم طبقہ اعلیٰ کی زر کشی اور اکتناز سے تنگ آ چکی تھی۔ عام مسلمان قرشی تاجروں اور جاگیرداروں کی حکومت برداشت کرنے پر تیار نہیں رہے تھے۔ خود قرشی اکابر کا یہ عالم تھا کہ وہ عوامی عتاب کے اس سیلاب سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ان میں سامنے آنے کی جرات نہیں تھی وہ اپنی دولت اور خزانوں کو بچانے کی فکر میں تھے اور سیاسی مطلع سے روپوش ہو جانے میں ہی اپنی سلامتی تصور کرتے تھے۔ بنی امیہ بھی اپنے اعمال کے نتائج سے لرزہ براندام تھے اور ان میں بھی یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ بپھرے ہوئے عوام کے مقابلہ میں کھڑے ہو سکیں۔ ان حالات میں ایک سیاسی خلا سا پیدا ہو گیا تھا۔ کوئی شخص خلافت کی مسند سنبھالنے یا قیادت کا بار گراں اٹھانے پر تیار نہیں تھا۔ حضرت عثمان کا حشر سب کے سامنے تھا اور ایسی حالت میں وہ تمام مدعیان خلافت و دعویداران قیادت خاموش تھے۔ جو ابھی کل تک مسند حکومت پر فائز ہو کر مفتوحہ ممالک کے خراج پر قابض ہونے اور دولت و سلطنت سے کھیلنے کی تمنا میں

سرگرداں نظر آ رہے تھے، قریش کی حکومت ختم ہو جانے کی وجہ سے جو خلاء پیدا ہوا تھا اسے پر کرنے کے لئے کوئی آگے بڑھنے پر تیار نہیں تھا۔ ان حالات میں قوم کی نگاہیں اپنی قیادت کے لئے جس شخص کی طرف اٹھیں وہ امیرالمومنینؑ ہی کی ذات گرامی تھی۔

امیرالمومنینؑ نے قبول خلافت سے انکار کیا اس لئے نہیں کہ آپ قیادت کا بار گراں سنبھالنے سے احتراز فرما رہے تھے یا اس وقت کے حالات سے اسی طرح متوحش تھے جس طرح دوسرے اکابر قریش سراسیمہ و متوحش تھے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ اس حقیقت کو بخوبی سمجھ رہے تھے کہ پچیس سال میں مسلمانوں کے نفوس بگڑ چکے تھے۔ ان میں حرص و آز کا مادہ بے حد بڑھ چکا ہے اور وہ اس الٰہی نظام حکومت کو برداشت کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں جسے رائج اور نافذ کرنا امام کی حیثیت سے آپ کا فرض تھا۔ آپ یہ جانتے تھے کہ قریش اور بنی امیہ دونوں عوامی غصہ کا یہ سیلاب تھم جانے کے بعد اپنے اپنے اقتدار کی بازیابی کی جدوجہد کریں گے اور اس طرح دنیائے اسلام میں خانہ جنگی کا ایک دور شروع ہو جائے گا۔ آپ اس سے بھی واقف تھے کہ تین خلافتوں کے زمانہ میں جو حالات رونما ہوتے رہے ہیں ان میں مسلمان اپنا انقلابی جوش اور اسلامی اصولوں کی خاطر جذبہ جہاد کھو چکے ہیں اور اب ان میں یہ سکت نہیں ہے کہ وہ ایک خالص اصولی جنگ کے لئے میدان میں اتر سکیں۔ ایسی حالت میں آپ کے لئے خلافت قبول کرنا دراصل ایک بے سود سی بات تھی اس لئے کہ اب وہ قوم ہی نہیں رہی تھی جس کی آپ امامت فرماتے۔ اب تو مسلمان کے نام سے ایک ایسی تھکی ہاری، پریشان، سراسیمہ، حریص، بزدل اور بے اصول جماعت رہ گئی تھی جس میں از سرنو اسلام کا جذبہ پیدا کرنا، جہاد کا ذوق ابھارنا، ایمان کی تڑپ پیدا کرنا اور وہ حیات نو دوڑانا ضروری تھا جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے اپنے دور حیات میں پیدا کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ حکومت کی ذمہ داریاں قبول کرنے پر تیار نہیں تھے اور چاہتے

تھے کہ اپنا وقت تبلیغ و اشاعت دین اور تزکیہ قلب و نفس میں صرف فرمائیں لیکن جب مسلمانوں نے اصرار کیا تو آپ نے ان کو طلحہ اور زبیر وغیرہ کو آزمانے کا مشورہ دیا تاکہ جن جن لوگوں کے دلوں میں تمنائے حکومت و قیادت مچل رہی ہو۔ وہ سب اپنے دلوں کی حسرتیں نکال لیں اور اگر مصریوں کے خوف سے دلوں کے جذبے سرد پڑ گئے ہوں تو کم از کم مسلمان یہ تو دیکھ لیں کہ جب مدینہ پر ہن برس رہا تھا' مال بٹ رہا تھا' لمبے لمبے وظیفے مقرر ہو رہے تھے' جاگیریں تقسیم ہو رہی تھیں اور عزت و شہرت کا بازار گرم تھا اس وقت مسلمانوں کی قیادت اور ملت کی سرداری کا دعوی کرنے والے مشیران سلطنت و عمائد حکومت دراصل کتنے پانی میں ہیں اور ملت پر وقت پڑنے کے بعد ان لوگوں میں سے جنہوں نے خلافت اسلامیہ کے نام پر سونے چاندی کے خزانے جمع کر لیے ہیں وہ کون ہیں جو ملت کی دستگیری کے لئے آگے بڑھتے ہیں؟

امیرالمومنینؑ نے خلافت قبول کرنے سے انکار کر کے عشرہ مبشرہ کے ارکان' بدر و احد کے سورماؤں' بڑی بڑی احادیث فضیلت کے مالکوں اور مناقب و مدارج کے نام پر لمبے لمبے وظیفے وصول کرنے والوں کو ایک بڑے امتحان میں ڈال دیا کہ اب وہ آئیں اور مصری تلواروں کی چھاؤں میں اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا امتحان دیں۔ ثابت کریں کہ وہ ان حدیثوں اور مناقب کے واقعی سزاوار ہیں جو خوشامدیوں اور مطلب پرستوں نے ان کی شان میں گھڑ دی تھیں۔ ثابت کریں کہ وہ ان بڑے بڑے وظائف کے مستحق تھے جو وہ دور خلافت ثانی سے وصول کرتے رہے تھے۔ ثابت کریں کہ ان میں سیادت و قیادت کے وہ جوہر موجود ہیں جن کے وہ مدینہ کے پرسکون ماحول میں دعوے کیا کرتے تھے اور اس پر آشوب دور میں خلافت کی ذمہ داریاں قبول کر کے یہ ثابت فرمائیں کہ وہ واقعی ملت اسلامیہ کے سچے بہی خواہ اور اس کے حقیقی جان نثار ہیں۔ یہ ایک بڑا اہم اور دلچسپ سوال تھا جو امیرالمومنینؑ نے اٹھا دیا اور دنیا نے یہ دیکھ لیا کہ مال غنیمت کی تقسیم

تھے کہ اپنا وقت تبلیغ واشاعت دین اور تزکیہ قلب ونفس میں صرف فرمائیں لیکن جب مسلمانوں نے اصرار کیا تو آپ نے ان کو طلحہ اور زبیر وغیرہ کو آزمانے کا مشورہ دیا تاکہ جن جن لوگوں کے دلوں میں تمنائے حکومت و قیادت مچل رہی ہو۔ وہ سب اپنے دلوں کی حسرتیں نکال لیں اور اگر مصریوں کے خوف سے دلوں کے جذبے سرد پڑ گئے ہوں تو کم از کم مسلمان یہ تو دیکھ لیں کہ جب مدینہ پر ہن برس رہا تھا' مال بٹ رہا تھا' لمبے لمبے وظیفے مقرر ہو رہے تھے' جاگیریں تقسیم ہو رہی تھیں اور عزت و شہرت کا بازار گرم تھا اس وقت مسلمانوں کی قیادت اور ملت کی سرداری کا دعوی کرنے والے مشیران سلطنت و عمائد حکومت دراصل کتنے پانی میں ہیں اور ملت پر وقت پڑنے کے بعد ان لوگوں میں سے جنہوں نے خلافت اسلامیہ کے نام پر سونے چاندی کے خزانے جمع کر لیے ہیں وہ کون ہیں جو ملت کی دستگیری کے لئے آگے بڑھتے ہیں؟

امیرالمومنینؑ نے خلافت قبول کرنے سے انکار کرکے عشرہ مبشرہ کے ارکان' بدر و احد کے سورماؤں' بڑی بڑی احادیث فضیلت کے مالکوں اور مناقب و مدارج کے نام پر لمبے لمبے وظیفے وصول کرنے والوں کو ایک بڑے امتحان میں ڈال دیا کہ اب وہ آئیں اور مصری تلواروں کی چھاؤں میں اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا امتحان دیں۔ ثابت کریں کہ وہ ان حدیثوں اور مناقب کے واقعی سزاوار ہیں جو خوشامدیوں اور مطلب پرستوں نے ان کی شان میں گھڑ دی تھیں۔ ثابت کریں کہ وہ ان بڑے بڑے وظائف کے مستحق تھے جو وہ دور خلافت ثانی سے وصول کرتے رہے تھے۔ ثابت کریں کہ ان میں سیادت و قیادت کے وہ جوہر موجود ہیں جن کے وہ مدینہ کے پرسکون ماحول میں دعوے کیا کرتے تھے اور اس پرآشوب دور میں خلافت کی ذمہ داریاں قبول کرکے یہ ثابت فرمائیں کہ وہ واقعی ملت اسلامیہ کے سچے بہی خواہ اور اس کے حقیقی جان نثار ہیں۔ یہ ایک بڑا اہم اور دلچسپ سوال تھا جو امیرالمومنینؑ نے اٹھا دیا اور دنیا نے یہ دیکھ لیا کہ مال غنیمت کی تقسیم

ہیں۔

مزے کی بات تو یہ ہے کہ اس وقت مدینہ میں وہ طلحہ، زبیر اور سعد بن وقاص بھی موجود تھے جنہوں نے ابھی کل کی بات ہے کہ سیرت شیخین کی پابندی کو شرط خلافت قرار دیا تھا لیکن آج؟ —— آج یہ شرط ختم ہو چکی تھی، صرف ختم ہی نہیں ہو چکی تھی بلکہ سرے سے بھلائی جا چکی تھی اور خود ان اکابر قریش نے بھی بھلا دی تھی جو اس شرط کے موجد تھے۔ یہ امیر المومنینؑ کی ایک عظیم اصولی فتح تھی، اس لئے کہ اس طرح عملاً یہ تسلیم کر لیا گیا کہ یہ شرط کوئی شرعی یا مذہبی حیثیت نہیں رکھتی تھی بلکہ یہ سوال صرف ایک سازش کے ماتحت اٹھایا گیا تھا اور اس کا مقصد محض اتنا تھا کہ قوم پر قرشی سرمایہ داروں کا راج قائم رکھا جائے۔

امیر المومنینؑ اگر قبول خلافت میں تاخیر نہ فرماتے تو اکابر قریش کی اس سازش کا حال نہ کھلتا اور شاید دنیا اس دھوکے میں رہ جاتی کہ سیرت شیخین پر عمل بھی کوئی مذہبی شرط ہے لیکن سیاست علویہ کے قربان جایئے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ خلافت کے سے شرعی مسئلہ میں اس بدعت کا خاتمہ کر دیا بلکہ دنیا پر یہ بھی واضح کر دیا کہ حکومت ایسی چیز ہے جس کے لئے صحابہ کرام تک شریعت میں بدعت کے مرتکب ہو سکتے ہیں اور محض اپنی مقصد برآری کے لئے یا صاف الفاظ میں حصول حکومت کے لئے ایسی چیزیں ایجاد فرما سکتے ہیں جن کو دوسرے موقع پر خود انہیں کو مسترد کرنا پڑ جاتا ہے۔

امیر المومنینؑ کے اس طرز عمل نے اس وقت کے بزرگوں کے چہروں پر پڑی ہوئی خلوص، بے لوثی، للہیت اور صحابیت کی نقابیں اس خوبصورتی سے الٹ دیں کہ اب صاحبان نظر، جو عقیدت کے بجائے عقل و بصیرت سے کام لینا جانتے ہوں، حقائق اور شخصیتوں کو برا فگندہ نقاب دیکھ سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور مزیدار بات یہ ہے کہ امت نے امیر المومنینؑ کی ذلت پر

"اجماع" کیا لیکن امیرالمومنینؑ نے اس اجماع کا فیصلہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ طلحہ، زبیر اور دوسرے اکابر قریش نے "شوریٰ" کے ذریعے آپ کی خلافت کا فیصلہ کیا لیکن آپ نے اسے بھی مسترد کر دیا۔ سیرت شیخین کا سوال اٹھانے کی تو کسی میں ہمت ہی نہیں ہوئی لیکن اس باب میں آپ کا جو فیصلہ تھا اس سے دنیا واقف ہے۔ ایسی حالت میں آپ نے قوم کے ساختہ پرداختہ ہر اصول خلافت کو مسترد کر دیا لیکن قوم نے پھر بھی خلافت آپ کے سپرد کی اور بصد اصرار سپرد کی۔ جو سیاست علویہ کا ایک بے نظیر نمونہ اور آپ کی ایک عظیم الشان اصولی فتح ہے۔

دنیا نے دیکھ لیا کہ خلافت ساز ان امت ہارے اور علیؑ جیتے۔ علیؑ نے اجماع کو بھی نہیں مانا۔ شوریٰ کو بھی نہیں مانا۔ نامزدگی کو بھی نہیں مانا۔ انتخاب خلافت کے سلسلہ میں قریش کے وضع کردہ ہر "اصول" کو ٹھکرا لیا اور قریش نہ صرف یہ کہ خاموشی سے یہ تماشا دیکھتے رہے بلکہ انھوں نے اپنے ان مزعومات کی شکست کے باوجود علیؑ کی بیعت کی اور اس طرح اپنے عمل سے یہ قبول کر لیا کہ ان تمام شرائط کا دین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ تو سب حصول حکومت کی تدبیریں تھیں جس وقت جس ترکیب سے کام نکل سکتا تھا اس وقت وہ ترکیب اختیار کر لی جاتی تھی اور مقصد برآری کے بعد اسے فراموش کر دیا جاتا تھا۔ سوال نہ دین کا نہ ملت کا مقصد جو کچھ تھا وہ حکومت کا تھا۔

امیرالمومنینؑ کو پچیس سال تک ایوان حکومت سے ضرور دور رہنا پڑا لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ چہروں پر پڑی ہوئی نقابیں الٹ گئیں۔ عدالت صحابہ کا ڈھونگ ختم ہو گیا اور کم از کم عقل و بصیرت رکھنے والوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ کون کیا تھا اور صدر اسلام کی سیاسی زندگی جسے اعلیٰ اصول پروری اور اسلامیت کا مظہر اتم قرار دے کر علیٰ منہاج النبوۃ کے معزز لقب سے نواز دیا گیا ہے حرص حکومت مطلب برآری، زراندوزی، سازش اور بے اصولی کے کتنے فتنوں سے آلودہ ہو چکی تھی۔

خلافت ظاہری

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو اس وقت خلافت حاصل ہوئی جب قوم میں اتحاد تھا' قوت تھی' ابھرنے کا جذبہ تھا زندگی اور جوش تھا انقلاب اور مقصد کی تڑپ تھی' عزائم بلند تھے' ہمت مضبوط تھی حالات پرسکون تھے' فیض صحبت رسولؐ سے اخلاق بلند تھا' نظم اعلیٰ تھا اور عوام میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو ایک زندہ' جوان اور ابھرتی ہوئی قوم میں موجود ہوا کرتی ہیں ایسے حالات میں قوم کی قیادت سنبھال لینا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ ان حالات میں قیادت کا امتحان بس اس چیز میں ہوتا ہے کہ قوم کی صلاحیتوں کو ضائع نہ ہونے دیا جائے ان صلاحیتوں کو تعمیری کاموں میں استعمال کر کے قوم کے معیار زندگی کو بلند اور اس کی ذہنی روحانی اور اخلاقی حیثیت کو برتر بنایا جائے اور اس کی قوتوں کا زیادہ سے زیادہ استحکام کیا جائے تاکہ وہ غلط راہوں میں برباد نہ ہو جائیں اس کی تنظیم جن اصولوں پر کی گئی ہے ان کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اس سے زندگی کے مختلف شعبوں میں آگے بڑھایا جائے اور اسے مادی' ذہنی اور روحانی ارتقاء کی ان راہوں پر گامزن رکھا جائے جن پر چل کر وہ عروج کی منزلیں طے کر سکے۔ جب ہم اس زاویہ سے ان حضرات کی خلافت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں مایوسی کے سوا اور کچھ دستیاب نہیں ہوتا ہم یہ ضرور دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے چند ملک فتح کر لئے اور ان فتوحات کے نتیجہ میں ان کا برسراقتدار طبقہ کافی مالدار ہو گیا لیکن علم الاقوام کے ماہرین یہ جانتے ہیں کہ ایک زندہ طاقتور اور ابھرتی ہوئی قوم کا چند ممالک فتح کر لینا نہ کوئی بڑا کارنامہ ہے۔ اور نہ اس قوم کے قائدین کی اعلیٰ صلاحیت کا کوئی ثبوت۔ اس لئے جب بھی کوئی قوم زندگی اور نظم کی قوتوں سے

ہمکنار ہوتی ہے تو وہ اپنا دائرہ اثر وسیع کرتی ہے اس کے اردگرد کی کمزور قومیں جو عیش پرستی یا بدنظمی کا شکار ہوتی ہیں اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہیں اور وہ ایک وسیع حصہ ارض کی مالک بن جاتی ہیں ہر ابھرتی ہوئی قوم کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا ہے اور آتا رہتا ہے۔ رومن ابھرے تو یورپ اور شمالی افریقہ پر چھا گئے۔ ایرانی ابھرے تو مشرق قریب پر ان کا پرچم اقبال لہرانے لگا انگریز ابھرے تو ان کی سلطنت میں آفتاب غروب ہونا بند ہو گیا۔ تاتاری ابھرے تو ساری معلومہ دنیا پر قابض ہو گئے روسی ابھرے تو آدھی دنیا پر ان کا سکہ رواں ہو گیا یہی دنیا کا دستور اور علم الاقوام کا کلیہ ہے اس لئے محض چند ممالک کی فتح کو حضرت ابوبکر و حضرت عمر کی قیادت کی کامیابی قرار دینا عقیدت پسندی کا مظاہرہ تو کہا جاسکتا ہے حقیقت پسندی یا علم تاریخ سے واقفیت کا مظاہرہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا مسلمان ایک نئی اور ابھرتی ہوئی قوم تھے اس لئے ان کی قیادت کسی کے ہاتھوں میں ہوتی توسیع مملکت کا کام ضرور انجام پاتا۔ قوم اپنا دائرہ اثر ضرور وسیع کرتی۔ آس پاس کی قوموں پر غلبہ ضرور حاصل ہوتا۔ یہ کوئی خاص بات نہیں ہے اور اس پر قیادت کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کرنا بالکل غلط ہے۔

ہمارے سامنے کی بات ہے کہ ہر ہٹلر کی قیادت میں جرمنوں نے پولینڈ، چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ، ہالینڈ، بلجیئم، فرانس، آسٹریا، ہنگری، بلغاریہ، رومانیہ اور آدھے روس پر قبضہ کرلیا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہٹلر کی قیادت کو محض اس بنیاد پر کامیاب کہا جاسکتا ہے؟ اور کیا جرمن قوم کی تباہی کی تمام تر ذمہ داری سے ہٹلر کو عہدہ برآ کیا جاسکتا ہے؟

جنرل ٹوجو کی قیادت میں جاپانیوں نے مشرقی چین، فلپائن، انڈونیشیا، ہند چینی، ملایا، سنگاپور اور برما تک پر قبضہ کرلیا لیکن کیا اس تسخیر ممالک پر جنرل ٹوجو

کو ایک کامیاب قائد کہا جاسکتا ہے؟ اور کیا اس کی قیادت کا یہ نتیجہ نکلا کہ بالآخر جاپان کو امریکہ کے سامنے محکومی کا سر جھکا دینا پڑا؟

یہ دو مثالیں ہی اس کا ثبوت ہیں کہ کسی قیادت کی ناکامی یا کامیابی کا فیصلہ فتوحات پر نہیں کیا جاتا۔ اس کا فیصلہ نتائج کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کی نئی اور طاقت سے بھرپور قوم نے چند ممالک ضرور فتح کر لئے لیکن محض پچیس سال کے اندر ہی یہ قوم جسے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نظم و اتحاد کا مرقع اور قوت و سطوت کی نشانی بنا دیا تھا خانہ جنگی، بغاوت، بدامنی، جدال باہمی جمود اور بزدلی کا شکار ہو گئی اسے جن بلند و برتر اصولوں کی بنیاد پر متحد کیا گیا تھا وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اس کا جذبہ جہاد ختم ہو گیا اس کی قوتیں بکھر گئیں وہ ایک عضو مفلوج بن کر رہ گئی اس کی ترقی کی راہیں مسدود ہو گئیں وہ ایک گم کردہ راہ کارواں میں تبدیل ہو گئی اس کا مقصد حیات فنا ہو گیا وہ زمین پر اللہ کی بادشاہت قائم کرنے کی بجائے خود اموی اقتدار کے سامنے سرنگوں ہو گئی عادلانہ تقسیم دولت کی تبلیغ کے بجائے زراندوزی کا شکار ہو گئی اور اسلام کے اس عظیم نظام زندگی کو بھی فراموش کر بیٹھی جو اس کی زندگی کا مقصود اور اس کی حیات ارضی کا نصب العین تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو قوم چھوڑی تھی وہ دلیر تھی جفاکش تھی صاحب عزم تھی ہمت ور تھی اور مرعوبیت یا شکست خوردگی کے احساس سے کوسوں دور تھی لیکن صرف پچیس سال کے اندر وہ ایسی بدلی کہ مٹھی بھر مصریوں نے مدینہ میں غدر برپا کر دیا اور مدینہ والے انتہائی بے بسی کا مظاہرہ کرتے رہے بنی امیہ کے گورنر ملک میں لوٹ مچاتے رہے اور وہی مسلمان جو ابھی کل تک خلیفہ وقت تک کو ٹوک دینے کی جرات رکھتے تھے ان بدترین افراد تک

کے مقابلہ میں بے بس اور خاموش تھے حرص دنیا ان پر اتنی غالب آچکی تھی کہ اب معاویہ ان کو ٹکوں میں خرید سکتے تھے عزم و ہمت ان سے اس درجہ مفقود ہو چکا تھا کہ ابو موسیٰ اشعری کے جیسے بڑے لوگ شمشیر آہن کی بجائے لکڑی کی تلوار لگانے کو فضیلت دے رہے تھے اور ان کے دل اس درجہ کمزور پڑ چکے تھے کہ میدان سے فرار اور جہاد سے گریز ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی اب نہ تو قوم میں نظم تھا اور نہ اتحاد تھا نہ عالی ہمتی تھی نہ افلاک پر کمند ڈالنے کا عزم تھا نہ باطل سے پنجہ کشی کی امنگ تھی نہ شیروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دینے کی جرأت تھی نہ مقاصد پر مرمٹنے کی تمنا تھی نہ انقلاب اسلامی کو عالمگیر بنانے کی آرزو تھی نہ اسلامی تحریک کو پروان چڑھانے کا جذبہ تھا نہ اپنے حقوق کے تحفظ کی قوت تھی نہ حیات کا ولولہ تھا نہ زندگی کا جوش تھا نہ فداکاری کا ذوق تھا' نہ قربانیوں کی لگن تھی اور نہ اسلام کی اشاعت کا وہ شوق تھا جس نے ان کو بدر اُحد کے میدانوں میں سرفروشی پر تیار کیا کرتا تھا اس کے برعکس ان میں ایک لاانتہائی جمود تھا ایک عام احساس شکست خوردگی تھا ایک نہ ختم ہونے والی تھکن تھی ایک بے پناہ مایوسی اور افسردگی تھی ایک پسپائی کی سی کیفیت تھی ایک انتشار کا عالم تھا وہ زندگی سے اتنے دور ہو چکے تھے کہ ان میں اسلامی دنیا کی سیاست سے ایک خاص قسم کی بے تعلقی پیدا ہو چکی تھی اور قوم ان تمام اخلاقی و روحانی اقدار سے محروم ہو چکی تھی جو ایک زندہ اور ابھرتی ہوئی قوم کی نشانی کہی جاتی ہیں قوم کی قوتیں جنگ آزمائی اور کشور کشائی میں ضائع ہو چکی تھیں اس کی اعلیٰ اخلاقی صلاحیتیں مردہ ہو چکی تھیں وہ احساس حریت سے اس درجہ محروم ہو چکی تھی کہ ہزاروں صحابہؓ کی نگاہوں کے سامنے ملوکیت و قیصریت کا آغاز ہوا اور انہوں نے صرف یہ کہ اسے روکا نہیں بلکہ خاموشی سے اسلام کے قیصر امیر معاویہ کی

بیعت کرلی۔ اس کا دینی جذبہ اتنا مٹ چکا تھا کہ یزیدؔ نے اس سے غلامی پر بیعت طلب کی اور اس نے یہ مطالبہ بے چوں و چرا قبول کر لیا اس کا نظم اس حد تک بگڑ چکا تھا کہ اس کا تیسرا خلیفہ قتل کر ڈالا گیا اور وہ بے بسی سے تماشا دیکھتی رہی اور زر پرستی کی اتنی خوگر ہو چکی تھی کہ چند پیسوں کی خاطر آل رسولؐ پر ستم برداشت کرتی رہی' اس کا وہ سارا ولولہ اور وہ ساری گرمی ختم ہو چکی تھی جس کے بل پر اس نے قیصر کے سر سے تاج اور کسریٰ کے قدموں سے تخت چھین لیا تھا اب وہ ایک مردہ اور بے حس قوم تھی اور یہ نتیجہ تھا پچیس سال کی اس قیادت کا جس پر عقیدت کے مارے مسلمان آج تک ناز کیا کرتے ہیں۔

پچیس سال میں چند ممالک ضرور فتح ہو گئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ :۔

۱۔ مسلمانوں میں حکمرانی اور انتظام کی کتنی صلاحیت پیدا ہوئی تھی؟

۲۔ ان میں اس عظیم سلطنت کو باقی رکھنے کی کتنی قابلیت پیدا کی گئی؟

۳۔ ان کی علمی اور ذہنی زندگی کا کیا حشر ہوا؟ ان کا تعلیمی معیار کس حد تک بلند کیا گیا؟

۴۔ ان میں اسلامی دعوت کو عام کرنے کی صلاحیت کس حد تک بیدار کی گئی؟

۵۔ عوام کی معاشی اور اخلاقی حیثیت کس حد تک بہتر بنائی جا سکی؟

۶۔ وہ تمدن' تہذیب' علم اور حکمت میں معاصر اقوام سے کیوں پیچھے رہ گئے؟

۷۔ ان کا وہ دینی ولولہ کیا ہوا جس نے ان میں پہاڑوں کا ثبات اور فولاد کی صلابت پیدا کی تھی۔ ان سوالات کے جواب پر ہی اس قیادت کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ ہو جاتا ہے؟

قوم کی حالت بہتر تھی تو ہر شخص قبول خلافت کا تمنائی تھا لیکن حالات بگڑے تو سارے مدعیان خلافت گھروں میں چھپ کے بیٹھ رہے ان حالات میں

وہی شخص آگے بڑھا جس میں ہر قسم کے حالات میں قوم کی قیادت کی صلاحیت موجود تھی امیرالمومنینؑ کی کامیابی کی اس سے روشن دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ آج قوم ان کے دروازے پر دستک دے رہی تھی ان کو مدد کے لئے پکار رہی تھی ان کا دامن تھام رہی تھی اور اس وقت جبکہ اس کے سارے سہارے ٹوٹ چکے تھے امیرالمومنینؑ ہی کی ذات گرامی کو اپنا آخری آسرا قرار دے رہی تھی۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے خلافت ظاہری قبول فرمائی تو آپ کے سامنے متعدد مسائل تھے۔

۱۔ مدینہ کے حالات کو اعتدال پر لانا اور مصریوں کے غصہ کو ختم کرنا۔

۲۔ بنی امیہ کے ان لحکام سے ملت اسلامیہ کو نجات دلانا جو امت کا خون چوس چوس کے اسے تباہ کئے دے رہے تھے۔

۳۔ قوم کے داخلی انتشار کو ختم کرنا۔

۴۔ مسلمانوں میں دولت اور نسل کی بنیاد پر طبقاتی تقسیم پیدا ہو گئی تھی اسے ختم کرکے وحدت اسلامیہ کو بحال کرنا۔

۵۔ اسلامی دعوت انقلاب کی تعلیم کو عام کرنا تاکہ امت جو فتوحات اور زراندوزی میں مبتلا ہو کر اس دعوت کو تقریباً فراموش کر چکی تھی دوبارہ اس کے اساسی تصورات سے آگاہ ہو جائے اور مسلمانوں میں کم از کم ایک جماعت ضرور ایسی پیدا ہو جائے جو ہمیشہ اسلام کی سچی تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتی رہے۔

امیرالمومنینؑ نے خلافت سنبھالتے ہی مدینہ میں امن قائم کر دیا اور مصریوں کو تسکین دے کر شہری زندگی بحال کر دی آپ کی سیاسی اور انتظامی قابلیت کا یہ پہلا مظاہرہ تھا جس میں آپ نے زبردست کامیابی حاصل فرمائی۔

آپ نے دوسرا کام یہ کیا کہ حضرت عثمان کے بہت سے ایسے افسران کو

معزول کردیا جو امت کے لئے وبال جان ثابت ہو رہے تھے آپ پر یہ اعتراض شدت سے کیا جاتا ہے کہ آپ نے ان افسران کو معزول کرکے سیاسی غلطی کی لیکن یہ اعتراض کرنے والے خود اپنی سیاسی بے بصیرتی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور دراصل اسی اعتراض کو اندھا دھند دہراتے چلے جاتے ہیں کہ جو سیاسی اور انتظامی صلاحیتیں رکھنے والے عربوں نے آپ پر کیا تھا اگر وہ ایک ذرا سے تعقل و تفکر سے کام لیں تو ان کو خود یہ محسوس ہو جائے گا کہ ان کا یہ اعتراض سرے سے مہمل اور آپ کا اقدام انتہائی مصلحت اور سیاسی دور اندیشی پر محمول تھا اس لئے کہ :۔

۱۔ ان ظالم' لٹیرے اور نالائق حکام کی برطرفی کے نتیجہ میں مملکت میں سکون پیدا ہو گیا اور وہ شورش دب گئی جو حضرت عثمان کے عہد آخر میں پیدا ہو گئی تھی۔

۲۔ ان صوبہ داروں کی برطرفی کے نتیجہ میں حجاز' یمن' عراق' ایران اور مصر وغیرہ پر آپ کا تسلط ہو گیا ورنہ ان صوبوں میں بھی وہی ہوتا جو شام میں ہوا اور حضرت عثمان کے رشتہ دار اموی حکام ان علاقوں میں بھی بغاوت کر دیتے اور اس کے نتیجہ میں اسلامی سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا آپ کے اس اقدام کے نتیجہ میں مملکت کی سالمیت قائم رہی ورنہ وہی ہوتا جو عباسیوں کے آخری دور میں صوبہ داروں نے کیا اور اس سے نہ صرف یہ کہ مملکت اسلامیہ چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ جاتی بلکہ مسلمانوں کی مرکزی حکومت تباہ ہو جانے کے نتیجہ میں یہ بھی اندیشہ تھا کہ مفتوحہ علاقے پھر اپنے سابق ادیان پر پلٹ جاتے اس لئے کہ ان علاقوں میں اسلام کا جو کچھ اثر تھا تلوار کی وجہ سے تھا' تبلیغ یا نشر علم کی بدولت نہیں تھا اور ایسی

حالت میں اس کا پورا امکان تھا کہ مرکز خلافت کمزور ہو جانے کے نتیجہ میں یہ علاقے اسلام سے روگرداں ہو جاتے۔

۳۔ شام میں اموی حکومت کے قیام اور مدینہ کی دینی مرکزیت کمزور ہو جانے کے نتیجہ میں دنیا نے یہ تماشا دیکھا کہ اسلام میں درجنوں فرقے بن گئے ہزاروں جھوٹی احادیث گھڑلی گئیں، تفاسیر پر یونانی فلسفہ کا اثر غالب ہو گیا روایات میں اسرائیلی خرافات داخل ہو گئیں اور عقائد و احکام کی دنیا میں زلزلہ سا آ گیا اب ایک ذرا قیاس کیجئے کہ اگر یمن ایران، مصر، عراق سب جگہوں پر مطلق العنان اموی حکومتیں بن جائیں اور مدینہ کے اثرات کا بالکل خاتمہ ہو جاتا تو کیا نتیجہ ہوتا؟ اسلام کیا رخ اختیار کر لیتا عقائد و احکام میں کیسی تبدیلیاں ہو جاتیں اور یہ خانہ جنگی مسلمانوں کو تو الگ رکھیے خود اسلام کو کس درجہ تباہ کر دیتی؟

۴۔ امیر معاویہ یا طلحہ و زبیر کی سرکوبی کے دوران میں ان ناقابل اعتماد گورنروں کی موجودگی حد درجہ مہلک ثابت ہو سکتی تھی اس لئے کہ یہ لوگ معاویہ کی شہ پر اس دشمنی کے نتیجہ میں جو بنی امیہ کے دلوں میں اسلام کے خلاف موجود تھی اسلامی فوجوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیتے۔ امیرالمومنینؑ کی رسد اور کمک کاٹ دیتے یا جگہ جگہ بغاوتیں کر کے مسلمانوں کی قوت اتنی منتشر کر دیتے کہ شامی فوجیں کامیاب ہو جاتیں اور شامی عیسائی دنیا سے اسلام کا خاتمہ کر دیتے۔

۵۔ دنیا کا کوئی عقلمند حکمران صوبوں پر ایسے حکمرانوں کو قائم نہیں رکھتا جو اس کے مخالف یا دشمن ہوں ایسا کرنا خود اپنے پیروں پر کلہاڑی چلانے کے مترادف ہوتا ہے۔

۶۔ اگر آپ ان اموی افسروں کو برطرف نہ کرتے تو مقبوضہ علاقوں کے عوام لازمی طور پر اس نتیجہ پر پہنچ جاتے کہ اسلام کا مقصد غیر عرب علاقوں کو لوٹنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور اس طرح ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف بیزاری پیدا ہوجاتی۔

۷۔ اموی حکام کی موجودگی میں آپ وہ علمی اخلاقی اور روحانی اصلاحات عمل میں نہیں لا سکتے تھے جو آپ کا مقصود اصلی تھیں۔ بنی امیہ کی جہالت، دین واری، دین سے بیزاری اور اخلاقی دنائت دنیا کو معلوم ہے ظاہر ہے کہ ان کے ذریعے کسی روحانی یا علمی تحریک کو پروان چڑھانا قطعاً" ناممکن تھا اس لئے ان کی برطرفی ایک اصولی حکومت کے لئے حد درجہ ضروری تھی۔

ایسی حالت میں آپ نے وہی کیا جو ایک ہوشمند مدبر کو کرنا چاہئے اور آپ کے اس اقدام پر وہی لوگ اعتراض کرسکتے ہیں جو یا تو خود سیاسی اعتبار سے دیوالیہ ہیں یا پھر محض مخالفت برائے مخالفت پر ایمان رکھتے ہیں۔

آپ کے سامنے تیسرا اہم سوال اس داخلی انتشار کو دور کرنے کا تھا جو دنیائے اسلام میں پیدا ہوچکا تھا مدینہ میں مصریوں کی یلغار دراصل اسی اندرونی خلفشار کا ایک مظہر تھی، مسلمانوں کا نظم و اتحاد برباد ہوچکا تھا اور اس کی جگہ بغاوت و سرکشی کے جذبات نے لے لی تھی مصر اور بصرہ کے لوگوں کا مدینہ پر چڑھ آنا اسی ذہنیت کا مظہر تھا خلیفہ ثالث کی کمزوری اور مسلمانوں کے اخلاق کا زوال اس داخلی انتشار کے سب سے بڑے اسباب تھے چنانچہ یہ خلیفہ ثالث کے دور میں پروان چڑھ چکا تھا امیرالمومنین ؑ کے دور میں ایک تناور درخت کی شکل اختیار کرگیا اور جملؔ و نہروانؔ اسی کے دو مختلف مناظر تھے۔

یہ دونوں بغاوتیں مسلمانوں کا نظم ختم ہوجانے کا پتہ دے رہی تھیں۔ امیرالمومنین ؑ

نے ایک کامیاب مدبر اور ایک دور بین قائد کی حیثیت سے یہ ضروری تصور کیا کہ اس داخلی فتنہ کو اتنی سختی سے کچل دیا جائے کہ انتشار پیدا کرنے والی طاقتوں کی کمر ٹوٹ جائے اور ملک میں امن و امان قائم ہو جائے چنانچہ جمل اور نہروان کے میدانوں میں جو کچھ ہوا وہ دنیا کے سامنے ہے باغیوں کی پوری طرح سرکوبی کر دی گئی اور عربوں پر یہ حقیقت واضح کردی گئی کہ وہ شخص جو مسلمانوں پر باپ سے زیادہ رحیم ہے فتنہ پردازوں اور خلافت اسلامی کو داخلی انتشار کا شکار بنانے والوں کے مقابلہ میں فولاد سے زیادہ سخت بن جانے کی قوت رکھتا ہے اور اس کی حکومت کسی داخلی فتنہ کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے اس سخت گیری کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں امن قائم ہوگیا اور پھر آپ کے دور سلطنت میں کسی کو بغاوت کی جرأت نہیں ہو سکی یہاں ہم نے امیر معاویہ کے خلاف جنگ کا ذکر دانستہ طور پر نہیں کیا اس لئے کہ یہ جنگ "داخلی خطرہ" سے تعبیر نہیں کی جاسکتی۔ یہ دراصل ایک "بیرونی حملہ آور" کے خلاف جنگ تھی اس لئے میدان صفین میں امیرالمومنین" مسلمانوں سے نہیں لڑ رہے تھے شامی عیسائیوں اور ان بنی امیہ سے لڑ رہے تھے جنہوں نے کبھی دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا امیر معاویہ کے نام اپنے تاریخی مکاتیب میں آپ نے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں فرمادی ہے کہ آپ امیر شام کو مسلمان تسلیم نہیں کرتے ایسی حالت میں شامیوں کے خلاف آپ کی جنگ دراصل ایک بیرونی دشمن کے خلاف جنگ تھی اور اسے اندرونی خلفشار میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک داخلی نظم و ضبط مملکت کا تعلق تھا اس میں آپ بالکل کامیاب ہوئے اور قریش و خوارج کے فتنوں کا آپ نے سدباب کر دیا۔

مسلمانوں میں دولت اور نسب کی بنیادوں پر مختلف طبقات وجود میں آگئے

تھے اور اسلامی مساوات چاہے مسجد کے اندر باقی رہی ہو لیکن روزمرہ کی عملی زندگی میں ختم ہو گئی تھی حضرت عمر نے مسلمانوں کو امیر اور غریب، عرب اور عجم، قرشی اور غیر قرشی میں تقسیم کر دیا تھا امیرالمومنینؑ نے نسل و نسب اور دولت کے ان بتوں کو پاش پاش کر ڈالا آپ نے قریش اور اکابر ملت کی شدید مخالفت کے باوجود تقسیم بالسویہ کا دستور جاری فرمایا اور اس طرح معاشی مساوات کے اس نظریہ کو جسے آج ساری دنیا اپنانا چاہتی ہے لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو رہی ہے اپنی پوری مملکت میں نافذ فرما دیا۔ آپ نے عرب و عجمی امتیازات کا بھی خاتمہ کر دیا اور اس طرح مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں حقیقی مساوات قائم فرما دی۔

معاشی اور معاشرتی مساوات کا قیام اس دور میں کوئی آسان کام نہیں تھا اس کے نتیجے میں آپ کو اشراف قریش سے زبردست ٹکر لینا پڑی لیکن ایک عظیم اصلاح کی خاطر آپ نے کسی مخالفت کی پرواہ نہیں کی اور اپنے اصلاحی مقاصد کو عملی شکل دینے میں کامیاب ہو گئے یہ آپ کی بے پناہ قائدانہ صلاحیتوں کا ایک بے نظیر مظاہرہ تھا اس لئے کہ ایک ایسی قوم جو امتیازات کی عادی ہو چکی تھی اپنا نظم و ضبط کھو چکی تھی اور جس میں رجعت پسند عناصر زبردست اثرات کے مالک تھے اتنی بڑی اصلاح کے وجود میں لے آنا (جو آج کی ترقی یافتہ حکومتوں کے لئے ایک خواب کی حیثیت رکھتی ہے) انتہائی مشکل کام تھا آپ نے اس باب میں قیادت کی ایسی بلند پایہ صلاحیتوں کا مظاہرہ فرمایا جنہیں معجزہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ سماجی اور معاشی اصلاحات کے میدان میں آپ نے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کی مثال آج تک دنیا پیش کرنے سے قاصر رہی ہے۔

امیرالمومنینؑ کی ان عظیم اصلاحات کی حقیقی قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب ہم ان حالات پر ایک نظر ڈالتے ہیں جن سے آپ کا سابقہ تھا ساڑھے چار سال کی مختصر سی مدت حکومت اور پھر اس میں بھی متواتر لڑائیاں، پر آشوب حالات، قریش کے باغیانہ تیور، شامیوں کی یورش، خوارج کی جنگ آزمائی، زر پرستی کا زور، جہل اور دنیا داری، غرض حالات ایسے تھے جن میں کسی اصلاحی اقدام کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی لیکن یہ تھا کمال قیادت کہ آپ نے ان حالات میں بھی وہ کر دکھایا جو آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی حکمرانوں سے ممکن نہیں ہو رہا ہے۔ سماجی اور معاشی مساوات کی باتیں تو دنیا میں بہت ہوتی ہیں لیکن آج تک یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا لیکن امیرالمومنینؑ نے بغاوتوں اور ہنگاموں کے دور میں بھی اس خواب کو حقیقت بنا دیا تھا جو آپ کی قائدانہ صلاحیتوں کا اعجاز آفرین نمونہ ہے۔

خلافت حاصل ہوتے ہی آپ نے مدینہ میں امن قائم کر دیا اور بلوائی منتشر ہو گئے۔ مدینہ والوں کو سکون میسر ہوا تو قریش کے مفاد پسند قائدین کی جان میں جان آئی گمشدہ حواس درست ہوئے اب جو انھوں نے دیکھا تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی خلافت اس شخص کے ہاتھوں میں تھی جو ان کے قبائلی مفادات کا علمبردار نہیں تھا جس کی حکومت ان کی زراندوزی کی مہم میں معاون نہیں ہو سکتی تھی جو ان کو بغیر عمل، فضائل و مناقب کا مستحق ماننے پر تیار نہیں تھا۔ جو ان کی شان میں گھڑی ہوئی احادیث پر ایمان لا کے ان کو عوام کی دولت سے کھیلنے کا موقع نہیں دے سکتا تھا جو ان کو نسب کی بنیاد پر مستحق حکومت تسلیم نہیں کرتا تھا جو محض خاندانوں کی بنا پر ان کی شرافت یا امارت یا ارستقراطیت کا قائل نہیں تھا جو ان کو عجمیوں اور موالیوں سے بدتر قرار دینے پر تیار نہیں تھا بلکہ سب

مسلمانوں کو مساوی حقوق عطا کرنے پر مصر تھا جو ان کی زراندوزی، شان و شوکت، محلات کی تعمیر اور نمائش دولت کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ دولت کے معاملہ میں سارے مسلمان برابر ہو جائیں جو صرف قریش کو صوبوں کی گورنری اور جاگیروں کا مستحق ماننے پر تیار نہیں تھا اور جس کی حکومت باقی رہنے کے معنی یہ تھے کہ قریش نے ابتدائی تین حکمرانوں کے دور میں جو کچھ حاصل کیا تھا عوام کو افلاس اور جہل میں مبتلا کر کے جو کچھ پایا تھا وہ سب ختم ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال قریش کے لئے ناقابل برداشت تھی ان کے لئے یہ تصور بھی موجب تکلیف تھا کہ اب عجم اور موالی بھی ان کے ہم پلہ قرار دیئے جائیں گے یہ ان کے نسبی غرور کے منافی تھا۔ پھر ان کے تاجرانہ مفادات کے لئے حددرجہ خطرہ پیدا ہوگیا اس لئے انہوں نے یہ چاہا کہ جس طرح بھی ممکن ہو اپنا اقتدار بازیاب کیا جائے اپنی لٹی ہوئی مسند قیادت دوبارہ بچھائی جائے اور وہ حکومت قائم کی جائے جو ان کے نسبی اور تاجرانہ مفادات کی حفاظت کا فریضہ انجام دے سکے بدقسمتی سے ان کو اپنی اس تحریک بازیابی اقتدار کی حمایت و سرپرستی کے لئے حضرت عائشہ مل گئیں جوایک شدید جذباتی خاتون تھی اور حضرت علی سے اس لئے لئے دشمنی رکھتی تھیں کہ:۔

۱۔ آپ حضرت خدیجہ کے دلماد تھے اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت خدیجہ کی تعریفیں کیا کرتے تھے اس لئے حضرت عائشہ نے خود اس کا اعتراف فرمایا ہے کہ آپ کو ان سے سخت جلن ہوگئی تھی۔

۲۔ آپ رسول اللہؐ کو حددرجہ محبوب تھے اور یہ چیز حضرت عائشہ کو حددرجہ ناگوار تھی اس لئے کہ موصوفہ یہ چاہتی تھیں کہ آپ ہی رسول اللہؐ کی تمام تر توجہات کا مرکز رہیں۔ چونکہ آپ کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی اور سرور

کائنات صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی سے محبت فرماتے تھے اس لئے آپ کو حضرت علی سے شدید دشمنی ہو گئی تھی۔

۳۔ حضرت عائشہ یہ بھی جانتی تھیں کہ حضرت علیؓ کی حکومت میں آپ کو بارہ ہزار درہم کا وہ بھگر انقدر وظیفہ حاصل ہونا ناممکن ہے جو حضرت عمر نے آپ کے لئے مقرر کر دیا تھا۔

۴۔ حضرت عائشہ میں اقتدار پسندی کا جذبہ بے حد تھا اور دوسرے خلفاء کے زمانہ میں آپ کی جس انداز میں ناز برداری ہوتی رہی تھی اس نے اس میں کافی اضافہ کر دیا تھا نمود اور برتری کے جذبات بھی آپ میں کافی پائے جاتے تھے چنانچہ نمود کے جذبہ کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ کتب احادیث میں جتنی احادیث آپ سے مروی ہیں دوسری امہات المومنین تو رہیں الگ، کسی صحابی سے بھی مروی نہیں ہیں، امیرالمومنینؑ کی حکومت میں آپ کے اس جذبہ نمود کے اظہار کا کوئی موقع نہیں ہو سکتا تھا اس لئے کہ آپ لازماً موصوفہ پر یہ اصرار فرماتے کہ وہ حرم رسولؐ کی حیثیت سے خاموشی کی زندگی بسر فرمائیں ظاہر ہے کہ یہ چیز بھی آپ کی بے چین فطرت پر ایک بار تھی اور اس کی وجہ سے بھی آپ حضرت علیؑ کی مخالفت پر مجبور تھیں۔

۵۔ آپ میں بدقسمتی سے ہنگامہ پروری کا مادہ بھی کافی تھا جس کا مظاہرہ حیات رسولؐ میں بھی کافی ہو چکا تھا حضرت عثمان کی خلاف "اقتلوا نعثلا" کے نعرے آپ کی اس فطرت کا صاف پتہ دیتے ہیں۔

سرداران قریش نے آپ کی فطرت کا صحیح اندازہ لگاتے ہوئے آپ کو "قریش کی قیادت" پیش کر دی۔ ایک اقتدار پسند جذباتی عورت کو اتنا بڑا "رتبہ"

حاصل ہو رہا ہو تو وہ کیا کچھ نہ کر ڈالے گی؟ چنانچہ آپ بھی اس جذباتی کمزور کا شکار ہو گئیں اور اللہ، رسولؐ اور قرآن کے فرمان کو بھول کر قریش کے لشکر کی سردار بن گئیں۔

قریش کی بزدلی، موقع پرستی اور تاجرانہ ذہنیت کا اس سے بدتر مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ عشرہ مبشرہ کے محترم ارکان نے محض اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل کے لئے نہ صرف یہ کہ حرم محترم رسولؐ کو میدان جنگ میں کھڑا کر دیا بلکہ عرب کے سورماؤں نے ایک عورت کی قیادت قبول کرلی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ۔

۱۔ سرداران قریش یعنی طلحہ اور زبیر وغیرہ کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ عوام ان کا ساتھ نہیں دیں گے اس لئے وہ حرم رسولؐ کے نام پر عوام کا تعاون حاصل کرنا چاہتے تھے۔

۲۔ یہ لوگ اپنی مطلب برآری کے لئے انتہائی نچلی سطح تک اتر سکتے تھے کہ حرم رسولؐ کا احترام بھی خاک میں ملا دیں۔

۳۔ ان میں یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ خود امیرالمومنینؑ کے مقابلہ میں کھڑے ہوں اس لئے انھوں نے حرم رسولؐ کو اپنی بزدلی کا پردہ قرار دیا تھا۔

۴۔ یہ لوگ محض حصول خلافت کے لئے حرم رسولؐ کی عزت تک بیچنے سے دریغ نہیں کرتے تھے اور اپنے نفع کے لئے پیغمبر اسلامؐ کی حرمت تک سے کھیلنے کی جسارت کر سکتے تھے۔

قریش کے روبہ انحطاط کو بازیاب کرنے اور مہاجرین کے ہاتھوں میں اختیارات حکومت مرکوز رکھنے کی یہ آخری کوشش تھی جو کی گئی لیکن جمل کے میدان میں یہ کوشش ناکام بنادی گئی طلحہ اور زبیر مارے گئے اور اس طرح

مہاجرین اور قریش کی قوت اور ان کے اقتدار کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

قریشی قیادت کی ناکامی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ محض پچیس سال کے اندر قریش کا مفاد پسند طبقہ اس حکومت اور اقتدار سے محروم ہو گیا جو اسے سقیفہ بنی ساعدہ کے سازشی ماحول نے عطا کر دیا تھا اور وہ مذہبی اثرات بھی جو صحابیت، مہاجرت، قرشیت اور وضعی احادیث نے اسے عطا کر دیئے تھے اس کے گرتے ہوئے اقتدار کو بحال نہ کر سکے قریش کا یہ زوال دراصل نتیجہ تھا ان کے قائدین کی بے بصیرتی اور عدم تدبر کا اور مذہبی عقیدت چاہے ان بزرگوں کی مدح میں کتنے ہی افسانے تراش دے لیکن اس تلخ اور بھیانک حقیقت سے انکار محال ہے کہ جس حکومت کو مذہب فتوحات دولت نسب غرض ہر قسم کے اثرات حاصل تھے وہ ایک مختصر سی مدت میں ختم ہو گئی اس زوال کی ذمہ داری ظاہر ہے کہ قریش کے سکہ بند طبقہ پر ہے ان حضرات پر ہے جن کو قریش نے زمام حکومت تفویض کی تھی اور چاہے یہ بات عقیدت کی رو میں بہنے والوں کو کتنی ہی گراں کیوں نہ محسوس ہو لیکن یہ حقیقت بہرحال حقیقت رہے گی کہ قریش کے فرمانروا سیاسی اعتبار سے اتنے کوتاہ بین اتنے تنگ نظر اتنے ناتجربہ کار اور اتنے خامکار ثابت ہوئے کہ وہ اس حکومت کو بڑی آسانی سے اور بہت کم مدت میں کھو بیٹھے جسے حاصل کرنے کے لئے انہوں نے احکام رسالت کو اور جسے بازیاب کرنے کی آخری کوشش میں انہوں نے احترام حرم رسالت کو بھی پس پشت ڈال دیا تھا۔

قریش کے مفاد پسند طبقہ کا سب سے بڑا "کارنامہ" یہ تھا کہ اس نے امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کو سقیفہ بنی ساعدہ کی سازش کے نتیجہ میں ایوان حکومت سے دور کر دیا لیکن اس کش مکش کا جو سقیفہ میں شروع ہوئی تھی خاتمہ اس طور پر ہوا کہ بالآخر حکومت امیرالمومنینؑ کے ہاتھوں میں آ کر رہی اور جمل

ہے کے میدان میں خود ان علیؑ کے ہاتھوں قریش کے مفاد پسند گروہ کے اقتدار کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا جن سے حکومت چھین لینے پر یہ طبقہ نازاں تھا۔

جمل کے میدان میں امیرالمومنینؑ کی فتح محض طلحہ و زبیر کے مقابلہ میں نہیں تھی بلکہ دراصل یہ فتح تھی مفاد پسندوں کی اس ساری ٹولی کے مقابلے میں جس نے اپ کو حکومت اسلامی سے دور رکھنے کی سازش کر رکھی تھی جمل کے میدان میں آپ نے قریشی اکابر کے اس گروہ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی اور اسے ایسی شکست فاش دی کہ اس کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے اور اینده بھی اس کے ابھرنے یا اسلامی سیاست پر حاوی نے کا امکان ختم ہو گیا۔

جنگ جمل اس اعتبار سے امیرالمومنینؑ کی زندگی کا ایک انتہائی فیصلہ کن معرکہ کہی جاسکتی ہے اور ان لوگوں کا ایک مسکت جواب ہے جو سقیفہ بنی ساعدہ کے پیدا کیے ہوئے حالات کے نتیجہ میں اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں کہ امیرالمومنینؑ کو مفاد پسند قریشیوں کے مقابلہ میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا واقعہ یوں ہے کہ سقیفہ میں جو "جنگ" چھڑی تھی وہ اسی دن ختم نہیں ہو گئی تھی یہ "جنگ" برسوں جاری رہی۔ متعدد "مورچے" قائم ہوتے رہے اور ان میں میں امیرالمومنینؑ نے حکمت ربانی کے امین کی حیثیت سے ہر موقع پر اپنے مخالفین کو شکست دی یہ ضرور ہے کہ آپ نے سقیفہ کے فیصلہ کے وقت قریش کے مقابلہ میں تلوار بے نیام نہیں کی لیکن صاحب عقل اس حقیقت کو جانتا ہے کہ دانشمند جرنیل موقع محل دیکھ کر تلوار کھینچتے ہیں بے موقع نمائش شمشیر نہیں کیا کرتے سقیفہ کے فیصلہ کے وقت تلوار کھینچنے کا مقصد ہوتا۔ اسلام کو ختم کر دینا اس وقت قریش کو شکست نہیں ہوتی اسلام کو شکست ہوتی اور امیرالمومنینؑ کا مقصد اسلام کو شکست دینا نہیں تھا مفاد پسندوں اور جاہ طلبوں کو شکست دینا تھا ایسی حالت میں

اپ اس وقت چپ رہے اسلام مستحکم ہو گیا غیر ممالک تک اسلام کی روشنی پھیل گئی دین کے لئے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا تو شمشیر حیدری اسی شان سے قریش کے مفاد پسندوں کے مقابلہ میں چمکی جس آب و تاب سے کفار قریش کے مقابلہ میں چمک چکی تھی یہ صحیح ہے کہ بعض مخصوص شخصیتیں سامنے نہیں تھیں لیکن سوال شخصیتوں کا بھی نہیں مقابلہ جو کچھ تھا وہ ایک مخصوص طبقہ ایک مخصوص مفاد کے لوگوں سے تھا۔ وہ طبقہ آج بھی موجود تھا اور شاید سقیفہ کے مقابلہ میں زیادہ طاقت کے ساتھ موجود تھا اس لئے کہ اب اسے فتوحات کی شوکت بھی حاصل تھی سیم و زر کی قوتیں بھی نصیب تھیں ماضی کا جاہ و جلال بھی اس کی پشت پر تھا عساکر کی منظم طاقت بھی موجود تھی حرم رسولؐ کا وقار بھی ساتھ تھا اور اس کے مقابلہ میں علیؑ ظاہری طور پر زیادہ کمزور بھی ہو چکے تھے رسولؐ کے انتقال کو عرصہ ہو چکا تھا اس لئے امیرالمومنینؑ کو رسول اللہؐ کے فرمودات سے جو مدد سقیفہ کے وقت مل سکتی تھی اس کا آج امکان نہیں تھا ان کے فضائل پر پردے ڈالے جا چکے تھے ان کو گمنامی کے اندھیرے میں پھینکنے کی تمام تدابیر بھی عمل میں لائی جا چکی تھیں اور سیاسی حیثیت سے ان کو ختم کر دینے کے جتنے حربے ممکن تھے وہ سب استعمال ہو چکے تھے لیکن امیرالمومنینؑ کے تدبر اور قیادت کا کمال تھا کہ اپ نے جنگ اور فیصلہ کن معرکہ کے لئے ایسے وقت کا انتخاب کیا جب حریف کو مکمل شکست کا سامنا کرنا پڑا اور قریش ایسے ہارے کہ ان کے اقتدار کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

جو لوگ سقیفہ بنی ساعدہ کے موقع پر امیرالمومنینؑ کی خاموشی پر نام دھرتے ہیں ان کو یہ دیکھنا چاہئے کہ ۱۱ھ کی خاموشی نے ۳۵ھ میں کیا رنگ دکھایا اور کس طرح امیرالمومنینؑ کے ہاتھوں قریش کی اس جماعت کا خاتمہ ہو گیا جو ۱۱ھ میں

کوس لمن الملک بجاتی نظر آرہی تھی اگر امیرالمومنینؑ سقیفہ کا فیصلہ سامنے آتے ہی اس گروہ کے مقابلہ میں شمشیر بکف ہوجاتے تو نہ صرف یہ کہ اسلام کا خاتمہ ہوجاتا بلکہ آپ اور آل رسول کے سارے افراد قتل ہوجاتے۔ ظاہر ہے کہ ایک عقل مند جرنیل ایسے وقت میں نہیں لڑتا جب اس کی شکست یقینی ہو۔ اسے جنگ نہیں کہا جاتا خودکشی کہا جاتا ہے۔ امیرالمومنینؑ ایک عقل مند جرنیل کی حیثیت سے خودکشی نہیں کرسکتے تھے آپ نے ایسی حالت میں یہی مناسب جانا کہ صحیح وقت کا انتظار کیا جائے جمل کے میدان میں یہ وقت آگیا۔ لڑائی اللہ سے لب تک جاری تھی، یہ اور بات ہے کہ یہ "سرد جنگ" تھی تیغ و تفنگ کی جنگ نہیں تھی ۳۵ھ میں موقع ملتے ہی تلوار کی جنگ بھی لڑی گئی اور اس کا جو نتیجہ ہوا وہ دنیا کے سامنے ہے۔

قریش کا مقصد تھا علیؑ کو خلافت ظاہری سے دور رکھ کر حکومت پر اقتدار قائم رکھنا۔ دنیا نے اس نتیجے کے برعکس دیکھا۔ حکومت علیؑ کو مل کر رہی اور سلطنت اسلامی مدینہ کے قریش اکابرین کے ہاتھوں سے ہمیشہ کے لئے نکل گئی۔ ایسی حالت میں قریش ہارے اور علیؑ جیتے۔ سرد جنگ میں علیؑ اس طرح کے ہزاروں جوڑ توڑ کے باوجود خلافت حاصل کر کے رہے اور شمشیر و تبر کی جنگ میں اس طرح جیتے کہ قریش کے دوبارہ ابھرنے کا امکان ہی ختم ہوگیا۔ اس سے زیادہ شاندار فتح اور کیا ہوسکتی ہے؟

جنگ جمل دراصل اس جنگ کا نقطہ عروج کہی جاسکتی ہے جو رسول اللہؐ کے دنیا سے پردہ کرتے ہی اکابر قریش اور امیرالمومنینؑ کے درمیان چھڑ گئی تھی اور اس آخری فیصلہ کن جنگ میں فتح کا سرہ امیرالمومنینؑ کے سر رہا اور کیوں نہ ہو۔ انا فتحنا لک فتحا مبینا کا تاج مامور من اللہ قائدین کے سروں پر جگمگانے کے

لئے ہی قدرت نے تیار کیا ہے اور علیؑ چونکہ مامور من اللہ قائد تھے اس لئے یہ فتح مبین ان کو اصل ہونا ہی چاہئے تھی۔ یہ ان کا قرآنی حق تھی اور اللہ کا مقرر کیا ہوا حق مل کے رہتا ہے۔

جنگ جمل میں قریش کے مفاد پرست طبقہ کا خاتمہ ہوگیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد اسلام کو ایک اور داخلی فتنہ کا سامنا کرنا پڑا اور وہ تھا "فرقہ خوارج کا ظہور"

بظاہر تو خوارج کا ظہور ایک وقتی سوال کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ پچیس سال میں حکمران طبقہ نے جو روش اختیار کی تھی اس کے نتیجہ میں مسلم عوام میں جہالت عام ہوگئی تھی ان میں فہم قرآن کا صحیح شعور باقی نہیں رہا تھا ان کو کتاب الہٰی کی تعلیم دینے والوں سے دور رکھا گیا تھا اور ان میں وہ "دینی طوائف الملوکی" یا مذہبی انتشار پیدا کردیا گیا تھا جس کے نتیجہ میں ہر جاہل اپنے آپ کو مفسر قرآن اور شارح دین تصور کرنے لگا تھا ان کے دماغوں سے یہ احساس گم کردیا گیا تھا کہ قرآن کی تفسیر و تشریح صرف ان لوگوں کا حق ہے جن کو قدرت نے والراسخون فی العلم کا لقب عطا کرکے خاص اسی امر کے لئے مامور فرمایا ہے ان کو یہ یقین پیدا کردیا گیا تھا کہ قرآن اور دین کے مفاہیم صرف آل رسولؐ یا صحابہ متقین سے معلوم کرنے کا خیال بے سود ہے اور ان کے ذہنوں میں یہ عقیدہ پیدا کردیا تھا کہ ہر کس و ناکس کو قرآن دین اور شریعت کے باب میں ہر فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے یہ تدبیر محض اس لئے اختیار کی گئی تھی کہ لوگ آل رسولؐ کو بھول جائیں قرآن و شریعت کی تعلیم کے لئے ان مامورین من اللہ کی جانب رخ کرنا چھوڑ دیں اور آل رسولؐ اتنی گمنام ہوجائے کہ پھر حکومت وقت کو اس سے کوئی خطرہ باقی نہ رہے

خود حکام وقت کا یہ عالم تھا کہ وہ دین اور قرآن کی تشریح و تفسیر کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اور مختلف واقعات اس کے شاہد ہیں کہ وہ خالص علمی مسائل کے باب میں بالکل کورے ثابت ہوئے تھے اس لئے ان کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ دینی اور قرآنی مسائل میں اپنی ذات کو مسلمانوں کی توجہ کا مرکز قرار دینے اور خلیفہ وقت کی ذات کو تفسیر و تشریح قرآن کا مرکز قرار دے کر دینی مسائل میں مرکزیت باقی رکھتے ایسی حالت میں انھوں نے یہ رخ اختیار کیا کہ سیاسی مسائل اور حقوق حکمرانی تو خلیفہ کی ذات میں مرکوز رہیں اور دینی مسائل میں مسلمان "آزاد" چھوڑ دیئے جائیں۔ ہر مسلمان کو دین اور قرآن کے معاملہ میں اپنی رائے ظاہر کرنے اور اپنی عقل یا پسند کے مطابق آیات قرآنی کی تفسیر کرنے کا حق دے دیا جائے اور اس کا جواز اس امر میں تلاش کرلیا گیا تھا کہ سارے مسلمان صحابی ہیں اور چونکہ ہر صحابی کا عادل اور مجتہد ہونا ضروری ہے اس لئے صحابہ دین یا قرآن کے باب میں جو فیصلہ کریں وہ حق ہوگا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منصب خلافت کے ذریعہ تعلیم دین کے سلسلہ میں جو مرکزیت قائم کرنا مقصود شارح تھا اس کا خاتمہ ہوگیا اور مذہبی مسائل میں مطلق العنانی کا رواج عام ہوگیا یہ تو صحیح ہے کہ اس تدبیر کے نتیجہ میں آل رسولؐ کے مامور من اللہ اور معصوم معلمین قرآن سے حصول دین کا دروازہ بڑی حد تک بند ہوگیا اور مسلمانوں کا سواد اعظم آل رسولؐ سے بیگانہ ہوگیا لیکن وہ تدبیر جو محض ایک سیاسی غرض سے اختیار کی گئی تھی اس کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ:۔

ا۔ دین اور قرآن کے باب میں ہر کس و ناکس کو اپنی رائے ظاہر کرنے اور اپنی عقل یا پسند کے مطابق دین اور قرآن کے مفاہیم متعین کرنے کا حق حاصل ہوگیا جس کا لازمی نتیجہ فرقہ بندیوں کی شکل میں برآمد ہوا جس نے

جو چاہا اسلام کا ایک نیا مفہوم متعین کر دیا جو دل میں آیا وہ قرآن کی تفسیر کر دی اور اسی کے نتیجہ میں مسلمان سینکڑوں فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔

۲۔ مذہب کے باب میں کسی مرکزی ضرورت کا احساس ختم ہو گیا۔

۳۔ خلافت صرف بادشاہت رہ گئی جس کا مذہب سے بس اتنا تعلق رہ گیا کہ سلطان وقت مذہب کے نام سے فائدہ اٹھا کر عوام پر اپنی حکومت قائم رکھے اور دین کے نام سے ان کے گردنوں پر اپنی غلامی کا جوا لادے رہے۔

۴۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب سلاطین کا کھلونا اور شخصی حکومت کا آلہ کار بن کر رہ گیا چنانچہ جب عوام میں احساس حریت ابھرا تو انہوں نے جہاں خلافت کا خاتمہ کر دیا وہیں مذہب کو سلطنت اور سیاست ملکی سے بے دخل کر دیا اس لئے کہ ان کا تجربہ اس کا شاہد تھا کہ مذہب صرف چند افراد کی حکومت باقی رکھنے کا وسیلہ ہوتا ہے اور اس طرح عوام کی آزادی کے خلاف ایک بہت بڑا حربہ ہوا کرتا ہے۔

بہرحال قرآن کے باب میں عوام میں جو مطلق العنانی پیدا کر دی گئی تھی اسی کا ایک لازمی اور فطری نتیجہ وہ تھا جو خوارج کے ظہور کی شکل میں برآمد ہوا اور ایک حکم قرآنی کی توجیہ و تشریح کے نام پر مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ گمراہی و ضلالت کا شکار ہو گیا خوارج کو اس پر اصرار تھا کہ لاحکم الا للہ کی جو تشریح و تفسیر وہ کر رہے ہیں اسے تسلیم کر لیا جائے اور چاہے ان کی بیان کردہ تفسیر کتنی ہی مہمل کیوں نہ ہو مگر خلیفہ وقت کے سامنے سر جھکا دے اس لئے کہ قرآن کی تفسیر بالرائے ہر مسلمان کا پیدائشی حق ہے اور خلیفہ وقت چونکہ صرف ایک فرد کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی ایسی رائے کی جو ہر مسلمان قرآن کے باب میں ظاہر کر رہے ہوں مخالفت کرے۔ خوارج نے یہ نظریہ

دراصل اس دینی انتشار اور لامرکزیت کے نتیجہ میں قائم کیا تھا جو ابتدائی تین خلافتوں میں پیدا کردی گئی تھی اور جس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ امیرالمومنینؑ کے دور میں کچھ مسلمانوں نے گمراہی کی راہ اختیار کی بلکہ یہ فتنہ آج تک باقی ہے اور تاریخ میں ہمیشہ باقی رہا ہے جس شخص کا جو جی چاہتا ہے وہ قرآن کا مفہوم قرار دے دیتا ہے اور پھر چند مقلد پیدا کر کے مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ پیدا کر دیتا ہے۔

خوارج کا ظہور ہو یا بعد کی فرقہ بندیاں، سب دراصل اسلام کا مرکز علمی و روحانی برباد ہو جانے کا نتیجہ ہیں جسے سقیفہ کی محفل میں ختم کیا گیا تھا اگر خلافت کو شریعت کا مرکز باقی رکھا جاتا اگر قرآن و سنت کی تشریح و تفسیر صرف مامور من اللہ خلیفہ تک محدود رکھی جاتی اور اس مرکز روحانی کو برباد نہ کیا جاتا تو اسلام مختلف فرقوں میں تقسیم نہ ہوتا لیکن برا ہو حرص سلطنت اور جذبہ حکومت کا کہ محض چند روزہ بادشاہت کی خاطر شریعت کی مرکزیت ختم کردی گئی اور یک ایسا فتنہ کھڑا کردیا گیا جس کا خمیازہ مسلمانوں کو آج تک بھگتنا پڑا رہا ہے۔

امیرالمومنینؑ کو نہروان کے میدان میں خوارج سے جو جنگ کرنا پڑی وہ ایک بڑی اصولی جنگ تھی اس جنگ کا مقصد محض اتنا ہی نہیں تھا کہ ایک داخلی فتنہ کی سرکوبی کردی جائے بلکہ یہ جنگ دراصل اس اصول کے خلاف تھی کہ ہر کس و ناکس کو قرآن کا مفہوم متعین کرنے اور محض اپنی رائے سے دین کے اصول مقرر کرنے کا حق ہے امیرالمومنینؑ کا نقطہ نظریہ تھا کہ اسلام اور قرآن کی حقیقی تفسیر و تشریح کا حق صرف امام زمانہ کو ہے اور دین کی وحدت اور ملت کا نظم صرف اس طرح برقرار رہ سکتا ہے کہ احکام مذاہب کی تعلیم اور تشریح ایک مرکزی نظام کے تابع ہو۔ ہر شخص کو مذہب کے باب میں اپنی رائے نافذ کرنے اور اس طرح ملت

کو فرقہ بندیوں کا شکار کر دینے کا حق نہ ہو اور آپ کے مخالفین اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ ابتدائی تین حکمرانوں کی روش قائم رکھی جائے دین کے باب میں عمل مطلق العنانی کا رواج باقی رکھا جائے اور تفسیر بالرائے کی بدعت کو ایک دینی حقیقت تسلیم کرلیا جائے دوسرے الفاظ میں خوارج وہ لوگ تھے جو "سیرت شیخین" کے قیام پر مصر تھے اور اس طبقہ کی نمائندگی کر رہے تھے جو انتقال رسولؐ کے بعد آل رسولؐ کی مذہبی حیثیت کو ختم کرنے اور امیرالمومنینؑ کی روحانی اور دینی خلافت و جانشینی کو سلب کرنے کے درپے تھا اس طرح نہروان کی جنگ جو بظاہر امیرالمومنینؑ اور خوارج کے مابین ہوئی دراصل دو متضاد نظریات کی جنگ تھی جس میں ایک طرف امیرالمومنینؑ تھے جو خلافت کو محض بادشاہت قرار دینے سے انکار کر رہے تھے اور اس پر مصر تھے کہ خلیفہ اسلام ہی تفسیر و تشریح قرآن کا حق رکھتا ہے نیز یہ خلافت ایک منصب دینی ہے جس کا مقصد حفظ و بقا و تعلیم و تشریح و اشاعت شریعت ہے اور دوسری طرف وہ طبقہ تھا جو خلافت کو مذہب سے الگ محض ایک سیاسی منصب تصور کرتا تھا یہ وہی جھگڑا تھا جو سقیفہ بنی ساعدہ کے نزد اٹھا تھا اور نہروان کے میدان میں امیرالمومنینؑ نے اسی کا فیصلہ تلوار سے کیا یہ صحیح ہے کہ جس طرح میدان جمل میں شخصیتیں بدلی ہوئی تھیں لیکن مقابلہ اسی طبقہ سے تھا جو امیرالمومنینؑ کو حکومت اور سیاست کے میدان میں شکست دینا چاہتا تھا اسی طرح نہروان میں بھی شخصیتیں بدلی ہوئی تھیں لیکن مقابلہ اسی طبقہ سے تھا جو مذہب کو خلافت سے الگ کر کے آل رسولؐ کی دینی حیثیت کو مجروح کرنا چاہتا تھا لہٰذا امیرالمومنینؑ کو جہاں اس طبقہ کے مقابلہ میں فتح ہوئی جو آپ کو حکومت سے دور رکھ کے خلافت اسلامی کو قریش کی زراندوزی کا وسیلہ بنانا چاہتا تھا وہیں آپ کو اس طبقہ کے مقابلہ میں فتح مبین نصیب ہوئی جو آپ کی علمی و

روحانی برتری پر پردہ ڈال کر مذہب کو عوام الناس کا کھلونا بنا دینا چاہتا تھا۔

سقیفہ بنی ساعدہ کے فیصلہ کے نتیجہ میں دو فتنے اٹھائے گئے:۔

۱۔ امیرالمومنینؑ کو سیاست اسلامی سے دور رکھ کر حکومت پر قریش کے مفاد پسند طبقہ کا اقتدار قائم کر دیا جائے۔

۲۔ آل رسولؐ کی دینی سیادت کا خاتمہ کر دیا جائے اور تعلیم و تشریح قرآن کا حق آل رسولؐ سے چھین کے عوام پر امیرالمومنینؑ کا جو مذہبی اثر ہے اسے زائل کر دیا جائے۔

امیرالمومنینؑ نے ان دونوں فتنوں کے خلاف صبر اور خاموشی سے کام لیا لیکن اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ آپ اپنے اور اسلام کے حقوق کی پامالی پر راضی ہو گئے تھے۔ آپ دراصل جنگ کے لئے مناسب وقت کی تلاش میں تھے چنانچہ جب وقت آیا تو جمل کے میدان میں آپ نے اس طبقہ کا خاتمہ کر دیا جو آپ کو سیاست کے میدان میں زک دینا چاہتا تھا اور نہروان کے میدان میں شمشیر بکف ہو کر آپ نے یہ ثابت کر دیا کہ آپ اس دینی مرکزیت اور خلافت روحانی کے استقرار کے لئے بھی جہاد واجب تصور کرتے تھے جسے قریش اپنے سیاسی اقتدار کی خاطر مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے۔

خوارج کے سلسلہ میں ایک اور چیز کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

خوارج کے فتنہ کا آغاز کا فوری سبب قضیۂ تحکیم تھا۔ بات یہ ہوئی لیلۃ الہریر کی جنگ میں جب امیر معاویہ کو فیصلہ کن شکست ہوتے نظر آئی تو انہوں نے اپنے مشیر خاص عمرو بن عاص کے مشورہ سے نیزوں پر قرآن بلند کیا کے امیرالمومنینؑ کے لشکر میں پھوٹ ڈال دی اور یہ نعرہ بلند کیا کہ:۔

"خلافت کا فیصلہ قرآن و سنت کے مطابق کیا جانا چاہیے"

ہم اس واقعہ کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتے لیکن اتنا ضرور عرض کرنا چاہتے ہیں کہ امیر معاویہ اور ان کے ساتھیوں نے ایک طرف اور امیرالمومنینؑ کو چوتھا خلیفہ ماننے والے عراقیوں اور عربوں نے دوسری طرف یہ بات مان لی کہ:۔

"خلافت کا فیصلہ نہ اجماع سے ہو سکتا ہے نہ نامزدگی سے یہ شوریٰ سے اور نہ تلوار سے' بلکہ خلافت کا صحیح اور سچا فیصلہ وہی ہو گا جو قرآن سے ہو اور جسے احادیث کی تائید حاصل ہو"۔

امیر معاویہ کے اس نعرہ پر لوگ یہ سمجھے کہ امیرالمومنینؑ ناکام ہوئے اور امیر معاویہ اور خوارج کامیاب' لیکن دراصل یہ نعرہ امیرالمومنینؑ کی بہت بڑی سیاسی اور اصولی فتح تھی اس لئے کہ اس نعرہ کو قبول کرنے والوں نے اصولاً" یہ مان لیا کہ:

۱۔ اجماع' نامزدگی اور شوریٰ کی اساس پر بننے والی حکومتیں ناجائز تھیں اس لئے کہ یہ قرآن و سنت کی بنیادوں پر قائم نہیں کی گئی تھیں بلکہ قریشی مفاد پسندوں کے موضوعہ اصولوں کی اساس پر وجود میں آئی تھیں۔

۲۔ اور خود امیر معاویہ اور بنی امیہ و بنی عباس و آل عثمان کی خلافتیں بھی ناجائز تھیں اس لئے کہ یہ قرآن و سنت کے بجائے قہر و غلبہ سے قائم ہوئی تھیں۔

یہ صحیح ہے کہ امیر معاویہ نے اس بہانہ سے جنگ بند کرا دی اور فیصلہ کن شکست سے بچ گئے لیکن اس معمولی سی کامیابی کی قیمت ان کو ادا کرنا پڑی۔ وہ بہت مہنگی تھی اس لئے کہ انہیں اپنے "ایمان" کا سودا کرنا پڑا۔ اور امیرالمومنینؑ کے لئے یہ سودا بہت اچھا تھا اس لئے کہ آپ کو تلوار کی ایک عارضی فتح سے تو ضرور ہاتھ دھونا پڑا لیکن شامیوں' عراقیوں اور عربوں سب نے یہ مان لیا کہ علیؑ

جس اصول خلافت کی خاطر لڑ رہے ہیں وہ صحیح ہیں اور ان کو خلافت سے محروم کرنے کے لئے قریش اور بنی امیہ کے خلافت سازوں نے جو "اصول" گھڑ لئے تھے وہ سراسر غلط اور باطل تھے۔

جملؔ اور نہروانؔ کے میدانوں میں وہ ہوا جو سقیفہ بنی ساعدہؔ کے بعد ہی ہوتا لیکن محض اسلام کی خاطر نہیں ہو سکا تھا — اور — دراصل سقیفہ کی جنگ تھی جو جملؔ اور نہروانؔ کے میدانوں میں فیصلہ کن انداز میں لڑی گئی اور اس میں امیرالمومنینؑ کو جو فتح مبین حاصل ہوئی وہ ناقابل انکار ہے۔

جمل اور نہروان کی فتوحات نے اسلامی دنیا سے فساد داخلی کا خاتمہ کر دیا اور اب صرف شامیوں کا معاملہ باقی رہ گیا جسے ہم اسلام کے لئے ایک بیرونی حملہ اور کا خطرہ قرار دیتے ہیں۔

اگر امیر معاویہ اور شامیوں کی جگہ عیسائیوں نے اسلامی سرحدوں پر حملہ کیا ہوتا تو یقیناً" امیرالمومنینؑ ان کو ایک یا دو لڑائیوں میں کچل دیتے۔ لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ یہاں مقابلہ اس امویت اور مسیحیت سے تھا جسے بنوک شمشیر پہلے سے ہی ردائے اسلام اوڑھنے پر مجبور کیا جا چکا تھا۔ ان لوگوں کے مقابلہ میں تلوار کی فتح بہت پہلے حاصل ہو چکی تھی؛ اب اسے دل کی فتح میں تبدیل کیا جانا ضروری تھا۔ جزیرۃ العرب کی شمالی مغربی سرحدوں پر شام کا علاقہ ایسی سیاسی اور جنگی اہمیت رکھتا تھا کہ اگر اسے دل سے مسلمان نہ بنا لیا جاتا تو صدر اسلام کے لئے ہمیشہ ایک خوفناک خطرہ باقی رہتا اس لئے کہ شام سے مدینہ کا راستہ بالکل کھلا ہوا ہے اور شام بحر روم کے ساحل پر واقع ہونے کے نتیجہ میں ہمیشہ مسیحی یورپ کی یلغار اور لشکر کشی کا نشانہ بن سکتا تھا۔ ایسی حالت میں تحریک اسلامی کا داعی اعظم شامیوں کے مقابلہ میں تلوار کی فتح پر مطمئن نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس فتح

جس اصول خلافت کی خاطر لڑ رہے ہیں وہ صحیح ہیں اور ان کو خلافت سے محروم کرنے کے لئے قریش اور بنی امیہ کے خلافت سازوں نے جو "اصول" گھڑ لئے تھے وہ سراسر غلط اور باطل تھے۔

جملؔ اور نہروانؔ کے میدانوں میں وہ ہوا جو سقیفہ بنی ساعدہؔ کے بعد ہی ہوتا لیکن محض اسلام کی خاطر نہیں ہو سکا تھا ــــ اور ــــ دراصل سقیفہ کی جنگ تھی جو جملؔ اور نہروانؔ کے میدانوں میں فیصلہ کن انداز میں لڑی گئی اور اس میں امیرالمومنینؑ کو جو فتح مبین حاصل ہوئی وہ ناقابل انکار ہے۔

جمل اور نہروان کی فتوحات نے اسلامی دنیا سے فساد داخلی کا خاتمہ کر دیا اور اب صرف شامیوں کا معاملہ باقی رہ گیا جسے ہم اسلام کے لئے ایک بیرونی حملہ اور کا خطرہ قرار دیتے ہیں۔

اگر امیر معاویہ اور شامیوں کی جگہ عیسائیوں نے اسلامی سرحدوں پر حملہ کیا ہوتا تو یقیناً" امیرالمومنینؑ ان کو ایک یا دو لڑائیوں میں کچل دیتے۔ لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ یہاں مقابلہ اس اموییت اور مسیحیت سے تھا جسے بنوک شمشیر پہلے سے ہی ردائے اسلام اوڑھنے پر مجبور کیا جا چکا تھا۔ ان لوگوں کے مقابلہ میں تلوار کی فتح بہت پہلے حاصل ہو چکی تھی؛ اب اسے دل کی فتح میں تبدیل کیا جانا ضروری تھا۔ جزیرۃ العرب کی شمالی مغربی سرحدوں پر شام کا علاقہ ایسی سیاسی اور جنگی اہمیت رکھتا تھا کہ اگر اسے دل سے مسلمان نہ بنا لیا جاتا تو صدر اسلام کے لئے ہمیشہ ایک خوفناک خطرہ باقی رہتا اس لئے کہ شام سے مدینہ کا راستہ بالکل کھلا ہوا ہے اور شام بحر روم کے ساحل پر واقع ہونے کے نتیجہ میں ہمیشہ مسیحی یورپ کی یلغار اور لشکر کشی کا نشانہ بن سکتا تھا۔ ایسی حالت میں تحریک اسلامی کا داعی اعظم شامیوں کے مقابلہ میں تلوار کی فتح پر مطمئن نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس فتح

کے نتیجہ میں شام میں ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف ایک نفرت موجود رہتی اور جب بھی کوئی مسیحی طاقت شام پر حملہ آور ہوتی تو مقامی آبادی نہ صرف یہ کہ مزاحمت نہ کرتی بلکہ اس کا ساتھ دے کر دشمنوں کے لئے مدینہ کا دروازہ کھول دیتی۔ ایک عدیم النظیر ماہر جنگ کی حیثیت سے امیرالمومنینؑ شام کے جغرافیائی محل وقوع اور اس سے پیدا ہونے والے عظیم مخطرات کو نظرانداز نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے آپ یہ ضروری تصور فرماتے تھے کہ شام کو مسلمانوں کا ایک مضبوط قلعہ بنا دیا جائے۔ اس سے ایک دوسرا فائدہ بھی تھا اور وہ یہ کہ شامیوں کے سچے دل سے مسلمان ہو جانے کے نتیجہ میں بحرروم کے ساحل پر واقع تمام یورپی اور افریقی ممالک پر مسلمانوں کا دبدبہ قائم ہو جاتا اور ان ممالک میں تبلیغ اسلام کی صورتیں پیدا ہو جانا یقینی تھا۔ سیاسی اعتبار سے شمالی افریقہ اور جنوبی یورپ مسلمانوں کے حلقہ اثر میں داخل ہو جاتے تھے اور اس سے مسلمان جو فائدہ اٹھا سکتے تھے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ تھے وہ سیاسی، حربی اور تبلیغی مسائل جو شامیوں سے مقابلہ کے وقت امیرالمومنینؑ کے سامنے تھے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس باب میں امیرالمومنینؑ کی رائے یا آپ کی سیاست غلط تھی۔ یہ صحیح ہے کہ دلوں کی یہ فتح کافی عرصہ میں حاصل ہوئی اور اس کے لئے آل رسولؐ کو عظیم قربانیاں دینا پڑیں لیکن اس فتح کے جو شاندار نتائج مرتب ہوئے وہ تاریخ کے کسی طالبعلم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ دلوں کی اس عجیب و غریب فتح کے لئے :-

۱۔ امیرالمومنینؑ کو جنگ کو طول دینا پڑا تاکہ اول تو شامیوں کی آتش انتقام سرد پڑ جائے۔ دوسرے وہ آل رسولؐ کے کردار کا مطالعہ کر کے اسلام سے مانوس ہو جائیں اور تیسرے اسلام کو مٹانے کا نعرہ حصول خلافت کے نعرہ میں تبدیل ہو جائے۔

کے نتیجہ میں شام میں ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف ایک نفرت موجود رہتی اور جب بھی کوئی مسیحی طاقت شام پر حملہ آور ہوتی تو مقامی آبادی نہ صرف یہ کہ مزاحمت نہ کرتی بلکہ اس کا ساتھ دے کر دشمنوں کے لئے مدینہ کا دروازہ کھول دیتی۔ ایک عدیم النظیر ماہر جنگ کی حیثیت سے امیرالمومنینؑ شام کے جغرافیائی محل وقوع اور اس سے پیدا ہونے والے عظیم خطرات کو نظرانداز نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے آپ یہ ضروری تصور فرماتے تھے کہ شام کو مسلمانوں کا ایک مضبوط قلعہ بنا دیا جائے۔ اس سے ایک دوسرا فائدہ بھی تھا اور وہ یہ کہ شامیوں کے سچے دل سے مسلمان ہو جانے کے نتیجہ میں بحر روم کے ساحل پر واقع تمام یورپی اور افریقی ممالک پر مسلمانوں کا دبدبہ قائم ہو جاتا اور ان ممالک میں تبلیغ اسلام کی صورتیں پیدا ہو جانا یقینی تھا۔ سیاسی اعتبار سے شمالی افریقہ اور جنوبی یورپ مسلمانوں کے حلقہ اثر میں داخل ہو جاتے تھے اور اس سے مسلمان جو فائدہ اٹھا سکتے تھے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ تھے وہ سیاسی، حربی اور تبلیغی مسائل جو شامیوں سے مقابلہ کے وقت امیرالمومنینؑ کے سامنے تھے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس باب میں امیرالمومنینؑ کی رائے یا آپ کی سیاست غلط تھی۔ یہ صحیح ہے کہ دلوں کی یہ فتح کافی عرصہ میں حاصل ہوئی اور اس کے لئے آل رسولؐ کو عظیم قربانیاں دینا پڑیں لیکن اس فتح کے جو شاندار نتائج مرتب ہوئے وہ تاریخ کے کسی طالبعلم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ دلوں کی اس عجیب و غریب فتح کے لئے:۔

۱۔ امیرالمومنینؑ کو جنگ کو طول دینا پڑا تاکہ اول تو شامیوں کی آتش انتقام سرد پڑ جائے۔ دوسرے وہ آل رسولؐ کے کردار کا مطالعہ کرکے اسلام سے مانوس ہو جائیں اور تیسرے اسلام کو مٹانے کا نعرہ حصول خلافت کے نعرہ میں تبدیل ہو جائے۔

۲۔ امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کو "خلافت" یعنی بادشاہت عطا کر کے شامیوں کو ظاہری مسلمان بنے رہنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کی وہ نسل جسے جبراً مسلمان بنایا گیا تھا اور جو بظاہر مسلمان لیکن بباطن "مسیحی" تھے، ختم ہو گئے اور وہ نئی نسل وجود میں آگئی جس کا تثلیث یا مسیحیت سے کوئی واسطہ نہیں تھا جس نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف اسلام ہی اسلام کو دیکھا تھا۔ (یہ اور بات ہے کہ اس کے سامنے اسلام کا اموی روپ ہی تھا) اور جس کے دل میں عربوں کے خلاف سیاسی عناد تو ہو سکتا تھا لیکن مذہبی عناد کا وجود ناممکن تھا۔

۳۔ شامیوں کی اس پروردہ امویت مسلمان نسل کو حقیقی اسلام کے مطالعہ کا ذوق پیدا کرانے کے لئے کربلا کی عظیم الشان قربانی پیش کی گئی تاکہ وہ شامی جو بنی امیہ کی شاہی کو اسلام سمجھتے تھے اور جن کو اصل اسلام سے بے خبر رکھنے میں حکومت وقت نے اپنی پوری قوتیں صرف کر دی تھیں۔ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ "بنی امیہ کے اسلام" سے الگ بھی کوئی ایسا "اسلام" موجود ہے جس کے لئے آل رسولؐ ایسی حیرتناک قربانی دے سکتی ہے۔ واقعہ کربلا نے شامیوں کے مردہ ضمیر کو جھنجوڑا، ان کے دل ہلا دئے اور ان کو "حقیقت" معلوم کرنے پر مائل کر دیا۔

۴۔ امام زین العابدین علیہ السلام اور آل رسولؐ کی مظلوم خواتین نے شامیوں کے دلوں کو موم کر دیا۔ حقیقت ان پر واضح کر دی گئی، ان کو اسلام حقیقی سے روشناس کرا دیا گیا اور اہل بیتؑ کے لٹے ہوئے قافلے نے شام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا۔ "دلوں کی فتح" مکمل کر لی گئی اور وہ کام جو ۴۰ھ میں امیر المومنینؑ نے نامکمل چھوڑا تھا۔ ۶۱ھ میں اس

طرح تکمیل تک پہنچا دیا گیا۔ وہی شام جو عہد امیرالمومنینؑ میں اسلام کے لئے سب سے بڑا فتنہ بن کر نمایاں ہوا تھا آج چودہ سو سال بیت جانے کے بعد بھی مسلمانوں کی عزت و شوکت کا ایک مرکز تسلیم کیا جاتا ہے۔ آل رسولؐ کے اسیروں نے شام کو اسلام کے لئے اس شان سے فتح کیا کہ بنی امیہ کے انتہائی بداعمال" شراب خور" زانی اور دشمن دین سلاطین کا مرکز حکومت ہونے کے باوجود شام کا تعلق اسلام سے منقطع نہ ہو سکا اور نہ صرف یہ کہ شام پر اسلام کا اثر غالب رہا بلکہ انھیں شامیوں کے دلوں میں جو امیر معاویہ کی کمان میں اسلام کو ختم کر دینے کا عہد کر کے میدان جنگ میں آ بجے تھے۔ اسلام سے ایسی محبت پیدا ہو گئی کہ کئی سو سال تک مسیحی قوتیں شام کے راستے مرکز اسلام پر حملہ کرنے کی کوشش کرتی رہیں لیکن شامیوں نے اپنی جانوں کی بازی لگا کر ان کو ہمیشہ روکے رکھا اور وہی شامی اسلامی سرحدوں کے نگہبان قرار پائے جنھوں نے ۳۵ھ میں سرحد اسلامی کو انتہائی پرخطر بنا دیا تھا۔ یہ نتیجہ تھا امیرالمومنینؑ کی اس پالیسی کا کہ شامیوں کو تلوار سے ذک نہ دی جائے بلکہ ان کے دلوں کو اسلام کے لئے جیت کر شام کو آنے والی صلیبی جنگوں میں اسلام کا سب سے مستحکم قلعہ بنا دیا جائے۔ کوتاہ نظر شاہ پسند اس سیاست پر اعتراض کر سکتے ہیں اس لئے کہ وہ معرکہ صفین میں "بادشاہ" علیؑ کے سر پر فتح کا تاج جگمگاتے نہیں دیکھتے لیکن جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ علیؑ بادشاہ نہیں تھے بلکہ تحریک اسلامی کے قائد اور مومنین کے امیر تھے جن کو یہ معلوم ہے کہ علیؑ کا مقصد زندگی اپنی "بادشاہت" کا استقرار نہیں تھا بلکہ اسلام کی بقا و توسیع تھا اور جو اس امر سے واقف ہیں کہ علیؑ کے نزدیک فتح وہی تھی جو اسلام کی فتح ہو۔ وہ

امیرالمومنینؑ کی اس دوررس سیاست کی داد دینے پر مجبور ہیں اور یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ معاویہ کے مقابلہ میں امیرالمومنینؑ نے محض یہی نہیں کہ فتح حاصل کی بلکہ ایسی پائیدار اور شاندار فتح حاصل کی جس شام کو معاویہ نے دشمنان اسلام کا گڑھ بنایا تھا اسی کو خانوادہ رسالتؐ نے اسلام کا ایسا مستحکم قلعہ بنا دیا جسے صلیبی جنگوں کا خوفناک سیلاب بھی نقصان نہ پہنچا سکا اور جس ملک کے رہنے والے مسیحیوں کے سہارے معاویہ نے اسلام کو مٹا دینے کا خواب دیکھا تھا وہی ملک بہ فیض تبلیغ خانوادہ رسالتؐ اسلام سے اتنا قریب ہو گیا کہ مسیحیت کے دیوانے یورپی صلیبی سپاہی کبھی شامی سرحدوں کو پار کر کے مرکز اسلام میں داخل نہ ہو سکے بلکہ انہیں ہمیشہ شامیوں کے ہاتھوں شکست اور موت کا سامنا کرنا پڑا۔ امیر معاویہ کی اس سے زیادہ شرمناک ناکامی اور امیرالمومنینؑ کی اس سے زیادہ شاندار فتح اور کیا ہو سکتی ہے؟

یہاں ہم یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ صفین میں جو معرکے ہوئے ان میں امیرالمومنینؑ نے اپنی جنگی مہارت اور فوجی قیادت کے وہ لافانی نقوش چھوڑے جو رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔

اس حقیقت سے انکار محال ہے کہ امیر معاویہ کے ساتھ ایک ایسا لشکر تھا جو اسلام کو مٹا دینے کی دھن میں دیوانہ ہو رہا تھا اس لئے امیر معاویہ کے سپاہیوں میں جوش تھا اتحاد تھا جنگ کا جذبہ تھا اور وہ اپنے قائد کے ہر حکم کی متابعت کرتے تھے۔ ان کا نظم و ضبط اچھا تھا وہ ایک آواز پر اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور جان جوکھم میں ڈال کر ہر کام کر گزرتے تھے اور ان کے مقابلے میں امیرالمومنینؑ کے پاس ایک ایسی فوج تھی جس میں نہ کوئی جوش تھا اور نہ کوئی جذبہ نہ مقاصد

کی لگن تھی نہ اصولوں پر مرمٹنے کا ذوق نہ تنظیم تھی نہ اتحاد نہ اسلام کو بچانے کی تڑپ تھی نہ حدود مملکت میں بقائے امن کی خواہش امیرالمومنینؑ ان سپاہیوں کو غیرت دلاتے ان کے سامنے اسلام کی فریاد پیش کرتے اپنے کلیجہ کا خون آنسو کر کے بہاتے ان کو اللہ اور رسولؐ کے واسطے دیتے لیکن یہ لوگ پھر بھی جنگ سے جی چراتے۔ طرح طرح کی بہانے کرتے اور لڑائی سے پہلو تہی کرتے اس لئے کہ اول تو ان کے نفوس خراب ہو چکے تھے سابقہ حکومتوں نے ان کی دینداری کو دنیا داری میں تبدیل کر دیا تھا اور ان کو اسلام یا اصول کی خاطر لڑنے کے بجائے محض مال غنیمت کی خاطر جنگ کرنے کا عادی بنا دیا تھا اور دوسرے یہ لوگ امیر المومنینؑ کو اپنے سابقہ تین حکمرانوں کے خلاف عمل کرتے دیکھتے تو یہ چیز ان پر گراں گزرتی تھی اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ان کے دل پورے طور پر امیرالمومنینؑ کے ساتھ نہ تھے ایسی حالت میں امیرالمومنینؑ کے لئے امیر معاویہ سے جنگ کرنا کتنا دشوار ہو گا اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اور یہ امیرالمومنینؑ کا کمال قیادت ہے کہ آپ اس قسم کے کم ہمت، بزدل، مفاد پرست اور نیم دلی سے کام لینے والے لشکر کے باوجود نہ صرف یہ کہ میدان میں جمے رہے بلکہ معاویہ کو عراق اور حجاز پر قبضہ کر لینے سے روکے رہے آپ کی جگہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو شاید وہ چند روز بھی جنگ جاری نہ رکھ سکتا اور اگر جنگ جاری رکھنے کی کوشش کرتا تو لامحالہ موت سے ہمکنار ہو جاتا لیکن یہ اعلیٰ درجہ کی قیادت کا کمال تھا کہ آپ ایک پراگندہ اور کم ہمت گروہ کی مدد سے ایک پرجوش اور منظم لشکر کو نہ صرف یہ کہ روکے رہے بلکہ ایسی ایسی شکستیں دیتے رہے کہ آخر اسے نیزوں پر قرآن بلند کر کے التوائے جنگ پر مجبور ہو جانا پڑا۔

حضرت عثمان کے مقابلہ میں مٹھی بھر مصری اٹھ کھڑے ہوئے اور مدینہ

والوں نے خلیفہ کی مدد نہ کی تو بنی امیہ کی مکمل حمایت حاصل ہونے کے باوجود آخر قتل کر ڈالے گئے ان کے مقابلہ میں امیرالمومنین ؑ کو دیکھئے کہ آپ کے سامنے معاویہ کا منظم لشکر موجود تھا عراقی مدد سے پہلو تہی کر رہے تھے کوفہ والے بار بار غداری، بے وفائی اور بزدلی کا مظاہرہ کر رہے تھے لشکری اطاعت سے گریزاں تھے لیکن پھر بھی امیر معاویہ نہ صرف یہ کہ میدان جنگ میں کامیاب نہیں ہوئے بلکہ مکمل شکست سے بچنے کے لئے فریب کاری پر مجبور ہو گئے۔

قضیہ تحکیمین کے بعد تو امیرالمومنین ؑ کے نام نہاد ساتھیوں اور لشکریوں کا نظم اتنا بگڑ چکا تھا کہ اگر یہ کہا جائے کہ اس وقت امیرالمومنین ؑ کے پاس کوئی لشکر تھا ہی نہیں تو شاید غلط نہ ہو گا لیکن اس کے باوجود معاویہ عراق اور حجاز پر قبضہ کرنے کی جرات نہ کر سکا جو امیرالمومنین ؑ کی قیادت اور سیاست کا ایک محیر العقول اور اعجاز آفرین کارنامہ ہے جو صرف حکمت ربانی کے امین ہی سے ظہور میں آسکتا ہے۔

چار سال کی مختصر سی مدت خلافت میں آپ نے نہ صرف یہ کہ قریش کے مفاد پرست طبقہ کا خاتمہ کر دیا بلکہ بنی امیہ کے کافرانہ کردار کا بھی خاتمہ کر دیا اس لئے کہ خلافت دعوی کر دینے کے بعد بنی امیہ کے لئے اصنام پرستی کی راہ پر پلٹ جانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا اور وہ اس پر مجبور ہو گئے کہ اپنے ناموں کے ساتھ اسلام کا لیبل چسپاں رکھیں۔

آپ کی ان دونوں کامیابیوں کے تاریخ اسلام پر گہرے اثرات مرتب ہوئے جن کا ایک ہلکا سا خاکہ ہم سابقہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں آپ یہ عظیم اور تاریخی کارنامے انجام دینے میں مصروف تھے اس زمانہ میں آپ کے لئے یہ امکان ہی نہیں تھا کہ آپ اسلامی سلطنت کے حدود

میں کوئی اضافہ فرمائیں لیکن پھر بھی آپ اس امر سے غافل نہیں رہے چنانچہ ۳۸ھ میں آپ کے ایک جرنیل قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور اس کے بعد ہی حارث بن مرہ کی سرکردگی میں دوسرا حملہ کر کے سندھ پر قبضہ کر لیا گیا۔ چنانچہ سندھ پر کئی سال تک مسلمانوں کا قبضہ رہا لیکن بعد میں دمشق میں حصول اقتدار کی جو سازشیں شروع ہوئیں ان میں سندھ دوبارہ ہندوؤں کے قبضہ میں چلا گیا افغانستان میں غور کا علاقہ آپ ہی کے عہد سلطنت میں فتح ہوا حارث بن جعفر جعفی کی قیادت میں مشرقی ایران اور توران کے علاقے فتح کیے گئے ایرانیوں کی متعدد بغاوتوں کو فرو کیا گیا۔ ربیع بن خثعم کی قیادت میں قزوین اور رے پر قبضہ کیا گیا اور اس طرح حدود سلطنت اسلامی میں کافی اضافہ کیا گیا۔ چار سال کی مختصر سی مدت میں جب کہ آپ کو جمل، نہروان اور صفین کے معرکے بھی درپیش تھے۔ اتنے علاقوں کی فتح بھی ایک معجزہ سے کم نہیں ہے اور یہ آپ ہی کا دل جگر تھا کہ اس وقت جب کہ معاویہ کے حامیان پوری مملکت میں غدر مچا دینے پر تلے ہوئے تھے آپ نے نصف ایران فتح کیا۔ افغانستان کے ایک علاقہ پر پرچم اسلامی لہرایا اور ہندوستان کے صوبہ سندھ پر لشکر کشی کر کے مسلمانوں کو اس برصغیر کی راہ دکھا دی جو دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی کا مرکز بننے والا تھا۔

امیرالمومنینؑ نے صرف یہی نہیں کیا کہ اسلام کے لئے قریش کے مفاد پسندوں اور بنی امیہ کے منافقوں سے جو خطرات پیدا ہو گئے تھے ان کو دور کر دیا بلکہ آپ نے اپنی مختصر سی مدت خلافت میں تحریک اسلامی کے وہ سارے خدوخال پوری شدت سے ابھار دیئے جن پر جہالت زرپرستی اور جنگوں کے لامتناہی سلسلہ نے پردے ڈال دیئے تھے چنانچہ آج یہ آپ ہی کی علمی کاوشوں اور تعلیمات کا طفیل ہے کہ سینکڑوں انقلابات اور شیطان کے ہزاروں جوڑ توڑ کے باوجود اسلام

کی حقیقی تصویر دنیا کے سامنے موجود ہے آپ کی دور رس نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ :-

۱ مسلمانوں میں ملوکیت اور نسلی بادشاہت کا فتنہ پوری شدت سے ابھرنے والا ہے اور انسانی حاکمیت کے جس غلط تصور کو اسلام ختم کر دینا چاہتا تھا وہی خود دنیائے اسلام پر نافذ ہو جانے والا ہے اس کے معنی یہ تھے کہ انقلاب اسلامی کا نقطۂ اول یعنی کلمہ لا الہ الا اللہ بھی اموی اور عباسی سلاطین کے ہاتھوں اپنے حقیقی مفہوم سے بیگانہ ہو جانے والا تھا اور توحید باری تعالیٰ کے اصول جاہلیت کی ظلمتوں میں گم ہو جانے والے تھے

۲ سلمانؓ ، ابوذرؓ ، عمارؓ ، اویس قرنیؓ اور اسی قسم کے دوسرے حضرات جو اسلام اور تحریک اسلامی کے حقیقی مفہوم کو جانتے اور سمجھتے تھے ختم ہوتے جا رہے تھے اور اسلام کی عنان اقتدار ان ہاتھوں میں چلی جانے والی تھی جو اسلام کو چند مردہ رسوم اور چند بے جان عبادات میں تبدیل کرنے دینے والے تھے آپ یہ دیکھ رہے تھے کہ اموی اور عباسی سلاطین کے ہاتھوں میں اسلام ایک کھلونا بن جائے گا حدیث سازی عام ہو جائے گی تفسیریں اسرائیلی خرافات کا مجموعہ بن جائیں گی جبر و قدر ، تجسیم باری تعالیٰ انبیاء کی خطا کاری اور اسی قسم کے سینکڑوں لغو عقائد اسلام میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ مانویت ، مزدکیت ، نوافلاطونیت اور فلسفہ یونان اسلامی روپ دھار کر عقائد اسلامی کے شفاف دھارے کو گندہ کر دیں گے بادشاہوں کی تفریح خاطر کے لئے فقہ اسلامی عجیب و غریب مسائل کا طومار بن جائے گی اور اسلام اس طرح مسخ ہو جائے گا کہ اس کی شکل پہچاننا مشکل ہو جائے گا۔

۳ خلافت کی تقدیس کا تصور سلاطین کی بداعمالیوں کے نتیجہ میں ختم ہو جائے

گا اور اس طرح امت کی مرکزیت اور مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا۔

۴ شیعہ عثمان، شیعہ علیؑ اور خوارج کے نام سے مسلمانوں میں فرقہ بندی شروع ہو چکی تھی جو آگے چل کر بھیانک روپ اختیار کر لینے والی تھی۔

۵ زر پرستی عام ہو چکی تھی اور آگے چل کر ملت اسلامیہ کو اس کے نتائج بد کا سامنا کرنا یقینی تھا۔

۶ ابو موسیٰ اشعری قسم کے لوگ عام ہوتے جا رہے تھے جن کے نزدیک جمود اور بے عملی ہی وقت کی سب سے بڑی نیکی تھی جس کے نتیجہ میں آگے چل کر تصوف کا بے عمل فلسفہ مسلمانوں کے ذہنوں پر چھا جانے والا تھا۔

۷ مسلمان اتنے جاہل ہو چکے تھے کہ امیر معاویہ کے بقول اونٹ اونٹنی میں تمیز نہیں کر سکتے تھے اور ظاہر ہے کہ جس قوم میں جہالت اس درجہ پر پہنچ جائے اس کا روحانی علمی تمدنی اور ذہنی حیثیت سے جو حشر ہو سکتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

امیرالمومنینؑ کے دور کی کسی دوسری اسلامی شخصیت نے نہ تو ان مفاسد کا اندازہ کیا اور نہ ان کے تدارک کی کوئی تدبیر کی یہ صرف آپ ہی کی ذات گرامی تھی جس نے ان خطرات کا احساس کیا اور مسلمانوں کی دینی تربیت کا پورا پورا بندوبست فرمایا اس سلسلہ میں آپ کی مساعی جمیلہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آپ خون کی بارش اور تلواروں کی چھاؤں میں بھی اسلام کی تبلیغ اور اسرار دین کی اشاعت سے باز نہیں رہتے تھے چنانچہ میدان صفین میں عین اس وقت جب کہ موت کا بازار گرم تھا آپ نے ایک اعرابی کے جواب میں مسئلہ توحید پر جو عالمانہ تقریر فرمائی ہے وہ آپ کے اسی جذبہ تبلیغ کی مظہر ہے آپ نے اپنا یہ

اصول بنا لیا تھا کہ روزانہ نماز ظہر کے بعد ایک خطبہ ارشاد فرماتے تھے جس میں دین کے حقائق و معارف بیان کیا کرتے تھے تاکہ مسلمان اس دین حقیقی سے آشنا ہو جائیں جس پر جہالت نے گہرے غلاف ڈال دیئے تھے آپ نے اپنے خطبات' فرامین' توقیعات' خطوط اور دعاؤں کے ذریعہ دین کی حکمتوں اور اسلام کی تعلیمات کو جس شان سے اجاگر کیا ہے اس کی مثال صدر اسلام کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی اور اس باب میں تاریخ کی کوئی حیثیت آپ کے مقابلہ میں پیش کی جانا محال ہے آپ کی یہ سعی جمیل نہج البلاغہ اور صحیفہ علویہ کی شکل میں آج بھی موجود ہے اور کتاب اللہ کے بعد اسلام کی صداقتوں کا سب سے مکمل اور حسین مظہر تسلیم کی جاتی ہے آپ کے ان خطبات مکاتیب اور ادعیہ کے نتیجہ میں ہی اسلام اپنی شکل پر قائم رہا اور بادشاہوں کے جبر فلاسفہ کے اقتدار کج فہم علماء کی نکتہ آرائیوں جہالت کی ظلمت آفرینیوں صوفیاء کے ناچ گانوں حدیث سازوں کی کرشمہ آرائیوں اور مفسرین کی بعید از کار ژرف نگاریوں کے باوجود دین کی حقیقتیں گم نہ ہو سکیں توحید کے اصلی نقوش قائم رہے رسالت و معاد کے عقائد پر حرف نہ آ سکا اور اسلام ہزاروں انقلابات کے باوجود آج تک اپنی اصلی صورت میں زندہ اور موجود ہے۔ سرکار دو عالمؐ کے ہزاروں صحابہ میں یہ شرف صرف امیرالمومنینؑ ہی کی ذات گرامی کو حاصل ہے کہ آپ نے امت کی ہدایت اور دین کی بقاء پر پوری پوری توجہ فرمائی اور خطبات و مکاتیب کی شکل میں وہ سرمایہ چھوڑ گئے جو علوم الٰہیہ کا سب سے بڑا گنجینہ اور بصیرت و معرفت کا سب سے قیمتی خزانہ کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے صحابہ نے بعض احادیث کی روایت کا فریضہ انجام دیا اور یا پھر فقہی مسائل و احکام بیان کیے لیکن امت کے عقائد کو محفوظ کرنے' حقیقت توحید عام کرنے دین کے مصالح و حکم کو ذہن نشین کرانے اور آنے والے

زمانہ میں دین کی شکل کو مسخ ہونے سے محفوظ رکھنے کا کام صرف امیرالمومنینؑ نے انجام دیا اور یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کا جواب دوسری خلافتوں کی تاریخ میں ملنا محال ہے۔

خلافت الٰہیہ کا حقیقی مقصد دین کی حفاظت کرنا علوم دینیہ کو عام کرنا مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی نگرانی کرنا حقیقت اسلام کو اجاگر کرنا رموز قرآن کی وضاحت کرنا احکام الٰہی کی تبلیغ کرنا شریعت مطہرہ کی تعلیم دینا اور مسلمانوں کے اخلاق و کردار کی تعمیر کرنا ہے اور جب اس زاویہ سے امیرالمومنینؑ کی خلافت پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ہم یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ خلافت کا مقصد اصلی صرف آپ کی خلافت کے زمانہ میں پورا ہوا دوسری طرف خلفاء نے فتوحات ملکی میں ضرور اضافہ کیا انتظام سلطنت پر توجہ ضرور کی۔ شاندار عساکر کی ترتیب میں ضرور انہماک کا مظاہرہ کیا لیکن یہ کام تو دنیا کا ہر بادشاہ خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم انجام دیا کرتا ہے ان امور کا خلافت الٰہیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اگر محض ترتیب عساکر اور فتوحات ملکی کو خلافت کا مقصد مان لیا جائے تو دنیا کے سارے مسلمان بادشاہ اور فاتحین مستحق خلافت ہو جائیں گے خلافت الٰہیہ کا مقصد تو وہ ہے جو ہم نے مندرجہ بالا سطور میں واضح کیا ہے اور یہ مقصد اگر کبھی پورا ہوا ہے تو امیرالمومنینؑ کے دور خلافت میں۔ اس اعتبار سے آپ کا یہ چار سالہ دور خلافت نہ صرف یہ کہ اپنی مثال آپ ہے بلکہ درحقیقت وہ واحد خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہے جس کی نظیر تاریخ اسلام میں ملنا محال ہے۔

آج دنیا کی ہر ترقی یافتہ حکومت اپنے حدود مملکت سے جہالت کو مٹانے اور عوام کو تعلیم یافتہ بنانے پر زور دیتی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ صدر اسلام کی ابتدائی تین خلافتوں نے اس اہم تعمیری اور تعلیمی کام کو ہمیشہ

نظر انداز کیا جس کا نتیجہ اس شدید جہالت کی شکل میں رونما ہوا۔ جس میں بقول امیر معاویہ عرب اونٹ اور اونٹنی میں تمیز کرنے کے قابل نہیں رہے۔

امیرالمومنینؑ علیہ السلام دنیائے اسلام کے پہلے حکمران ہیں جنہوں نے نشر علوم پر نہ صرف یہ کہ توجہ دی لکہ اسے اپنی حکومت کا اولین مقصد قرار دیا۔ چنانچہ آپ کی کاوشوں کے نتیجہ میں کوفہ اسلامی دنیا کا سب سے بڑا علمی مرکز بن گیا اور آپ کی ہدایت و تربیت کے نتیجہ میں دنیائے اسلام میں تصنیف و تالیف کا وہ مشغلہ شروع ہوا جسے آپ سے پہلے کے حکمرانوں نے قطعا" بند کر رکھا تھا۔

عربی علم نحو کے امام ابوالاسود دوئلی، علم قرات کے امام امام عبدالرحمن سلمی فقہ و حدیث کے امام شعبی، تفسیر کے امام عبداللہ بن عباس مساحت و ریاضی کے امام کمیل بن زیاد زبان و بیان کے ماہر عمر بن سلمہ اور علم عروض کے موجد عبادہ بن صامت آپ ہی کے خرمن علم کے خوشہ چیں ہیں۔

حضرت امام حسن علیہ السلام، حضرت امام حسین علیہ السلام جناب محمد بن حنفیہ حضرت عبداللہ بن عباس حضرت ابی بن کعب حضرت جابر بن عبداللہ انصاری حضرت کمیل بن زیاد حضرت اصبغ بن نباتہ حضرت عبیداللہ بن ابی رافع سلیم بن قیس ہلالی میثم تمار زید بن وہب اور بعض دوسرے حضرات آپ کے مکتب فکر کے پروردہ وہ مصنفین ہیں جن کے آثار قلمی محفوظ ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کی سعی و جہد کے نتیجہ میں تصنیف و تالیف کا فن کافی ترقی کر گیا تھا۔

دنیائے اسلام پر امیرالمومنینؑ کا یہ سب سے بڑا احسان ہے کہ آپ نے مسلمانوں میں علمی تحریک شروع فرمائی چنانچہ اس حقیقت کا دوست دشمن سب کو اعتراف ہے کہ آج ملت اسلامیہ جن علوم پر ناز کرتی ہے ان کے آغاز کا سہرا امیر

المومنینؑ کے سر ہے مسلمانوں کا علم الہیات مسلمانوں کا علم کلام اور مسلمانوں کا فلسفہ و حکمت تمام تر حضرت علیؑ کی ایجاد ہے اور ان علوم کا اولین ماخذ نہج البلاغہ ہے دوسرے علوم کے سرچشمے بھی اسی کوہ علم و معرفت سے پھوٹے اور یہ آپ کا ایک ایسا احسان ہے جسے ملت اسلامیہ کبھی نظرانداز نہیں کر سکتی۔

امیرالمومنینؑ علیہ السلام کی علمی تحریک کا ایک ادنیٰ سا اندازہ کرنے کے لئے یہ کافی ہے کہ دنیائے اسلام کی پہلی تفسیر حضرت سعید بن جبیر نے لکھی جو تابعین میں شامل تھے ابن الندیم نے اپنی فہرست میں اس تفسیر کا تذکرہ کیا ہے سعید بن جبیر شیعیان امیرالمومنینؑ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ حجاج بن یوسف نے ان کو شہید کرا دیا۔

شیعیان امیرالمومنینؑ اس وقت قرآنی علوم کی تدوین و اشاعت میں مصروف تھے جب دوسرے مسلمانوں کی ان علوم پر کوئی توجہ نہ تھی چنانچہ امام محمد باقر علیہ السلام کے صحابی سدی کبیر اسمٰعیل متوفی ۱۲۷ھ نے ایک اعلیٰ درجہ کی تفسیر تیار کی جس کا تذکرہ علامہ سیوطی نے بھی کیا ہے محمد بن سائب بن بشر کلبی متوفی ۱۴۶ھ نے بھی جو امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابی تھے قرآن پاک کی ایک بہت مفصل تفسیر تیار کی تھی۔

امام محمد باقر علیہ السلام کے شاگردوں میں جابر بن یزید جعفی اور ابوالجارود نے بھی قرآن کی تفسیریں لکھی ہیں۔

آئمہ علوم قرآن میں عبداللہ بن عباسؓ، جابر بن عبداللہ انصاریؓ، ابی بن کعبؓ، سعید بن جبیر (علم التفسیر فی التابعین) یحییٰ بن بصیر، میثمان بصری، طاوس بن کیسان، اعمش کوفی، سعید بن مسیب، عبدالرحمٰن سلمی اور ابن تغلب وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں جو صحابی اور تابعین کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

آئمہ آل رسول کے اصحاب میں جن لوگوں نے تفسیر قرآن کے سلسلہ میں ممتاز کارنامے انجام دیئے ان میں ابو حمزہ ثمالی صحابی امام زین العابدین علیہ السلام زیاد بن منذر ابوالجارود یحیی بن قاسم ابو بصیر علی بن سالم بطائنی حسین بن سعید ابو جنادہ السلولی محمد بن خالد برقی وہب بن حفص یونس بن عبدالرحمٰن احمد بن صبیح علی بن سباط علی بن خطاب ابوالفضل قمی فرات بن ابراہیم اور دوسرے کئی حضرات شامل ہیں حسن بن خالد برقی نے امام حسن عسکری علیہ السلام کی ہدایت پر ایک سو بیس جلدوں میں ایک مفصل تفسیر تیار کی تھی جو ایک نادر علمی کارنامہ ہے۔

علم قرأت میں سب سے پہلی کتاب ابن بن تغلب نے لکھی اور ان کے بعد دوسری کتاب حمزہ بن حبیب نے تیار کی۔ حمزہ کا انتقال ۱۵۶ھ میں ہوا اور یہ دونوں صحابی آئمہ تھے۔ حمزہ نے قرأت کا علم امام جعفر صادق علیہ السلام سے حاصل کیا تھا ان کے علاوہ سعد بن ابو جعفر کوفی متوفی ۲۲۱ھ نے علم قرأت میں ایک اہم تصنیف چھوڑی اور یہ کتابیں اس وقت تیار کی گئیں جب دوسرے مسلمانوں کو اس علم پر کوئی توجہ نہیں تھی چنانچہ اہلسنت میں علم قرأت کے پہلے مصنف ابوعبید قاسم بن سلام ہیں جو مذکورہ بالا تینوں شیعہ مصنفین کے بعد اس میدان میں داخل ہوئے ہیں۔

احکام القرآن پر پہلی کتاب محمد بن سائب کلبی متوفی ۱۴۶ھ نے لکھی۔ غرائب القرآن کے پہلے مصنف ابان بن تغلب ہیں جن کے بعد ابو جعفر رواسی ابو عثمان مازنی فرا اور ابن درید نے اس میدان میں قدم رکھا اور یہ سب حضرات شیعہ تھے۔ معانی قرآن پر ابان بن تغلب افرا اور رواسی کی تصانیف اولیت کا شرف رکھتی ہیں نوادر القرآن کے پہلے مصنف علی بن حسین بن فضال ہیں جن

کے بعد ابوالحسن محمد بن احمد معروف بہ حارثیؒ اور علی بن ابراہیم نے اس فن میں اہم کتابیں تیار کیں۔

متشابہات قرآن پر سب سے پہلی کتاب امام جعفر صادقؑ کے شاگرد حمزہ بن حبیب زیات کوفی نے لکھی اور مقطوع و موصول قرآن پر بھی پہلی کتاب انہیں بزرگ نے تیار کی محمد بن احمد وزیر نے بھی متشابہات قرآن پر ایک اچھی کتاب چھوڑی۔

مجازات قرآن میں پہلی کتاب فرا یحیی بن زیاد نے تیار کی علامہ سید رضی نے بھی اس موضوع پر ایک تصنیف چھوڑی۔

فضائل قرآن پر ابی بن کعب نے اور امثال قرآن پر شیخ محمد بن جنید نے پہلی بار قلم اٹھایا۔

محمد بن ابراہیم بن جعفر ابو عبداللہ کاتب نعمانی نے تفسیر نعمانی تیار کی اور آیات قرآنی سے ساٹھ علوم ظاہر کئے۔

پہلی تفسیر جو کل علوم قرآن کی جامع کہی جاتی ہے ابو عبداللہ محمد بن عمر الواقدی نے تیار کی۔

شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی کی التبیان' سید رضی کی حقائق التنزیل' شیخ معین خزاعی کی روض الجنان' علامہ طبرسی کی مجمع البیان اور شیخ قطب الدین راوندی کی تفسیر وہ علمی کارنامے ہیں جن پر ملت شیعہ ہمیشہ ناز کر سکتی ہے اور یہ سب فیض ہے اس علمی تحریک کا جو ملت اسلامی کے منصوص من اللہ قائد نے اپنی نگرانی میں شروع فرمائی تھی۔

علم حدیث میں پہلا صحیفہ خود امیرالمومنینؑ علیہ السلام نے تیار کیا اور آپ نے اس امر میں سعی بلیغ فرمائی کہ زیادہ سے زیادہ احادیث جمع کرلی جائیں چنانچہ

حضرت امام حسن علیہ السلام حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابوذر غفاری نے بھی صحف حدیث مرتب کیے۔ حضرت ابو رافع نے اس طرح اپنا صحیفہ حدیث مرتب کیا کہ احادیث مختلف ابواب میں تقسیم تھیں امیرالمومنینؑ کے شاگردوں میں علی بن ابی رافع عبیداللہ بن ابی رافع سلیم بن قیس ہلالی میثم تمار اصبغ بن نباتہ عبیداللہ بن حر جعفی ربیعہ بن سمیع اور حرث ہمدانی نے بھی صحف حدیث تیار کیے اور یہ کتابیں اس زمانہ میں مرتب ہوئیں جب شیعیان اہل بیتؑ کے علاوہ کسی دوسرے مسلمان نے اس میدان میں قدم نہیں رکھا تھا۔

دوسری صدی میں جب اہل سنت میں زہریؒ اور امام مالکؒ نے احادیث جمع کیں اس وقت بھی شیعہ محدثین بکثرت تھے جن میں ابان بن تغلب جابر بن یزید جعفی ابو حمزہ ثمالی زرارہ بن اعین محمد بن مسلم طائفی' ابو بصیر' عبدالمومن بن قیس انصاری' ابوالرجا کوفی' ابو یحیٰی' فیاض' حجر بن زائدہ' معاویہ بن عمار اور عبداللہ بن میمون قداح وغیرہ بہت مشہور ہیں امام جعفر صادق علیہ السلام کے اصحاب نے حدیث کی چار سو کتابیں چھوڑی ہیں۔

علماء شیعہ نے علم حدیث میں چھ ہزار چھ سو کتابیں تالیف کیں جو علم حدیث سے پیروان آل رسولؐ کی شیفتگی کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ علم حدیث کے ساتھ علم رجال کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے تفسیر اور حدیث کے ساتھ ہی رجال بھی اولیت کا شرف شیعوں کو حاصل ہے چنانچہ امام موسی کاظم علیہ السلام کے صحابی محمد بن خالد برقی علم الرجال کے پہلے مصنف ہیں جنہوں نے رواۃ کا تذکرہ مرتب فرما کے تحقیق و تنقید حدیث کا دروازہ کھول دیا ان کے بعد ابو محمد ابن جبلہ ابن حیان نے کتاب الرجال لکھی ابو جبلہ کا انتقال ۲۱۹ھ میں ہوا۔ رجال کے تیسرے مصنف امام محمد تقی علیہ السلام کے صحابی ابو جعفر یقطنی ہیں۔ ان کی

کتاب منظر عام پر آنے کے بعد اہل سنت نے اس علم کی جانب توجہ کی اور شعبہ نے رجال اہل سنت پر کتاب تصنیف کی۔ علمائے شیعہ میں ابو جعفر برقی ابن بابویہ قمی شیخ صدوق شیخ ابو بکر جعابی وغیرہ رجال کے بہت بڑے ماہر گزرے ہیں اور ابھی دور آخر میں حضرت ناصر الملتہ علی اللہ مقامہ نے اس فن میں اس کمال کا مظاہرہ کیا ہے جس کی نظیر تاریخ اسلامی میں دستیاب ہونا مشکل ہے۔

علم فقہ کی تدوین پر بھی امیرالمومنینؑ نے پوری توجہ دی چنانچہ فقہ اسلامی کی پہلی کتاب امیرالمومنینؑ کے شاگرد ابو رافع نے خود آپ کی زندگی میں ہی مرتب کرلی تھی ان کے بعد قاسم بن محمد ابن ابی بکر اور سعید بن مسیب نے فقہ پر کتابیں لکھیں اس وقت تک اہل سنت نے فقہ میں کوئی کتاب تیار نہ کی تھی۔ امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابہ نے تو علم فقہ کو چار چاند لگا دیئے چنانچہ ان فقہائے شیعہ میں زراہ ابو بصیر اسدی فضیل بن یسار مسلم طائفی جمیل بن دراج عبداللہ بن سکان' عبداللہ بن کبیر حماد بن عیسی وغیرہ کے نام تاریخ فقہ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

امام زین العابدین علیہ السلام کے صحابی ثابت المقدم نے جامع فقہ تیار کی اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابی علی بن حمزہ نے جامع ابواب فقہ تصنیف کی امام موسی کاظم علیہ السلام کے صحابہ میں محمد بن معانی نے شرائع الایمان اور عبداللہ بن مغیرہ نے تیس جلدوں میں علم فقہ کی ایک بہت بڑی کتاب تیار کی۔

مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ آئمہ آل رسولؐ کے صحابہ میں ابراہیم بن محمد ثقفی' ابراہیم بن محمد اسلمی' علی بن محمد تاسانی' صفوان بن یحییٰ بجلی اور ابو علی السراد وغیرہ نے بھی علم فقہ میں تصانیف چھوڑی ہیں۔

علم کلام کی ایجاد بھی حضرت امیرالمومنینؑ کا کارنامہ ہے چنانچہ کمیل بن

مروانی خلفاء میں عمر بن عبدالعزیز نے امیرالمومنینؑ پر سب و شتم بند کرا دیا اور اس طرح عملاً یہ تسلیم کر لیا کہ امیر معاویہ سے لے کر بنی امیہ کے دس خلفاء تک سب ایک مستقل گناہ کا ارتکاب کرتے رہے اور جو لوگ ان خلفاء کی بیعت کرتے رہے یا آج بھی ان سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں وہ ایک بڑی غلط کاری کے مرتکب ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بھی ایک دلچسپ چیز ہے کہ علمائے اسلام عمر بن عبدالعزیز کو خلفائے راشدہ میں شامل کرتے ہیں اور اسے بنی امیہ کے ملک عضوض سے علیحدہ ایک دیندار خلیفہ تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ دنیا کے سارے مسلمان امیر معاویہ اور ان کے جانشینوں کے اس فعل کی مذمت کرتے ہیں کہ وہ حضرت علیؑ پر سب و شتم کراتے رہے اور چاہے زبان سے اس کا اقرار نہ کیا جائے لیکن عمر بن عبدالعزیز سے جو بیعت اور اظہار عقیدت کرنے والے اس منطقی نتیجہ کی زد سے باہر نہیں جا سکتے کہ وہ امیر معاویہ اور بنی امیہ کے دوسرے حکمرانوں کو عملاً غلط کار تسلیم کرتے ہیں کیونکہ اگر اس منطقی نتیجہ کو نہ مانا گیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ عمر بن عبدالعزیز سے جو بیعت کی گئی وہ بھی جھوٹی تھی اور جو اظہار عقیدت کیا جاتا ہے وہ بھی نمائشی ہے۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے آل رسولؐ کو فدک بھی واپس کر دیا جو آل رسولؐ کی ایک عظیم اخلاقی اور اصولی فتح تھی۔ عمر بن عبدالعزیز نے اپنے اس عمل سے ثابت کر دیا کہ جن لوگوں نے فدک کو ضبط کیا تھا یا اس کی ضبطی کے لیے ایک حدیث کا سہارا لیا تھا وہ غلطی پر تھے اور جس حدیث کو انھوں نے اپنے فعل کی دلیل قرار دیا تھا وہ سرے سے مجہول اور وضعی تھی اس لیے کہ اگر اس منطقی نتیجہ کو تسلیم نہ کیا جائے تو عمر بن عبدالعزیز کے اس اقدام کی مذمت کرنا واجب

ہو جائے گا اور یہ کہنا پڑے گا کہ اس نے حضرت ابوبکر حضرت عمر اور حضرت عثمان کی مخالفت اور توہین کی اس لیے وہ خلافت کا اہل نہیں تھا لیکن کوئی مسلمان عمر بن عبدالعزیز پر یہ الزام عائد نہیں کرتا بلکہ سب اسے ایک خلیفہ راشد تسلیم کرتے ہیں جو اس کا ثبوت ہے کہ سارے مسلمان زبان سے نہ سہی لیکن اپنے عمل سے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ فدک کی ضبطی بھی غلط تھی اور وہ حدیث بھی وضعی تھی جسے اس ضبطی کی دلیل قرار دیا گیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز کی بیعت کرنے والے مسلمان عملاً یہ ثابت کرتے ہیں کہ فدک کی ضبطی غیر عادلانہ اور غیر منصفانہ تھی اور جو حکومت غیر عادلانہ حرکتوں کی مرتکب ہو اسے کم از کم خلافت کے محترم لقب سے نوازنا قطعاً غلط ہے۔

فدک کے سلسلہ میں یہ چیز بڑی دلچسپ ہے کہ اسے بار بار ضبط کیا اور واپس کیا جاتا رہا جو خلیفہ چاہتا تھا اسے ضبط کر لیتا تھا اور جو چاہتا تھا واپس کر دیتا تھا اور سواد اعظم اسلام ان میں سے ہر خلیفہ کو خلیفہ برحق واجب الاطاعت امیر اور اپنا پیشوا تسلیم کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ سواد اعظم کے نزدیک فدک کی ضبطی اور واپسی دونوں درست ہیں۔ کسی وقت یہ فعل جائز ہو جاتا ہے اور کسی وقت ناجائز' جو بے اصولی کا ایک ایسا عجیب و غریب شاہکار ہے جس پر ہر سچا مسلمان شرم سے سر جھکا لینے پر مجبور ہے۔

فدک کی ضبطی اور واپسی کی یہ عجیب و غریب داستان اور مسلمانوں کی یہ بے اصولی کہ وہ ان متضاد نظریات رکھنے والے خلفاء میں سے ہر ایک کو امیر مطاع اور پیشوا تسلیم کرتے رہے امیرالمومنینؑ کی ایک عظیم اخلاقی اور اصولی فتح ہے اس لیے کہ فدک کی ہر واپسی کے موقع پر دنیائے اسلام کو عملاً یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ فدک کو ضبط کرنا ایک غیر عادلانہ فعل تھا اور جو لوگ ایک غیر عادلانہ

فعل کے مرتکب ہوئے وہ خلافت کے سے عظیم منصب کے اہل نہیں قرار دیئے جا سکتے تھے۔ مسلمانوں کا یہ بار بار کا اقرار ان تمام خلافتوں کو باطل قرار دے دیتا ہے جو قریش نے امیرالمومنینؑ کو نظر انداز کر کے قائم کی تھیں اور کم از کم دنیا پر یہ ضرور ظاہر کر دیتا ہے کہ بار بار امت کا "اجماع" اس امر پر ہو چکا ہے کہ ابتدائی تین خلافتوں نے فدک کو غصب کر کے ایک بڑا ظلم کیا تھا۔ ان خلافتوں کے غیر عادلانہ فعل پر بار بار "اجماع امت" کے سامنے اس ایک بار کے "اجماع" کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے جو وفات رسولؐ کے بعد وجود میں آیا تھا؟

بنی امیہ کے بعد بنی عباس کی حکومت قائم ہوئی اور ساری دنیائے اسلام نے ان کی بیعت کی۔ آل عباس کے پہلے خلیفہ ابوالعباس السفاح نے حصول خلافت کے بعد ہی جو پہلا خطبہ پڑھا اس میں اس نے نہ صرف یہ کہ بنی امیہ کے تمام خلفاء کی تکذیب کی بلکہ ابتدائی تین "خلفائے راشدین" کی خلافت کو بھی ناجائز قرار دیا۔ السفاح نے کھلم کھلا الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے جانشین، وارث اور خلیفہ بلا فصل امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام تھے اور جن لوگوں نے امر خلافت میں آپ سے تنازعہ کیا یا خود مسند آرائے خلافت بن بیٹھے وہ ہرگز اس فعل کے مجاز نہیں تھے۔

السفاح کا یہ خطبہ اس کے عقائد کا ایک واضح اعلان تھا اور اس حقیقت سے انکار محال ہے کہ اس اعلان عقائد کے بعد ساری دنیائے اسلام نے اس کی بیعت کی یہ چیز تین حالتوں سے خالی نہیں۔

۱۔ یا تو ساری دنیائے اسلام نے السفاح کے ان عقائد کو تسلیم کر لیا۔

۲۔ یا دنیا بھر کے مسلمانوں نے "تقیہ" کے طور پر عباسیوں کی بیعت کی۔

۳۔ اور یا پھر سواد اعظم اسلام کا کوئی اصول نہیں اس لیے کہ وہ جب چاہیے

اسلام کے تین خلفاء اور بنی امیہ کے سلاطین کی بیعت کر سکتا ہے اور جب چاہے ان کو غاصب قرار دے سکتا ہے اور دونوں حالتوں میں اس کا مذہب قائم رہتا ہے۔

ان تینوں صورتوں میں سے جو صورت قبول کی جائے گی وہ امیرالمومنین کی فتح کہلائے گی اور مذہب اہل بیت کی کھلی ہوئی کامیابی تصور کی جائے گی۔

السفاح کے بعد منصور دوانیقی نے اپنے پیشرو کے عقائد میں ترمیم کی اور یہ دعویٰ کیا کہ خلافت دراصل حضرت عباس کا حق تھی یہ ایک عجیب و غریب دعویٰ تھا اور آج دنیا کا کوئی مسلمان اسے تسلیم نہیں کرتا لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ مسلمانوں نے اس دعویٰ کے باوجود منصور کی بیعت کی اور اسے خلیفہ تسلیم کیا۔

بہرحال حضرت عباس کے دعوئے خلافت کے نتیجہ میں منصور نے پوری "خلافت راشدہ" کو مسترد کر دیا اور ان تمام صحابہ تابعین اور تبع تابعین کی تکذیب کر دی جو اس نظام خلافت کے علمبردار تھے اور ساری دنیائے اسلام نے منصور کی بیعت کر کے اس کے اس فیصلہ پر مہر توثیق ثبت کر دی۔

اگر ہم یہ عرض کریں تو غلط نہ ہو گا کہ السفاح اور المنصور کے دور میں خلافت راشدہ کے باطل ہونے پر ساری امت کا "اجماع" رہا کیونکہ اگر اس صورت کو قبول نہ کیا جائے گا تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ مسلمانوں نے ان دونوں کی خلافت کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ دنیا بھر کے مسلمان دراصل "تقیہ" کیے ہوئے تھے اور یہ ایک ایسی بات ہو گی جسے قبول کرنا آج کے مسلمانوں کے لیے آسان نہیں ہو گا۔

امیرالمومنین کی اس سے زیادہ شاندار کامیابی اور کیا ہو گی کہ ۱۱ھ میں مسلمانوں کے "اجماع" نے جن لوگوں کی خلافت کا فیصلہ کیا تھا انہیں کو صرف

ایک صدی کے بعد ۲۳۲ھ میں اسی اجماع مسلمین نے خلافت سے محروم کر کے غاصب قرار دے دیا۔ اب دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں' ایک تو یہ کہ اس نئے اجماع کے فیصلہ کو بھی برحق شمار کیا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ ارکان خلافت راشدہ غاصب تھے اور دوسرے یہ کہ سرے سے اصول اجماع کو باطل مان لیا جائے اس لیے کہ جو اجماع روز روز بدلتا رہتا ہو اس پر شرعی مسائل کی بنیاد رکھ دینا اور اس کے فیصلوں کو برحق قرار دینا ویسی ہی الجھنیں پیدا کرتا رہے گا جیسی کہ آل عباس کے عقائد پر "اجماع امت" نے پیدا کر دی ہیں اور جن کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ خلافت کا وہ سارا محل منہدم ہو جاتا ہے جس پر مسلمانوں کا ایمان ہے بلکہ وہ "عدالت صحابہ" بھی باطل ٹھہر جاتی ہے جس پر حدیث اور فقہ کی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور دلچسپ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ السفاح اور المنصور دونوں ابتدائی تین خلافتوں کو مسترد قرار دینے میں تو متحد ہیں لیکن امیرالمومنینؑ کے بارے میں ان کے نظریات مختلف ہیں۔ السفاح امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بلافصل کا اعلان کرتا ہے اور المنصور آپ کی خلافت سے بھی اسی طرح انکار کرتا ہے جس طرح ابتدائی تین خلفاء کی خلافت کا منکر ہے۔ ایسی حالت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے منصور کے دور میں اپنی بنائی ہوئی چاروں خلافتوں سے انکار کیا لیکن درحقیقت یہ بات خلاف واقعہ ہے۔ مسلمانوں نے ابتدائی تین خلافتوں سے منصور کے انکار پر تو خاموشی اختیار کی لیکن جب اس نے امیرالمومنینؑ کے حق خلافت سے انکار کیا تو فقہ اسلامی کے دو آئمہ یعنی ابو حنیفہ اور امام مالک نے المنصور کی بیعت توڑ دینے کا حکم دے دیا چنانچہ اس تاریخی حقیقت سے انکار محال ہے کہ اہلسنت کے ان دونوں آئمہ نے خلیفہ

المنصور کے مقابلے میں محمدؐ نفس ذکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کا ساتھ دیا اور اس طرح عملاً یہ ثابت کر دیا کہ وہ خلافت کو عباسیوں کے مقابلہ میں آل علیؑ کا حق تسلیم رتے تھے اور ابن منصور کو خلافت کا اہل تسلیم نہیں کرتے تھے جو امیرالمومنینؑ کے خلافت کا منکر تھا۔

بنی عباس کے کئی خلفاء کے متعلق بلا خوف تردید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ابتدائی تین خلافتوں کو باطل تصور کرتے تھے اور امیرالمومنینؑ کو رسول اللہؐ کا پہلا اور سچا جانشین مانتے تھے اور مسلمانوں نے ان سب کی بیعت کی ہے۔ ایسی حالت میں یا تو یہ مان لیا جائے کہ یہ بیعت غلط تھی اور یا پھر اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ امیرالمومنینؑ کی خلافت بلا فصل پر امت کئی مرتبہ اجماع کر چکی ہے جو امیر المومنینؑ کی بہت بڑی کامیابی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے تین ارکان اور بنی امیہ کے سلاطین کی خلافت پر کبھی "اجماع" نہیں ہوا۔ اس لیے کہ شیعوں نے ان کی خلافت کبھی تسلیم نہیں کی البتہ ان کی خلافت کے باطل ہونے پر دور بنی عباس میں بار بار "اجماع امت" ہوا۔ اس لیے کہ جب بھی اہل سنت نے بنی عباس کے ان سلاطین کی بیعت کی جو ان خلفاء کی خلافت تسلیم نہیں کرتے تھے تو وہ شیعوں کے ہم آواز ہو گئے اور ان خلافتوں کے بطلان پر ساری امت کا اجماع مکمل ہو گیا۔

آل رسولؐ کے نویں، دسویں اور گیارھویں امام پر بنی عباس کے مظالم کی وجہ سے یہ بتلائی جاتی ہے کہ بنی عباس کو یہ معلوم تھا کہ آل رسولؐ میں مہدی پیدا ہو گا اور ان کو اندیشہ تھا کہ مہدیؑ کے ہاتھوں ان کی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ خلفائے بنی عباس کا یہ خوف بھی امیرالمومنینؑ کی ایک بڑی کامیابی ہے

اس لیے کہ مسند خلافت پر بیٹھنے والے بھی اپنے دل کے پردوں میں یہ تسلیم کرتے تھے کہ قائم آل محمدؑ امیرالمومنینؑ کے پوتے اور جانشین ہوں گے اور اسی اقرار قلبی کے نتیجہ میں وہ اسے ضروری خیال کرتے تھے کہ آل رسولؐ کے ان آئمہ برحق پر مظالم ڈھا کر عوام کی توجہ اپنی جانب مبذول رکھی جائے جن کی امامت حقہ کا خود ان کو وقتاً فوقتاً اقرار کرنا پڑتا تھا۔

جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق ہے واقعہ کربلا کے بعد سے گیارھویں امام کے دور تک ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کے دل ہمیشہ آل رسولؐ کے ساتھ رہے اور مسلمانوں میں یہ عقیدہ عام رہا کہ خلافت دراصل آل رسولؐ کا حق ہے۔ شاہان وقت بھی مسلمانوں کے اس رجحان سے بخوبی واقف تھے چنانچہ آئمہ اہل بیتؑ کا قید و بند میں مبتلا رکھا جانا دراصل اس حقیقت کے اعتراف کا عملی نتیجہ تھا۔ امیرالمومنینؑ کی اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے کہ حکومت وقت کی قوتوں' زرپاشیوں اور مخالفانہ پروپیگنڈہ کے باوجود دنیا آپ کی اور آپ کی اولاد کی حقانیت کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوئی اور جس شخص کے نام کو دنیا سے مٹا دینے کی ہر امکانی سعی و جہد کی گئی وہ تاریخ کے ہر دور میں اس اعتبار سے مسلمانوں کا سب سے بڑا قائد تسلیم کیا گیا کہ اس کی ذات پر ہمیشہ امت کا اجماع رہا حالانکہ تاریخ کی کسی دوسری اسلامی شخصیت کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا کہ اس پر ہمیشہ اور ہر زمانہ میں پوری امت کا اجماع ہوا ہو۔

فاطمین مصر کا عروج اور دنیا کے مختلف گوشوں میں شیعیان علیؑ کی حکومتوں کا قیام بھی امیرالمومنینؑ کی ایک بڑی کامیابی ہے چنانچہ آج بھی ایران' یمن اور مراکش میں شیعیان علیؑ کی حکومت قائم ہے۔ عراق بھی شیعہ اکثریت کا علاقہ ہے اور وہاں چھ آئمہ کی زیارت گاہیں ہیں جن کی وجہ سے عراق کو عالم اسلام

میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ خود شام میں جو آپ کے مخالفین کا سب سے بڑا مرکز تھا آج بکثرت شیعہ موجود ہیں اور مذہبی اعتبار سے تو شام کی ساری اہمیت آل رسولؐ کی مرہون کرم ہے اور مسجد اموی کے علاوہ شام میں جتنی زیارت گاہیں ہیں وہ سب امیرالمومنینؑ کے اصحاب اور اولاد سے تعلق رکھتی ہیں خود ہمارے برصغیر میں کروڑوں شیعہ رہتے ہیں اور جگہ جگہ امام باڑوں کی شکل میں آل رسولؐ سے تعلق رکھنے والی عمارتیں موجود ہیں۔ غرض آج اسلامی دنیا کے گوشہ گوشہ میں آپ کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے آپ کی اولاد یعنی سادات کرام کو ایک بلند تر مقام کا مالک سمجھا جاتا ہے اور آپ سے اظہار محبت و عقیدت کو ایمان کی نشانی تسلیم کیا جاتا ہے۔

اصولی اعتبار سے بھی دیکھئے تو امیرالمومنینؑ کی فتح مبین آج کے دور میں ناقابل انکار ہے اس لئے کہ آپ کے مقابلہ میں خلافت کے جتنے اصول وضع کئے گئے تھے ان کو آج کی اسلامی دنیا بالاتفاق مسترد کرچکی ہے چنانچہ۔

ا۔ قہر و غلبہ کے اصول کو آج کا کوئی مسلمان دلیل حق تسلیم نہیں کرتا اس لئے قہروغلبہ اول تو شخصی حکمرانی کے لئے ہوتا ہے جسے آج کا ہر مسلمان مردود قرار دیتا ہے اور دوسرے اسے حریت کے اصولوں کے منافی تسلیم کیا جاتا ہے انڈونیشیا، مصر، شام، ترکی اور پاکستان وغیرہ میں جمہوری حکومتوں کے قیام اور دوسرے ممالک اسلامیہ میں آئینی بادشاہت کا وجود قہر و غلبہ کے اصول کا عملی استرداد ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کے مسلمان اس مہمل اصول کے خلاف "اجماع" کر چکے ہیں جس کی اساس پر امیر معاویہ اور ان کے جانشینوں کی خلافت قائم ہوتی تھی۔

ب۔ نامزدگی کے اصول کو بھی عامتہ المسلمین نے ٹھکرا دیا ہے اس لئے کہ

جمہوریت اور دستوریت میں نامزدگی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ شوریٰ کا اصول بھی مسترد ہو چکا ہے اس لئے کہ آج کا مسلمان اسے کسی حالت میں قبول نہیں کرتا کہ چند اکابر و اعیان بند کمروں میں بیٹھ کر اس کی قسمت کا فیصلہ کردیں بلکہ آج حکمرانوں کا انتخاب عوام کے ووٹوں کے ذریعے کے جاتا ہے۔

۴۔ اجماع امت تو سرے سے ناممکن العمل شے ہے۔ چنانچہ اسی لئے مسلمانوں کے اکثریت رائے کے اصول کو اپنا لیا ہے جمہوریت کے اکثریت رائے والے اصولوں کا مسلمانوں میں تسلیم کرلیا جانا اس حقیقت کا عملی اعتراف ہے کہ اجماع ایک ناممکن العمل شے ہے اور اسلام ظاہر ہے کہ ایک ناممکن العمل شے کی تعلیم نہیں دے سکتا۔

خلافت کے ان چاروں وضعی اور بے بنیاد اصولوں کا مسترد کردیا جانا بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ ان اصولوں پر جو خلافتیں قائم کی گئی تھیں وہ بے اصل تھیں اور جن مفاد پسندوں نے اسلام کے ایک مہتم بالشان امر کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لینے کے لئے ایسے اصول گھڑ لئے تھے جن کو آج کے مسلمان نے سرے سے ناممکن العمل اور غلط قرار دے کر مسترد کردیا ہے اس سلسلہ میں ملت اسلامیہ کی یہ بدقسمتی بھی ملاحظہ کے قابل ہے کہ جو اصول اساس خلافت قرار دیئے گئے تھے وہ چونکہ سب باطل اور غلط ثابت ہوئے اور آج کا مسلمان ان کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہے۔ اس لئے سرے سے خلافت کا وجود ہی ختم ہوگیا ہے اور آئندہ بھی خلافت کا وجود میں آنا ناممکن ہے اس لئے کہ :

۱۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کا کسی ایک شخص کی ذات پر اجماع عملاً ناممکن ہے اس لئے کہ ایسی کوئی شخصیت ملنا محال ہے جو ساری دنیا کے مسلمانوں

میں مقبول و محبوب ہو۔

۲۔ نامزدگی کا بھی ایسی حالت میں ظہور میں آنا ناممکن ہے۔

۳۔ شوریٰ یعنی اکابر ملت کا فیصلہ بھی ناممکن العمل ہے اس لئے کہ اسے عام مسلمان اپنے حق رائے دہندگی کے منافی تصور کرتے ہوئے قبول نہیں کریں گے ـــــ اور

۴۔ قہر و غلبہ کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ اول تو ساری دنیائے اسلام پر بزور شمشیر کسی شخص کا قابض ہو جانا ناممکن ہے اور اگر یہ صورت ممکن بھی ہوجائے تو اس شخصی حکمرانی کو غیر اسلامی قرار دیا جائے گا اور اسے خلافت الیہ کا مرتبہ عطا کرنے پر کوئی مسلمان تیار نہیں ہوگا۔

خلافت کے باب میں مسلمانوں کے ان مزعومات کا ابطال امیرالمومنینؑ کی ایک ایسی عظیم الشان فتح ہے جس سے کوئی ہوش مند انسان انکار کی جرات نہیں کرسکتا۔

امیرالمومنینؑ نے ان چاروں اصولوں کو جو قریش اور بنی امیہ کے خلافت سازوں نے وضع کئے تھے غلط قرار دیا تھا اس لئے کہ آپ کی دوربین نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ ایک زمانہ وہ آئے گا جب مسلمان اطراف و اکناف عالم میں پھیل جائیں گے اس لئے اجماع نامزدگی اور شوریٰ کا امکان باقی نہیں رہے گا اور قہروغلبہ بھی ناممکن ہوجائے گا ایسی حالت میں اگر ان اصولوں پر خلافت کی اساس رکھی گئی تو دنیا سے خلافت کا وجود ہی ختم ہوجائے گا اور نظم ملی وضبط شریعت کا وہ اہم ترین رکن جسے سرکار دوعالمؐ کی خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے دنیا سے مفقود ہو جائے گا۔ مفاد پسندوں نے امیرالمومنینؑ کی بات نہیں مانی اور اس کا جو نتیجہ ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔ آج خلافت ہے اور نہ اس کے مبینہ اصول، دنیا علیؑ کی

اصابت رائے اور پختگی فکر کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہے۔ اور عملاً" یہ تسلیم کررہی ہے کہ مدینہ کے قریش اور دمشق کے امویوں نے چند اصول وضع کرکے ملت اسلامیہ کو خلافت کے سے عظیم بالشان ادارہ سے محروم کردیا۔ وقتی طور پر ان کی غرض ضرور پوری ہوگئی لیکن ملت اسلامیہ ان کی مفاد پسندی پر قربان ہوگئی۔ مسلمان شریعت کے ایک اہم جزو سے محروم ہوگئے ہیں اور عقیفہ کی سازش نے مسلمانوں کی سیاسی وحدت کا جنازہ نکال دیا۔

یہ ہے امیرالمومنین کی وہ عظیم بالشان کامیابی جس پر عصر حاضر کا ہر مسلمان ایک خاموش گواہ بنا ہوا ہے اور چاہے زبانوں سے آج بھی اجماع نامزدگی' شوریٰ اور غلبہ کے الفاظ جاری کئے جاتے ہوں لیکن ملت اسلامیہ کا عمل اس کی گواہی دے رہا ہے کہ :۔

> یہ چاروں اصول باطل ہیں' اس لئے ان کی اساس پر جو خلافت قائم کی گئیں وہ بھی باطل تھیں اور خلافت حقہ وہی تھی' اس کا سچا اور دائمی اصول وہی تھا جس کا اعلان میدان غدیر میں کیا گیا تھا۔

☆ —— ☆☆ —— ☆

صلح حسنؑ

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد تحریک اسلامی کی قیادت کا بار گراں اس عظیم المرتبت امام کے کاندھوں پر آیا جسے دنیا سبط اکبر اور سید شباب اہل الجنت کے لقب سے یاد کرتی ہے۔

امام حسن علیہ السلام کی ذات گرامی پر دشمنوں نے ایسے پردے ڈال دیئے ہیں کہ دوست بھی آپ کے محیر العقول کارناموں سے بے خبر ہو گئے ہیں اور یہ تاریخ کا ایک المیہ ہے جس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے وہ کم ہے۔

اس سید مظلوم نے جس وقت قوم کی قیادت سنبھالی اس وقت کے حالات کم و بیش کچھ ایسے تھے۔

۱۔ عراقی اپنا جذبہ جہاد کھو چکے تھے اور اسلام کی خاطر مزید جنگ جاری رکھنے پر تیار نہیں تھے۔ ان پر تھکن طاری ہو چکی تھی۔ ان کے بازو جھول چکے تھے۔ دلوں پر اضمحلال طاری ہو چکا تھا اور اب وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ ان سے کسی انقلابی یا اصولی تحریک میں مدد لی جا سکتی۔

۲۔ حجازیوں پر موت اس طرح طاری ہو چکی تھی کہ معاویہ کے سپاہیوں نے حجازی عورتوں کو کنیزیں بنایا لیکن ان کی رگ حمیت جوش میں نہ آئی۔ بسر بن ارطاۃ نے مکہ پر لشکر کشی کی لیکن حجازی خاموش رہے اور اس طرح انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ان میں اب اتنا بھی مذہبی جذبہ باقی نہیں ہے کہ وہ خانہ کعبہ کی حفاظت نہ سہی خود اپنی عزت و آبرو کا تحفظ بھی کر

سکیں۔

۳۔ مصری اور ایرانی اسلام کی انقلابی تحریک سے تقریباً" ناآشنا تھے۔ ان کو تلوار کے سہارے اسلام پہنچا تھا اور ان لوگوں کے ذریعے پہنچا تھا جو خود اسلام کے مقاصد سے بڑی حد تک ناآشنا تھے اس لئے ان سے کسی اصولی جنگ میں مدد ملنے کا امکان نہیں تھا۔

۴۔ مسلمانوں کے نفوس اتنے خراب ہو چکے تھے کہ امیر معاویہ کا روپیہ بڑے بڑے مسلمان اکابر کو آسانی سے خرید لیتا تھا۔

۵۔ مسلمانوں کے ذہنوں سے حکومت الٰہیہ کا تصور قطعاً" ختم ہو چکا تھا۔ اور ان کے ذہن یہ سمجھنے سے قاصر ہو چکے تھے کہ علیؑ اور معاویہ کی حکومت میں فرق کیا ہے؟ انہوں نے حکومت الٰہیہ کو بادشاہت کا مترادف سمجھنا شروع کر دیا تھا اور خلافت قیصریت کی ہم معنی قرار پا گئی تھی۔

۶۔ جہالت کے نتیجہ میں مسلمانوں کے عقائد بگڑنا شروع ہو گئے تھے اور تحصیل علم کے وسائل کم ہوتے جا رہے تھے۔

۷۔ سلمانؓ' ابوذرؓ' عمار اور ایسے ہی دوسرے بہت سے صحابہ کبار جو علم کے ستون' ہدایت کے مینارے اور شریعت کے امین تھے دنیا سے اٹھ چکے تھے اور جو لوگ باقی تھے وہ افلاس' کسمپرسی اور بے چارگی کا شکار ہو چکے تھے۔

۸۔ شریعت اسلامی کے برباد ہو جانے کا وقت قریب آ چکا تھا۔ اس لئے کہ مسلمانوں میں اتنی سکت باقی نہیں تھی کہ وہ اسے شامیوں کی دستبرد سے محفوظ رکھ سکیں۔

۹۔ مسلمان روحانی' اخلاقی اور دینی قدروں سے اتنے بیگانہ ہو چکے تھے کہ ان کو دوبارہ "مسلمان" بنانے کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔

۱۰۔ مملکت اسلامی میں ہر طرف فتنہ و فساد کی آگ بھڑکنا شروع ہو گئی تھی اور امن و نظم کا خاتمہ ہوتا جا رہا تھا۔ بدامنی کی حالت میں علم، دین، تہذیب، تمدن، اخلاق اور دوسری اعلیٰ انسانی قدریں ختم ہو جاتی ہیں اس لئے جوں جوں "بدامنی" میں اضافہ ہو رہا تھا ووں ووں "انسانیت" کے اس اعلیٰ تصور کے مٹ جانے کے خطرات پیدا ہوتے جا رہے تھے جسے دنیا میں عام کرنا اسلام کا اولین مقصد تھا۔

۱۱۔ مملکت اسلامی میں بدنظمی پیدا ہو جانے کے نتیجہ میں یہ خطرہ بھی ابھرنے لگا تھا کہ غیر مسلم طاقتیں دنیائے اسلام پر لشکر کشی کر کے اسلام کو فنا کر دیں گی اس لئے کہ اسلام گرد و پیش کے ممالک کی نگاہوں میں بری طرح کھٹک رہا تھا اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی قوت نے ہمسایہ ممالک کو مسلمانوں سے خوفزدہ کر دیا تھا۔

۱۲۔ ممالک غیر میں اسلام کی تبلیغ کا کام تقریباً بند ہو چکا تھا اس لئے کہ اندرونی خلفشار کی حالت میں اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔

ایسی حالت میں تحریک اسلامی کے دوسرے قائد کو جو کام انجام دینا تھے وہ مندرجہ ذیل تھے:۔

۱۔ دنیائے اسلام کو بنی امیہ کی اسلام دشمنی سے نجات دلائی جائے۔

۲۔ ملک میں داخلی سکون کا بندوبست کیا جائے تاکہ امن و سکون کی فضا میں مسلمانوں کی تربیت نفس کا انتظام کیا جا سکے۔ ان کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے روشناس کرایا جائے۔ قرآن اور حدیث کی تعلیم عام کی جائے۔ عوام کی اخلاقی حالت بہتر بنائی جائے اور مسلمانوں کو پھر ایک بار اس دین حقیقی سے آشنا کرایا جائے جسے وہ اب تقریباً بھول چکے تھے۔

۳۔ غیر ممالک تک اسلام کی آواز پہنچائی جائے اور غیر اسلامی قوتوں کا زور بل توڑ کر دوبارہ ان کے دلوں پر مسلمانوں کی ہیبت قائم کر دی جائے۔

لیکن سوال یہ تھا کہ ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ کیا ہو؟

جس وقت امام حسن علیہ السلام نے اسلام کے روحانی مشن کی قیادت سنبھالی اس وقت تلواریں کھنچی ہوئی تھیں۔ شام اور عراق کا سرحدی علاقہ ایک فوجی چھاؤنی نظر آ رہا تھا اور امیر معاویہ کی طاقت بڑھتی جا رہی تھی اس لئے کہ جہاں شامی سپاہی انتقام کے جذبہ میں سرشار پوری قوت سے ان کا ساتھ دے رہے تھے وہیں مسلمان موصوف کی سازشوں اور زرپاشیوں کے نتیجہ میں بنی امیہ کے ساتھ شامل ہوتے جا رہے تھے۔ امیر معاویہ کی طاقت بڑھنے کا اب ایک اور سبب بھی پیدا ہو گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ موصوف نے اپنی جنگ کو حصول خلافت کی جنگ قرار دے دیا تھا اور اس طرح :-

۱۔ عام مسلمانوں کے ذہنوں سے یہ خوف دور ہو گیا تھا کہ امیر معاویہ کی کامیابی اسلام کی بربادی پر منتج ہو گی یا کامیاب ہونے کے بعد بنو امیہ ایام جاہلیت کی اصنام پرستی کو دوبارہ رائج کر دیں گے۔

۲۔ آل رسولؐ کے سارے دشمن جو الٰہی نظام حکومت کو اپنے مفادات اور اپنی زر اندوزی کے منافی تصور کرتے تھے اب آسانی سے امیر معاویہ کا ساتھ دے سکتے تھے۔

۳۔ قریش چونکہ الٰہی حاکمیت کے مقابلے میں انسانی حاکمیت کے اصول کے ہمیشہ علمبردار رہے تھے اس لئے ان کو امیر معاویہ کی خلافت سے کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا تھا بلکہ اس میں ان کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ جس نسلی عصبیت کے عادی تھے وہ بنی امیہ کی حکمرانی میں پورے شباب کے

ساتھ ظہور میں آسکتی تھی۔

۳۔ وہ عراقی مسلمان بھی جو امیر معاویہ کے مقابلے میں حضرت علی علیہ السلام کا ساتھ دے رہے تھے انسانی حاکمیت کے تصور کے پروردہ تھے اور حضرت علی علیہ السلام کے شہید ہو جانے کے بعد خلیفہ کے "انتخاب" کے معاملہ میں وہ "آزاد" ہو چکے تھے۔ یہ لوگ بھی خلافت کو کوئی منصوص من اللہ منصب نہیں مانتے تھے اور نہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ اولی الامر کو معصوم ہونا چاہیے۔ ان کے ذہنوں میں یہ عقیدہ بالکل رچا بسا ہوا تھا کہ ہر مسلمان خواہ وہ ذاتی اعتبار سے کیسا ہی کیوں نہ ہو خلیفہ رسولؐ ہو سکتا ہے اس لئے معاویہ کی خلافت مان لینے میں ان کو کیا عذر ہو سکتا تھا؟ اور وہ بھی اس حالت میں جب کہ امیر معاویہ کا ساتھ دینے میں دنیوی منفعت بھی مضمر تھی۔ ایسی حالت میں عراقی بھی رفتہ رفتہ امیر شام کے ساتھ ہوتے جا رہے تھے۔

ان حالات میں اگر حضرت امام حسن علیہ السلام جنگ جاری رکھتے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ :-

۱۔ آپ اور آپ کے ساتھی سچے مسلمان جو شریعت کے خزینہ دار، دین کے ستون اور علم و ہدایت کے امین تھے قتل ہو جاتے اور حقیقی اسلام تبلیغ کرنے والا یا دین مبین کے حقائق دنیا کے سامنے پیش کرنے والا کوئی باقی نہ رہتا۔

۲۔ جنگ کی حالت میں شامی سپاہیوں کا انتقامی جذبہ بیدار رہتا اور اسلام اور اس کے مآثر کو مٹا دینے کی جو تمنا ان کے دلوں میں موجزن تھی وہ برابر موجود رہتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ آل رسولؐ کی شکست کے نتیجہ میں شامی

اسلام اور اس کے ماثر کو فنا کر دیتے۔

۳۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ جنگ جاری رکھنے کی صورت میں امام حسن علیہ السلام کو فتح حاصل ہو جاتی' حالانکہ یہ قطعاً" بعید از قیاس ہے۔ تب بھی امام کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اسلامی نظام حکومت قائم فرماتے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے نفوس اتنے بگڑ چکے تھے اور حرص دنیا ان پر اس حد تک غالب آ چکی تھی کہ اب وہ اس نظام زندگی کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے جو علوی نظام حکومت کا خاصہ تھا۔

ایسی حالت میں فتح حاصل کرنا بے سود تھا اس لئے کہ امام حسن علیہ السلام کے نزدیک فتح حاصل کرنے کا مقصد اپنی ذاتی بادشاہت قائم کرنا نہیں تھا بلکہ فتح کا مقصد اس نظام حکومت ایسہ کو وجود میں لانا تھا جس کا وجود میں آنا اب تقریباً" ناممکن ہو چکا تھا۔ اس لئے کہ نفوس کے بگڑ جانے' عقائد کے کمزور ہو جانے' قلوب پر دنیا پرستی طاری ہو جانے اور جذبہ دینی کمزور پڑ جانے کے بعد ایک دنیوی حکومت تو قائم ہو سکتی ہے لیکن ایک خالص اصولی شرعی اور دینی حکومت کا قیام ناممکن ہے۔

امام حسن علیہ السلام بادشاہ ہوتے تو ان کو اس سے کوئی غرض نہ ہوتی کہ عوام کے نفوس کا کیا عالم ہے؟ ان کی اخلاقی اور روحانی حیثیت کیا ہے؟ اور مذہب کے باب میں ان کی حالت کیا ہو رہی ہے؟ ان کو اگر مطلب ہوتا تو اپنی اپنی حکومت سے' خزانوں سے' دولت سے' خدام و حشم سے' شاہانہ جاہ و جلال سے' محلات و قصور سے اور جب تک ان کو یہ سب چیزیں حاصل رہتیں تب تک ان کو عوام کی حالت سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی۔ لیکن حسن' امام تھے بادشاہ نہیں تھے۔ تحریک اسلامی کے قائد تھے سلطان نہیں تھے۔ امیرالمومنین اور خلیفہ رسول

تھے۔ دنیوی حکومت کے طالب نہیں تھے۔ ان کا کام ایک شاندار محل میں بیٹھ کر داد عشرت دینا نہیں تھا' مسلمانوں کے نفوس کی اصلاح کرنا اور دین کی تبلیغ کرنا تھا۔ وہ جواہرات سے کھیلنے کے لئے خلق نہیں ہوئے تھے' اسلامی تحریک کو پروان چڑھانے کے لئے پیدا کئے گئے تھے۔ ان کو حکومت سے اگر کچھ دلچسپی ہو سکتی تھی تو اس لئے نہیں کہ ان کا حکم چلے بلکہ اس لئے کہ اللہ کے احکام نافذ ہوں۔ ان کا مقصد حکمرانی ذاتی انتقام نہیں تھا دین کا فائدہ اور ملت کی شرعی خطوط پر تنظیم ان کا مطلوب تھی اور جس حکومت سے یہ مقصد ہی پورا نہ ہو اس کی ان کو کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ایسی حکومت کا حاصل ہونا تحریک اسلامی کے قائد کی مقصدی شکست اور اس کے نقطہ نظر سے ایک قطعاً فضول اور بے کار سی بات تھی۔ اس لئے امام نے وہ کیا جو حکمت ربانی کے امین کی حیثیت سے آپ کو کرنا چاہیے تھا۔ آپ نے معاویہ سے "صلح" کر لی اور حکومت سے دستبردار ہو گئے۔

اس "صلح" پر کج فہم اور کم عقل لوگ بڑا اعتراض کرتے ہیں لیکن اعتراضات دراصل ان کی کوتہ نظری اور ناسمجھی کے علاوہ اور کسی شے کا پتہ نہیں دیتے' وہ یہ نہیں سمجھتے کہ:

۱۔ اس "صلح" کے نتیجے میں امام حسن علیہ السلام اس شکست سے بچ گئے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ آل رسولؐ ذبح ہو جاتی۔ اسلام کے سچے پرستار قتل ہو جاتے اور دنیا سے اسلام اور اس کی تعلیمات کا خاتمہ ہو جاتا۔

۲۔ اس "صلح" کے نتیجے میں حدود مملکت اسلامی میں امن و امان قائم ہو گیا جس کے نتیجے میں امام حسن علیہ السلام کو یہ موقع مل گیا کہ آپ پرسکون حالات میں اسلام کی تبلیغ کر سکیں اور جہالت کے نتیجے میں اسلامی تصور زندگی پر جو پردے پڑ چکے تھے ان کو دور کر کے عربوں کے سامنے پھر

ایک بار اس اسلام کو پیش کر دیں جسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے پیش فرمایا تھا۔

۳۔ مرکز حکومت دمشق منتقل ہو جانے کی وجہ سے مدینہ سیاسی آویزشوں اور دنیاداروں کی سرگرمیوں سے بڑی حد تک پاک ہو گیا اور آل رسولؐ کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اس بلد محترم میں قیام پذیر ہو کر دوبارہ اسی شہر سے اسلام کا آوازہ بلند کرے جہاں سے خود رسول پاکؐ نے چاردانگ عالم میں اپنی آواز پہنچائی تھی۔ امام حسن علیہ السلام نے رفتہ رفتہ مدینہ کو وہی شکل عطا کرنا شروع کی جو امیرالمومنین علیہ السلام نے کوفہ کو عطا فرمائی تھی اور اپنی علمی سرگرمیوں کے ذریعے مدینہ کو ایک علمی مرکز کی شکل میں تبدیل کرنا شروع کر دیا۔

۴۔ مدینہ کی مذہبی حیثیت کے پیش نظر ہر جگہ کے مسلمان اس شہر میں آتے تھے اور قبر رسولؐ کی زیارت کے بعد آل رسولؐ کی زیارت سے بھی مشرف ہوتے تھے۔ ان مسلمانوں کے ذریعے پوری دنیائے اسلام میں حقیقی اسلام کی تبلیغ کا موقع حاصل کر لیا گیا۔

۵۔ امام حسن علیہ السلام کی اسی تعلیم اور تبلیغ کا نتیجہ یہ تھا کہ کچھ عرصہ میں ایسے دیندار سرفروش اور فداکار مسلمانوں کی جماعت تیار ہو گئی جس نے کربلا کے میدان میں اپنے خون کی پاک دھاروں سے چمنستان اسلام کو بہار جاوداں عطا کر دی۔ اگر امام حسن علیہ السلام نے معاویہ سے جنگ بند کر کے اپنی سرگرمیاں اسلام حقیقی کی تبلیغ و اشاعت پر مرکوز نہ کر دی ہوتیں تو معرکہ کرب و بلا کا وجود میں آنا ناممکن تھا۔ اگر یہ معرکہ وجود میں آتا بھی تو اس کے وہ ہمہ گیر اثرات ہرگز مرتب نہ ہوتے جو بعد میں ظہور

میں آئے۔ اس لئے کہ قربانی اسی وقت صحیح معنوں میں اثرانداز ہوتی ہے جب عوام ان بنیادی اصولوں سے متفق ہوتے ہیں جن کے لئے قربانی پیش کی جاتی ہے۔ یہ قربانی مردہ دلوں کو زندہ اور سوئے ہوئے ضمیروں کو بیدار کر دیتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں عوام کی عملی قوتیں جاگ پڑتی ہیں اور وہ ایک بے حس جمود پرور گروہ کے بجائے ایک زندہ، متحرک اور فعال جماعت بن جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ تبھی ہوتا ہے جب عوام کے ذہن ایک تصور کی صحت، ایک عقیدہ کی درستی، ایک فکر کی اصابت یا ایک نظریہ کی حقیقت کے دل سے قائل ہو جاتے ہیں۔ جب عوام ایک چیز کو صحیح جاننے اور ماننے لگتے ہیں اور پھر اس چیز کے حق میں کوئی قربانی بھی پیش کر دی جاتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام میں ایک جوش اور ایک ولولہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس قربانی کے نتیجہ میں پوری قوم اس تصور کو کامیاب بنانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر حضرت امام حسن علیہ السلام امیر معاویہ سے "صلح" کر کے اسلام کے صحیح تصورات کو عام نہ کر دیتے تو امام حسین علیہ السلام کی قربانی قطعاً" رائگاں جاتی اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ضمیر ہرگز اس شان سے بیدار نہ ہوتے جس کا مظاہرہ اس عدیم النظیر قربانی کے بعد ہوا۔ مسلمانوں نے معرکہ کربلا کے بعد جس زندگی کا مظاہرہ کیا وہ دراصل اس تبلیغ اور تعلیم کا نتیجہ تھی جو امام حسن علیہ السلام نے فرمائی تھی اور جس کے نتیجے میں دنیائے اسلام کا گوشہ گوشہ آل رسولؐ کی تحریک اسلامی سے واقف ہو چکا تھا۔

تحریک کے بنیادی تصورات عام ہو جانے کے نتیجہ میں مخلصین کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آگیا جو اس تحریک کو علمی سطح سے بلند کر کے ایک عملی اور جاودانی

سطح پر لانے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر تیار تھا۔ یہی وہ جماعت تھی جس نے کربلا کے بن میں وہ عدیم المثال قربانی پیش کی جس پر تاریخ اسلام قیامت تک ناز کرتی رہے گی۔

امام حسن علیہ السلام کی عظیم قائدانہ صلاحیتوں کا اس سے بڑا مظاہرہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ آپ نے اسلامی تحریک کو جماعتی اور عوامی نفسیات کے مطابق ڈھال دیا۔ عصر حاضر کی تحریکات پر نظر ڈالئے تو آپ دیکھیں گے کہ وہی تحریکات کامیاب ہوتی ہیں جن کے قائدین مندرجہ ذیل طریق کار اختیار کرتے ہیں:۔

۱۔ سب سے پہلے اس تحریک کے حق میں زمین ہموار کی جاتی ہے۔ تحریک کے بنیادی تصورات کی خوب اشاعت کی جاتی ہے۔ ان کو عوام میں مقبول بنایا جاتا ہے۔ عوام کے ذہنوں میں اس کی صحت و اصابت کا یقین پیدا کیا جاتا ہے اور جب تحریک کے اساسی مقاصد عام ہو جاتے ہیں تو

۲۔ ایسے افراد تیار کئے جاتے ہیں جو اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے قربانیاں پیش کر سکیں تاکہ ان قربانیوں کے نتیجہ میں عوام میں جوش پیدا ہو جائے اور تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔

امام حسن علیہ السلام نے یہی سائنٹفک طریقہ اختیار کیا اور "صلح" کے نتیجہ میں وہ مہلت حاصل کر لی جس سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف تو آپ نے اسلامی تحریک کو عام کر دیا جو جہالت، بدامنی، غرض مندی، حرص دنیا اور اسی قسم کی چیزوں کے نتیجہ میں دب گئی تھی اور دوسری طرف مخلصین کی وہ جماعت تیار کر دی جس نے معرکہ کربلا میں اپنے خون سے اس تحریک کی جڑوں کو اتنا مضبوط کر دیا کہ انسانی حاکمیت کے تیرہ سو سال بھی آج تک حکومت الہیہ کے اس تصور کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے جسے حسنین علیہم السلام عام کرنا چاہتے

ہم نے غلط "صلح" کو جگہ جگہ قوسین میں لکھا ہے اس لئے کہ ہمارا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ امیر شام اور امام حسن علیہ السلام کے مابین جو معاہدہ ہوا تھا وہ ہرگز "صلح" کا معاہدہ نہیں تھا اور یہ ایک تاریخی ہولناک غلط فہمی ہے جس میں یا تو مورخین خود غلط ہوئے ہیں یا بنی امیہ کے پروپیگنڈہ نے ان کو غلط کر دیا ہے (۱) مصنف

امام حسن علیہ السلام نے امیر معاویہ سے ہرگز صلح نہیں کی اس لئے کہ صلح کا مقصد ہوتا ہے دلوں کا صاف ہو جانا' جنگ کا خاتمہ ہو جانا' میل ملاپ ہو جانا' دوستانہ تعلقات بحال ہو جانا اور آپس کی آویزش کا ختم ہو جانا لیکن دنیا کا کوئی مورخ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ امیر معاویہ اور امام حسن علیہ السلام میں صفائی ہو گئی تھی۔ دوستانہ فضا قائم ہو گئی تھی یا اس ٹکراؤ کا خاتمہ ہو گیا تھا جو آل سفیان اور آل رسولؐ میں مدت سے جاری تھا۔

واقعہ صرف اتنا ہے کہ امام حسن علیہ السلام اور امیر معاویہ کے مابین "صلح کا معاہدہ" نہیں ہوا تھا

بلکہ

"التوائے جنگ" یا "جنگ بندی" کا معاہدہ ہوا تھا جسے انگریزی زبان میں Cease Fire کہتے ہیں۔

جنگ بندی کے اس معاہدہ کا مطلب صرف اتنا ہوتا ہے کہ طرفین اپنے اپنے موقف پر قائم ہیں لیکن ایک دوسرے کے مقابلہ میں تلواریں نہیں چلا رہے ہیں۔ التوائے جنگ کا مقصد صلح نہیں ہوتا' صرف تیغ و تفنگ کا استعمال ترک کر

دینا ہوا کرتا ہے۔ امام حسن علیہ السلام نے جو کچھ کیا تھا وہ صرف اتنا ہی تھا کہ آپ نے شمشیر و سنان کی جنگ بند کر دی تھی لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں تھے کہ آپ نے مطلق جنگ ہی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ آپ نے "گرم جنگ" کا رخ "سرد جنگ" کی جانب موڑ دیا تھا اور نمود شمشیر کی جگہ "اعصابی جنگ" (Cold War or War of Nerves) شروع کر دی تھی۔ یہ ہے حقیقت اس معاہدہ کی جسے "صلح حسن" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس کی بنیاد پر نافہم لوگ جو حکمت ربانی کے مصالح کو نہیں سمجھتے یا فکر امامت کی بلند پروازیوں کا کوئی اندازہ نہیں رکھتے' طرح طرح کے اعتراضات کیا کرتے ہیں۔

امام حسن علیہ السلام نے امیر معاویہ سے "صلح" کر لی ہوتی تو معقولی دیانت اور شرافت کا تقاضا یہ تھا کہ آپ کبھی معاویہ کے خلاف لب کشائی نہ کرتے۔ اس کی حکومت کو جائز مان لیتے اور اس حکومت کا ساتھ دیتے لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ معاہدہ پر دستخط کرتے ہی خود امیر معاویہ کے خیمہ میں امام حسن علیہ السلام نے جو خطبہ پڑھا اس کا آغاز آپ نے ان الفاظ سے کیا کہ:۔

"ایھا الناس! ہم تمہارے رسولؐ کے اہل بیتؑ ہیں۔
ہم تمہارے امیر اور سردار ہیں۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے ہر
رجس سے پاک کیا ہے"۔

"ہم تمہارے امیر ہیں" کا دعویٰ بجائے خود یہ ثابت کر رہا ہے کہ امام حسن علیہ السلام اپنے سابقہ موقف پر قائم تھے۔ اپنے حق خلافت سے دستبردار نہیں ہوئے تھے' امیر معاویہ کو جائز حکمران تسلیم نہیں کرتے تھے اور آپ نے صرف التوائے جنگ کا معاہدہ کیا تھا تاکہ اب تلوار کی اس جنگ کے بجائے جس میں شکست ہو جانا لازمی تھا۔ عدم تشدد والی جنگ کا آغاز کر کے اس تدبیر سے

دشمن کو شکست فاش دے دی جائے۔

امیر معاویہ بھی ناسمجھ نہیں تھے' وہ یہ جانتے تھے کہ امام حسن علیہ السلام نے جنگ ختم نہیں کی ہے بلکہ صرف شمشیر و سنان کا مظاہرہ بند کیا ہے۔ آل رسول اور بنی امیہ' حق اور باطل کے مابین صلح نہیں ہوئی ہے بلکہ صرف جنگ کا انداز بدل دیا گیا ہے۔ جنگ اب بھی جاری ہے۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ اب یہ جنگ تلوار سے نہیں لڑی جائے گی' زبان و قلم سے لڑی جائے گی۔ اس کا فیصلہ میدان حرب و ضرب میں نہیں ہو گا۔ سیاست اور علم کی بزم میں کیا جائے گا۔ چنانچہ امیر معاویہ بھی غافل نہیں رہے اور انہوں نے اس "اعصابی جنگ" میں فتح حاصل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ امیرالمومنین پر سب و شتم اور آل رسول کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈا اسی سلسلہ کی مختلف کڑیاں تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ امام کی عقل چونکہ عام عقول بشری سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اس لے امیر معاویہ اس "جنگ" میں بری طرح ہارے اور امام حسن علیہ السلام کو ان کے مقابلہ میں وہ فتح مبین حاصل ہوئی جس کی وہ تاریخیں بھی گواہ ہیں جو بنی امیہ کے اثرات کے ماتحت لکھی گئی ہیں۔

معاہدہ کرتے وقت امیر معاویہ نے شاید یہ محسوس کیا ہو کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ان کو یہ محسوس ہو گیا کہ ان کو سیاسی اعتبار سے زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے اور امام حسن علیہ السلام نے تلوار کی جنگ روک کر ان کو ایسی زک دی ہے جو ان کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ اپنے دل کے پردوں میں جس اسلام کو مٹانے کے تمنائی تھے اس کی حسن بہ اطمینان م تبلیغ کر رہے تھے۔ مسلمانوں میں بنی امیہ کی بادشاہت کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا جا رہا ہے اور رفتہ رفتہ عوام میں یہ

احساس بیدار ہو رہا ہے کہ ان کی قیادت و رہنمائی کا کام صرف آلِ رسولؐ ہی انجام دے سکتی ہے ان کی دوربین نگاہوں نے یہ دیکھ لیا کہ حسنؑ جس روش پر چل رہے ہیں اس کا لازمی نتیجہ ایک دن دولت بنی امیہ کے زوال کی شکل میں برآمد ہو گا اور آلِ رسولؐ کی تبلیغی مہم وہ بارود ثابت ہو گی جس سے بنی امیہ کے اقتدار کا محل بھک سے اڑ جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ محسوس کیا کہ حسنؑ نے معاہدہ کے جو شرائط رکھے ہیں ان کے نتیجہ میں جہاں آلِ رسولؐ حکومت امیہ کے تصورات کو عام کرنے اور اسلام کے ملوکیت دشمن نظام زندگی کو دنیا کے سامنے پیش کرنے میں پورے طور پر آزاد ہے وہیں ان شرائط نے بنی امیہ کے ہاتھوں کو باندھ کے رکھ دیا ہے۔ ان کو بے بس بنا ڈالا ہے اور ان کو کسی جوابی کارروائی کے قابل نہیں رکھا ہے۔ اس لئے کہ جب معاہدہ کی رو سے بنی امیہ علی اور آلِ علی پر سب و شتم نہیں کر سکتے اور علی کے دوستوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ تحریک اسلامی پھلتی پھولتی رہے گی۔ الٰہی نظام زندگی کی تبلیغ جاری رہے گی اور لوگ ملوکیت کے اثرات بد کو دیکھتے ہوئے رفتہ رفتہ اس خلافت ربانی کی جانب جھکتے چلے جائیں گے جس کے امام حسن علیہ السلام علمبردار تھے۔ اس سیاسی شکست سے بچنے کے لئے امیر معاویہ اس پر مجبور ہو گئے کہ معاہدہ کی خلاف ورزی کریں چنانچہ شیعیان علیؑ پر جو اسلام حقیقی کے داعی اور مبلغ تھے سختیاں شروع کر دی گئیں۔ حجر بن عدی، رشید ہجری اور دوسرے ممتاز علمائے اسلام قتل کرا دیئے گئے۔ حضرت علی علیہ السلام پر سب و شتم کیا جانے لگا اور جب یہ محسوس کیا گیا کہ ان تدبیروں سے بھی کام نہیں نکلتا حسنؑ کی تبلیغ مملکت کو بنی امیہ کے لئے ایک کوہ آتش فشاں میں تبدیل کرتی جا رہی ہے۔ عوام بنی امیہ کی حقیقت کو سمجھنے لگے ہیں۔ مردہ دلوں میں اسلام کی روح

بیدار ہونے لگی ہے اور تخت خلافت کی چولیں کمزور ہوتی جا رہی ہیں تو آخری تدبیر یہ اختیار کی گئی کہ امام حسن علیہ السلام کو زہر دے دیا جائے اور اس طرح اس دولت بنی امیہ کو تباہی سے بچا لیا جائے جسے امام حسنؑ کی تبلیغی جنگ اندر ہی اندر سے کھوکھلا کرتی چلی جا رہی تھی۔

اگر امیر معاویہ اور امام حسن علیہ السلام میں واقعی "صلح" ہو گئی ہوتی تو امام حسن علیہ السلام کو زہر دلوانے کی امیر معاویہ کو کوئی ضرورت پیش نہ آتی اور یہ بھی [illegible]
[illegible]
نہیں ہو رہا تھا۔ حملہ و دفاع کی جنگ ہو رہی تھی اور اس میں چونکہ امیر معاویہ مات کھا رہے تھے اس لئے وہ اس پر مجبور ہو گئے تھے کہ اپنے حریف کو زہر دلا کے اس کا کام تمام کرا دیں تاکہ اس شکست سے محفوظ رہ سکیں جو ان کے سر پر منڈلا رہی تھی۔

لیکن امیر معاویہ اپنی ان تدبیروں میں بھی ناکام رہے اس لئے حکومت الہیہ کا تصور ابھر کے رہا اور بنی امیہ کے خلاف ایسی نفرت پھیلی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں نہ صرف یہ کہ ان کی بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا ان کی نسل تک دنیا سے فنا ہو گئی بلکہ ان کی قبروں کے نشان تک محو ہو گئے اور یہ سب نتیجہ تھا امیر معاویہ کی اس سیاسی غلطی کا کہ انھوں نے عین اس وقت جبکہ فتح ان کے سامنے تھی التوائے جنگ کے معاہدہ پر دستخط کر دیئے اور امام حسنؑ کو اس کا موقع دے دیا کہ وہ بنی امیہ کی جیتی ہوئی بازی کو الٹ کر اس اسلام دشمن جماعت کے مکمل خاتمہ کا بندوبست کر دیں۔

امیر معاویہ نے اس ہولناک نتیجہ سے بچنے کے لئے معاہدہ کی خلاف

ورزیاں شروع کیں جس کا ایک معمولی نتیجہ یہ ہے کہ ان کو دائمی بدنامی کا شکار ہونا پڑا اور آج دنیا کے ہر انصاف پسند انسان کی نگاہ میں وہ ایک معاہدہ سے منحرف انسان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امام حسن علیہ السلام معاہدہ کرتے وقت اس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے کہ معاویہ اس کی پابندی نہیں کریں گے لیکن اس کے ساتھ ہی آپ اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف تھے کہ معاویہ کی جانب سے شرائط معاہدہ کی خلاف ورزی تحریک اسلامی کو کمزور نہیں کر سکے گی' اسے مضبوط تر بنا دے گی۔ اس لئے کہ بدعہدی' مظالم' قتل' خونریزی اور سازشیں عوام کو بنی امیہ سے اور زیادہ بدظن کر دیں گی اور یہ اموی تدابیر بنی امیہ کے اقتدار کو مستحکم کرنے کے بجائے اس کے خاتمہ کا جلد تر بندوبست کر دیں گی۔ چنانچہ وہی ہوا جو امام کا اندازہ تھا۔ امیر معاویہ نے وہی کیا جس کا امام کو علم تھا اور اس کا نتیجہ بھی وہی ہوا جس کی امام کو امید تھی۔ بنی امیہ کے مظالم نے چند ہی سال میں عوام کو ان کی حکومت سے متنفر کر دیا اور ان میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ مسلمانوں کی قیادت اور امارت کے حقدار صرف آل رسولؐ کے افراد ہیں اور یہی امیر معاویہ کی سیاسی شکست تھی۔

اس معاہدہ سے امیر معاویہ کو بس ایک فائدہ ہوا اور وہ یہ کہ ان کو حکومت مل گئی لیکن ہم اسے ان کی فتح نہیں قرار دے سکتے اس لئے کہ ان کو جن شرائط کے ساتھ حکومت ملی تھی وہی خود اس حکومت کی تخریب کا سبب تھے اور اس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ بنی امیہ کا مقصد اصلی یعنی اسلام کو مٹا دینا ختم ہو گیا بلکہ وہ حکومت بھی کچھ عرصہ میں ختم ہو گئی جس کے لئے امیر معاویہ نے خود اپنے ہاتھوں اپنے خاندان کی تحریک کا گلا گھونٹنا قبول کر لیا تھا۔ امیر معاویہ کو بادشاہت ضرور نصیب ہوئی لیکن ایک ایسی بادشاہت جو ان کے لئے دائمی بدنامی کا تمغہ بنی

اور پھر یہ حکومت بھی کتنے دنوں چلی۔ بیس سال امیر معاویہ حکمران رہے اور ساڑھے تین سال ان کی اولاد ــــ اس کے بعد حکومت کے ساتھ ہی نسل تک کا خاتمہ ہو گیا اور حکومت آل ابوسفیان سے نکل کر آل مروان میں چلی گئی۔ یہ تھا وہ فائدہ جو امیر معاویہ نے حاصل کیا اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کوئی بڑی کامیابی تھی؟

اب آیئے یہ دیکھیں کہ اس معاہدہ سے امام حسن علیہ السلام نے کیا کھویا؟

یہ کہنا غلط ہے کہ امام حسن علیہ السلام نے امیر معاویہ کو "خلافت" دے دی اس لئے کہ "خلافت" ایک ایسا منصب ربانی ہے جو نہ معاہدوں سے بٹا کرتا ہے اور نہ تلواروں سے چھنا کرتا ہے۔ خلافت تقسیم ہونے والی چیز نہیں ہے اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ امام حسن علیہ السلام نے امیر معاویہ کو خلافت دے دی یا امیر معاویہ نے خلافت لے لی۔ امیر معاویہ کو دراصل بادشاہت حاصل ہوئی تھی اور "بادشاہت" وہ چیز تھی جس سے امام حسنؑ کو کوئی دلچسپی نہیں تھی امیر معاویہ کو "بادشاہت" درکار تھی اور "بادشاہت" چونکہ ایک غیر اسلامی شے ہے اس لئے امام حسن علیہ السلام نے ان کو "بادشاہت" لے لینے کی اجازت دے دی۔ ظاہر ہے کہ اس میں امام حسن علیہ السلام کا کوئی نقصان نہیں تھا بلکہ اس کے نتیجہ میں خود امیر معاویہ پر اسلام میں ملوکیت کے قیام اور نسلی بادشاہت کے آغاز کا الزام آیا ایسی حالت میں اگر امیر معاویہ "بادشاہ" بن گئے تو امام حسن علیہ السلام کا کچھ نہیں بگڑا۔ آپ کا جو منصب تھا وہ آپ کو حاصل رہا۔ چنانچہ معاہدہ پر دستخط کرنے کے بعد ہی آپ نے خود امیر معاویہ کے دربار میں ــــ

نحن امرائکم

کہہ کر اس کی وضاحت کر دی تھی کہ جہاں تک خلافت ربانی کا تعلق ہے وہ اس

بے اختیار جھک جاتے ہیں، اسلام کے دشمن بنی امیہ اور شامی عیسائیوں کو اس پر مجبور کر دینا کہ وہ اسلام دشمن مسیحی قوتوں سے ٹکرائیں اور اسلام کے لئے ممالک فتح کرتے پھریں اور اس سب کی قیمت محض وہ چند روزہ بادشاہت جو دائمی بدنامی کا سبب بنے۔ اس الٰہی سیاست اور منصوص من اللہ قیادت ہی سے ممکن ہے جس پر ہمارے ائمہ فائز تھے۔

اس عظیم سیاست کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ شامیوں نے ۴۱ھ میں اپنے چہروں پر اسلام کی جو مصنوعی نقاب ڈالی تھی اسے وہ ۶۰ھ تک ڈالے رہنے پر مجبور ہو گئے۔ اس ۲۵ سال کے عرصہ میں ان کی وہ نسل ختم ہو گئی جس نے تلوار کے خوف سے اسلام قبول کیا تھا اور اپنے دل کے پردوں میں مسیحیت کو چھپائے تھی ـــــ اور وہ نسل وجود میں آگئی جو بنی امیہ کی تعلیم کے نتیجہ میں آل رسولؐ کی دشمن تو ضرور تھی لیکن اسلام سے مانوس تھی، یہ صحیح ہے کہ اس کا "اسلام" عقائد و اعمال کے اعتبار سے حد درجہ پست اور سبک تھا لیکن یہ نئی نسل مسیحی نہیں رہی تھی، غلط عقائد و افکار میں مبتلا ہونے کے باوجود مسلمان تھی اور اس قابل ہو گئی تھی کہ:۔

۱۔ ایک عظیم قربانی پیش کرکے اس کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا جائے اور

۲۔ پھر اس جاگے ہوئے ضمیر پر تبلیغ کا فریضہ انجام دے کر اسے سچا مسلمان بنا دیا جائے۔

اس میں سے اول الذکر فریضہ امام حسین علیہ السلام نے انجام دیا اور دوسرا کام بیمار کربلا نے پورا کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے دشمنوں کا سب سے بڑا مرکز "شام" اسلام کے ایک ایسے مستحکم قلعہ میں تبدیل ہو گیا جسے دنیائے مسیحیت آج تک تسخیر نہیں کر سکی اور وہ شام چودہ سو سال سے آج تک مسلمان

ہے جسے امیر معاویہ اسلام کی بیخ کنی کے مرکز میں تبدیل کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔

امیرالمومنینؑ نے جنگ صفین کو طول دے کر اسلام کے خلاف شامیوں کے غم و غصہ کو بڑی حد تک فرو کر دیا تھا لیکن امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کو بادشاہت کا کھلونا دے کے شامیوں کی بباطن مسیحی اور بظاہر مسلمان نسل کو مسلمانوں کے مقابلہ میں مفلوج بنا دیا۔ اس عمل میں ۳۶ھ سے ۴۰ھ آ گیا۔ پچیس سال تک آل رسولؐ کو صبر اور استقلال سے کام لینا پڑا لیکن آج اسی پچیس سال کی صبر آزما محنت اور ۶۱ھ کی قربانی کا یہ نتیجہ ہے کہ شام مسلمان ہے اور وہاں آل رسولؐ کے مزارات اسلام کی عظیم الشان کامیابی کا اعلان کر رہے ہیں۔

امام حسن علیہ السلام کی شامیوں سے جنگ بادشاہت کے لئے نہیں تھی، اسلام کے لئے تھی اور اس سے بھلا کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ حسنؑ نے اپنے حسن تدبر سے اسلام کی یہ جنگ اس شان سے جیتی کہ آج تک شام پر پرچم اسلام نہایت شان سے لہراتا نظر آ رہا ہے۔

امام حسن علیہ السلام نے اس معاہدہ کے ذریعہ صرف یہی نہیں کہ امیر معاویہ کو اسلام اور کفر کے اس معرکہ میں پسپائی پر مجبور کر دیا جو چار سال سے صفین کی سرزمین پر جاری تھا بلکہ عقائد کی جنگ بھی بڑی خوبصورتی سے جیت لی جس پر بہت کم مورخین کی نظر جاتی ہے۔

آپ نے معاہدہ کی سب سے پہلی شرط یہ رکھی کہ

"معاویہ کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کے مطابق حکومت کرے گا"۔

اور معاویہ نے اس شرط کو قبول کر لیا جس کے معنی یہ ہوئے کہ امیر معاویہ اور ان کے ساتھیوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ کتاب اللہ اور سیرت الرسولؐ

کے ساتھ سیرت شیخین کی وہ شرط جو عبدالرحمن بن عوف نے ایجاد کی تھی اور جس کی اساس پر حضرت عثمان کو خلافت عطا کی گئی تھی قطعاً" غلط تھی اور یہ ایک ایسی بدعت تھی جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

تاریخ میں امیر معاویہ کو شیعیان عثمان کا سرگروہ قرار دیا جاتا ہے اور آپ نے امیرالمومنینؑ کے خلاف بغاوت کا پرچم بھی قصاص خون عثمان کے نام پر بلند فرمایا تھا لیکن سیرت شیخین کی شرط اڑا دیئے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیر معاویہ نے خود عملاً" حضرت عثمان کی تکذیب کی اور حضرت علیؑ کے موقف کی تائید کر دی۔ گویا حصول حکومت کے لئے امیر معاویہ نے اپنا مذہب بدل دیا۔ عثمانی نظریہ کی جگہ علوی نظریہ قبول کر لیا اور اس طرح دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ بنی امیہ کا "ایمان" صرف اقتدار، حکومت اور خزانوں پر تھا کسی اصول پر نہیں۔

دنیائے اسلام نے امیر معاویہ کی بیعت کر کے گویا یہ اصول مان لیا کہ حکومت کی بنیاد کتاب اللہ اور سیرت رسولؐ ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے اور سیرت شیخین کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ دنیائے اسلام کے اس عملی اعتراف کے منطقی طور پر یہ نتائج مرتب ہوتے ہیں :-

۱۔ حضرت عثمان کی خلافت باطل ہو جاتی ہے اس لئے کہ آپ کو ایک غلط اصول گھڑ کے اس کی بنیاد پر حکومت دے دی گئی تھی۔

۲۔ جن صحابہ نے یہ اصول وضع کیا تھا یا اسے تسلیم کیا تھا وہ ایک بدعت کے مرتکب ہوئے اس لئے ان کی عدالت کا نظریہ باطل ٹھہرتا ہے۔

۳۔ ملت اسلامیہ نے ۲۵ھ میں سیرت شیخین کے سوال پر "اجماع" کر لیا تھا اور ۴۰ھ میں اسے ختم کر دینے پر "اجماع" کر لیا۔ (جس کا ثبوت حضرت عثمان اور امیر معاویہ کی بیعت سے مل جاتا ہے جو سب مسلمانوں نے کی

تھی) اس سے ظاہر ہوا کہ "اجماع" کی کوئی حقیقت نہیں ہے اس لئے کہ جس اجماع امت کا فیصلہ پندرہ برس میں بدل جائے اسے غلطی سے ماوراء قرار دینا قطعاً منافی عقل و بصیرت ہے۔

۲۔ جب اجماع کے صحیح ہونے کا اصول باطل ٹھہرا تو حضرت ابوبکر کی خلافت بھی ختم ہو گئی جسے اجماع کے سہارے جائز قرار دیا گیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ حضرت عمر کی خلافت بھی تشریف لے گئی۔ اس لئے کہ وہ ایک غلط اصول کے ماتحت منتخب کئے ہوئے خلیفہ کے نامزد کردہ جانشین تھے' جب نامزد کرنے والے کی حقیقت ہی ختم ہو گئی تو نامزد ہونے والے کی حقیقت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

بہرحال امام حسن علیہ السلام نے محض اس ایک شرط سے حضرت ابوبکر' حضرت عمر اور حضرت عثمان تینوں کی خلافت کو باطل ٹھہرایا اور اس طرح مذہب حقہ کی وضاحت کا اہم دینی فرض جو آپ کے فرائض امامت میں شامل تھا اس خوبی سے ادا فرما گئے کہ منافقین اور دشمنان آل رسولؐ چاہے وہ شامی ہوں اور چاہے مکی یا مدنی اندھیرے میں رہے اور صاحبان بصیرت پر پوری حقیقت آشکار ہو گئی۔ معاویہ اور ان کے ساتھی خوش تھے کہ چلو حکومت مل گئی لیکن حسنؑ مسرور تھے کہ معاہدہ کی پہلی ہی شرط ایسی منوا لی گئی کہ خود دشمنوں کے دستخط سے حق واضح ہو گیا اور مذہب کے باب میں اجماع اور سیرت شیخین وغیرہ نے جو پردے ڈال دیئے تھے وہ بیک گردش قلم اٹھ گئے۔

مذہب کے باب میں امام حسنؑ کی یہ فتح مبین ناقابل انکار ہے۔

امام حسن علیہ السلام نے اس تاریخی معاہدہ میں یہ شرط رکھ کر دنیائے اسلام پر ایک اور احسان عظیم فرمایا ہے اور وہ یہ کہ آپ نے ایک مختصر سے جملہ

میں یہ بتلا دیا کہ "مسلمانوں کی حکومت" کا دستور اساسی کیا ہوتا ہے اور وہ کونسی حکومت ہوتی ہے جسے "مسلمانوں کی حکومت" قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ سوال مستقبل کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا اس لئے کہ آنے والے زمانہ میں "اسلام کی حکومت" یا "خلافت الہیہ" باقی رہنے والی نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ "مسلمانوں کی حکومتیں" وجود میں آنے والی تھیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے دنیا کے سامنے "اسلام کی حکومت" کا نقشہ پیش فرمایا تھا اور امیرالمومنین علیہ السلام عہد ختمی مرتبت کے بعد اسی "اسلامی حکومت" کو وجود میں لانے کی سعی و جہد میں مصروف رہے۔ پھر جب آپ کو حکومت حاصل ہوئی تو آپ نے "اسلام کی حکومت" قائم فرمائی لیکن امام حسن علیہ السلام کے عہد تک دنیا بالکل بدل چکی تھی۔ مسلمانوں کے نقوش بگڑ چکے تھے۔ دلوں کا عالم تہ و بالا ہو چکا تھا۔ اخلاق و دیانت کے چراغ گل ہو چکے تھے اور روحانیت کے پھول مرجھا چکے تھے۔ ان حالات میں "اسلام کی حکومت" قائم ہونے کا موقع باقی نہیں رہا تھا۔ اب صرف "مسلمانوں کی حکومت" قائم ہو سکتی تھی اس لئے یہ ضروری تھا کہ دنیا پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ "مسلمانوں کی حکومت" کسے کہا جائے گا؟ آیا ہر وہ حکومت جس کا سربراہ مسلمان ہو "مسلم حکومت" کے نام سے موسوم کی جا سکے گی یا اس حکومت کے لئے بھی کچھ قیود و شرائط ہوں گے؟ یہ تھا وہ سوال جسے امام حسن علیہ السلام نے معاہدہ کی اس شرط سے پورے طور پر واضح فرما دیا اور دنیا کو بتلا دیا کہ محض مسلمان حکمران ہونا کسی حکومت کو "مسلمانوں کی حکومت" نہیں قرار دلا سکتا۔ "مسلمانوں کی حکومت" صرف وہی ہو گی جو کتاب اللہ اور سیرت رسولؐ کی اساس پر قائم ہو۔

مسلمانوں نے اس اہم نکتہ کا خیال نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے

ہزاروں بے جا الزامات اپنے سر اوڑھ لیے۔ اپنی بدنامی اور بے عزتی قبول کر لی اور مسلمان بادشاہوں کی بداعمالیوں' عیاشیوں اور مظالم کے نتیجہ میں غیر اقوام کے سامنے ذلیل ہوئے۔ وجہ صاف ظاہر ہے' مسلمانوں نے ہر ظالم' عیاش' بدکار' نالائق' شرابی' زانی اور نااہل حکمران کی حکومت کو "مسلمانوں کی حکومت" قرار دے لیا' جس کے نتیجے میں بادشاہوں کی بداعمالیوں کی ساری ذمہ داری ملت اسلامیہ کے سر آگئی اور غیر قوموں کو مسلمانوں کو بدنام کرنے کا موقع مل گیا۔ اس کے برعکس اگر پوری صفائی سے یہ کہہ دیا جاتا کہ مسلمانوں کی حکومت صرف وہ ہے یا صرف اس حکومت کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہو گی جس کا عمل کتاب اللہ اور سیرت رسولؐ پر ہو تو مسلمانوں پر ہرگز وہ الزامات عائد نہ ہوتے جو آج عائد کئے جاتے ہیں اور ملت اسلامیہ اغیار کی نگاہوں میں اس ذلت و خواری کا نشانہ نہ بنتی جس کا نشانہ وہ آج بن رہی ہے۔

خود ہمارے برصغیر میں ہندو مسلم آویزش اور مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں میں نفرت کا جذبہ پیدا ہو جانے میں بڑا ہاتھ ان حرکتوں کا ہے جو مسلمان بادشاہوں سے صادر ہوئیں اور ہم نے بلا سوچے سمجھے ان بادشاہوں کی حکومت کو مسلمانوں کی حکومت تسلیم کر کے ان تمام حرکتوں کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اگر ہم ایک ذرا عقل سے کام لیتے اور پوری جرات سے یہ کہہ دیتے کہ یہ حکومتیں "مسلمانوں کی حکومتیں" نہیں تھیں بلکہ چند افراد یا چند خاندانوں کی حکومتیں تھیں جن کی حرکتوں کی ذمہ داری مسلمانوں پر نہیں ہے تو آج ان دونوں قوموں میں جو کشیدگی نظر آتی ہے وہ ہرگز وجود میں نہ آتی۔ اسی طرح عرب اور ترک سلاطین کی عیش پرستیوں اور ظلم کوشیوں کے افسانوں نے یورپ کی نظر میں مسلمانوں کا وقار جس طرح برباد کیا ہے وہ نہ ہونے پاتا۔ امام حسن علیہ السلام نے معاہدہ میں

کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کی شرط اسی لئے عائد کی تھی اور اس طرح ملت اسلامیہ کو ایک بڑی بدنامی سے بچنے کا راستہ دکھایا تھا لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں نے اس پر اعتناء نہیں کی اور اسی کا وہ نتیجہ ہے جو آج وہ ساری دنیا میں بھگت رہے ہیں۔

مسلمانوں نے بڑی غلطی یہ کی کہ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ جو حکومت کتاب اللہ اور سیرت رسولؐ کی پابندی کرتی ہے وہ تو ہے خلافت اور جس حکومت میں ان چیزوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے، وہ مسلمانوں کی حکومت ——— اور یہی غلط تصور ان کی تاریخ کو داغدار بنا دینے کا سبب بنا۔ حقیقت یہ ہے کہ "خلافت" نام ہے اس الٰہی حکومت کا جس میں کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کی پیروی تو ضرور کی جاتی ہے لیکن خلیفہ وہ ماموُر من اللہ بزرگ ہوتا ہے جو حفظ شریعت اور بقائے دین کا ذمہ دار ہوتا ہے، وہ مسلمانوں کا حکمران ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کل کائنات کا امام اور ہادی ہوتا ہے۔ وہ بادشاہ نہیں ہوتا تحریک اسلامی کا قائد ہوتا ہے اور اس کے دوش پر اس عالمگیر اصلاحی انقلاب کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں جسے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے ایک گوشہ سے شروع کیا تھا۔ وہ صرف حکمران نہیں ہوتا بلکہ دین کا داعی، اسلام کا مبلغ، وحدانیت کا ناشر، حکومت الٰہیہ کا پاسبان، شریعت کا امین، اسرار قرآنی کا حافظ، انسانیت کا رہبر، عوام کا ہادی اور اللہ کی زمین پر اللہ کی حجت کاملہ بھی ہوا کرتا ہے اور جب تک ایسا حکمران برسر اقتدار نہ ہو تب تک کسی حکومت کو "خلافت" نہیں کہا جا سکتا۔ اسے اسلامی حکومت کے لقب سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ رہی مسلمانوں کی حکومت، تو ایسا نہیں ہے کہ جس حکومت میں مسلمان حکمران ہوں، اسے مسلمانوں کی حکومت کہہ دیا جائے، مسلمانوں کی حکومت وہ کہلائے گی جس میں

کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کی پابندی کی جائے۔ شریعت اسلام کا پاس و لحاظ رکھا جائے اور تمام احکام و قضا یا فقہ اسلامی کے مطابق جاری اور نافذ ہوں۔ جس حکومت میں یہ ہو گا اسے مسلمانوں کی حکومت قرار دیا جائے گا اور جس مملکت میں ان امور کا لحاظ نہیں ہو گا وہاں چاہے حکمران مسلمان ہی کیوں نہ ہوں اسے ایک غیر مذہبی مملکت قرار دیا جائے گا۔ جس کے افعال کی ذمہ داری مسلمانوں پر نہیں ہو گی۔

مثال کے طور پر آج ہی کے دور میں دیکھ لیجئے کہ ترکی، مصر، انڈونیشیا، شام اور دوسرے ممالک میں حکمران مسلمان ہیں لیکن ان کے انداز حکومت اور یورپی حکومتوں کے انداز حکومت میں کوئی فرق نہیں ہے، ایسی حالت میں ان کو غیر مذہبی حکومتیں کہا جائے گا اور ان کے کسی فعل کی ذمہ داری مسلمانوں پر نہیں ہو گی البتہ اگر کوئی ایسی حکومت وجود میں آ جائے جہاں شرعی قوانین کا نفاذ ہو تو اسے مسلمانوں کی حکومت مان لیا جائے گا لیکن اسے خلافت سے تعبیر نہیں کیا جائے گا اس لیے کہ مسلمانوں کی حکومت اور چیز ہے اور خلافت بالکل دوسری چیز!

امام حسن علیہ السلام نے ہمیں مسلمانوں کی حکومت کی تعریف بتلائی ہے اور یہ تعریف اتنی جامع ہے کہ آج جن مسلمان ممالک میں بھی شرعی حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا جا رہا ہے وہاں اسی کتاب اللہ اور اسوہ رسولؐ کو اساس حکومت بیان کیا جا رہا ہے اور مسلمان تیرہ سو سال کے تجربات کے بعد اسی نقطہ پر پہنچ گئے ہیں جو امام حسنؑ نے اپنے تاریخی معاہدہ کی پہلی دفعہ میں بیان فرمایا تھا۔

معاہدہ کی دوسری شرط یہ تھی کہ معاویہ اپنے بعد کسی کو حاکم مقرر نہیں کرے گا۔ تاریخی، مذہبی اور سیاسی اعتبار سے یہ شرط بھی انتہائی اہم تھی۔ اس لیے کہ:

جسے امامؑ نے انجام دیا تھا۔

امیر معاویہ نے اس شرط کو مان کر بنی امیہ کے تمام حکمرانوں کی حکومت کو ناجائز اور غیر قانونی بنا دیا اور یہ سیاسی اعتبار سے ان کی ایک بہت بڑی شکست تھی۔

معاہدہ کی تیسری شرط یہ تھی کہ کوفہ کے بیت المال کی ساری رقم امام حسن علیہ السلام کو ملے گی۔ یہ شرط خود امیر معاویہ کی نام نہاد خلافت پر ایک ضرب تھی اس لیے کہ کوفہ کا "بیت المال" خلافت اسلامی کا خزانہ تھا جو مسلمانوں کا حق تھا اور اسے ایک "بادشاہ" کے حوالے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر امام حسن علیہ السلام امیر معاویہ کو "خلیفہ" مانتے تو بیت المال ان کے حوالہ کر دیتے لیکن چونکہ آپ نے امیر معاویہ کو محض "بادشاہ" تسلیم کیا تھا اس لیے آپ نے مسلمانوں کی دولت ان کے حوالہ نہیں کی بلکہ اسے خود اپنی نگرانی میں مسلمانوں غریبوں کو تقسیم کر دیا جو بہ حیثیت خلیفہ برحق ان کا حق بھی تھا اور ان کا فرض بھی!

امام حسن علیہ السلام نے اس طرح بیت المال اور شاہی خزانہ کا فرق بھی دنیا پر واضح کر دیا اور مسلمانوں کو بتلا دیا کہ بیت المال ایک قومی امانت کا نام ہے۔ جسے اس خزانہ شاہی سے دور کی بھی نسبت نہیں ہے جو شاہوں کی عیش پرستیوں' ہوس کاریوں اور جنگ آزمائیوں کی نذر ہوا کرتا ہے۔ اس طرح آپ نے ملت اسلامیہ کے معاشی نظام پر ایک دور رس عملی روشنی ڈالی اور مسلمانوں کو اس آنے والے فتنہ سے باخبر کر دیا جو شاہ پرستی کے اقتصادی نظام کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا تھا۔ آج مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ مسلمانوں کے افلاس اور سلطنت اسلامیہ کے زوال کا بڑا سبب یہ ہوا کہ ملت کی دولت

بادشاہوں اور ارکان دولت کی ذاتی ملکیت بن گئی اور ان لوگوں نے عوام کو افلاس، بھوک، جہالت اور پریشانیوں میں مبتلا کر کے اس دولت کو اپنی عیش کوشیوں پر ضائع کر دیا۔ نظام ملوکیت کا یہی نتیجہ ہونا بھی چاہیے تھا اور امام حسن علیہ السلام مسلمانوں کو اسی آنے والی تباہی سے باخبر کر دینا چاہتے تھے۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ کوفہ کے بیت المال کی مثال مسلمان اپنے سامنے رکھیں اور یہ سمجھتے رہیں کہ سلطنت اسلامی کا خزانہ چند افراد کی ذاتی ملکیت نہیں بننا چاہیے بلکہ مسلمانوں کا ایسا مشترکہ سرمایہ قرار دیا جانا چاہیے جس میں ہر مسلمان برابر کا حقدار تسلیم کیا جائے، مسلمانوں نے اس اہم سیاسی نکتہ کو نظرانداز کر دیا اور نظام ملوکیت پر لیسے ریجھے کہ انہوں نے بیت المال کی اس اساسی اور اصولی شکل کو اپنے ذہنوں سے "قطعاً" محو کر دیا۔ اس کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا وہی ہوا اور ملت اسلامیہ افلاس، تباہی اور پریشان حالی کا شکار ہو کر نہ صرف یہ کہ سیاسی اور عسکری حیثیت سے ختم ہو گئی بلکہ علمی، ادبی، ذہنی اور فکری میدانوں میں بھی پس ماندہ اور حقیر بن گئی۔ آل رسولؐ نے مسلمانوں کو مستقبل کی اس تباہی سے باخبر کرنے کی ہر امکانی سعی کی چنانچہ امام حسن علیہ السلام نے معاہدہ میں یہ شرط رکھی اور امام حسین علیہ السلام نے میدان کربلا کے خطبات میں بار بار یہ حقیقت واضح فرمائی کہ:۔

"بیت المال کو ذاتی املاک بنا لیا گیا ہے"

لیکن مسلمانوں نے نہ تو معاہدہ کے مصلحت آفرین اشارہ کو سمجھا اور نہ مظلوم کربلا کی تقریروں سے متاثر ہوئے اور اس کا جو نتیجہ نکلا ملوکیت کے اقتصادی نظام نے مسلمانوں کو افلاس اور تباہی کا جو روز بد دکھایا اور قومی دولت کے اتلاف کا جو نتیجہ مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کو بھگتنا پڑا وہ کسی سے پوشیدہ

نہیں ہے۔

معاہدہ کے مالی شرائط میں ایک شرط یہ بھی رکھی گئی کہ ایران کے ایک صوبہ کا خراج امام حسنؑ کو ملتا رہے اس شرط کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں کی توجہ آل رسولؐ پر مرکوز ہو گئی ور آج اسی کا یہ ثمرہ ہے کہ ایران آل رسولؐ کے شیدائیوں سے چھلکتا نظر آ رہا ہے۔

امام حسن علیہ السلام کو اس رقم کی شدید ضرورت تھی اس لیے کہ اول تو آپ کو اپنی تبلیغی مہم کے لیے روپیہ درکار تھا' دوسرے مدینہ سے مرکز حکومت منتقل ہونے کے نتیجہ میں یہ اندیشہ تھا کہ غریب اصحاب رسولؐ مدینہ سے دوسرے شہروں کی جانب ہجرت کرنے لگیں گے اور اسطرح وہ جماعت منتشر ہو جائے گی جس نے زبان فیض ترجمان رسالت سے دین کی تعلیم حاصل کی تھی جہاں تک امرائے مدینہ کا تعلق تھا وہ زراندوزی اور حرص کی بیماریوں میں مبتلا ہو کر اپنا دینی جذبہ کھو چکے تھے اور اموی خزانہ انکو آسانی سے خرید سکتا تھا لیکن غریب اور پسماندہ طبقہ کے دل میں اب بھی دین کی سچی محبت موجود تھی اور اسی کے سہارے رسول اللہؐ کی تعلیم کی اشاعت ہو سکتی تھی۔ امام حسن علیہ اسلام یہ جانتے تھے کہ اگر یہ طبقہ افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر منتشر ہو گیا تو تفسیر' حدیث اور فقہ کا نام و نشان مٹ جائے گا اور بنی امیہ دین کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اس لیے یہ ضروری تھا کہ آپ اہل مدینہ کے اس طبقہ کے آذوقہ کا بندوبست کر دیں تاکہ وہ غریب اصحاب پیغمبرؐ جو اموی دولت پر اپنے دین کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں تھے مدینہ میں موجود رہیں اور ان کی مدد سے دین حق کی تبلیغ و اشاعت کا کام پورا ہوتا رہے امام یہ جانتے تھے کہ بنی امیہ کی تلواریں اور ان کا جابرانہ انداز لوگوں کو آل رسول سے دین حاصل کرنے سے روک دے گا اور

حکومت وقت یہ چاہے گی کہ عوام یا تو جاہل رہیں ورنہ آل رسولؐ کے علاوہ دوسرے لوگوں سے علم حاصل کریں۔ یہ لوگ دو حصوں میں منقسم تھے ایک تو وہ طبقہ تھا جسے بنی امیہ نے خرید لیا تھا یہ جھوٹی حدیثیں گھڑ کر دین کو برباد کرنے والا تھا اور دوسرا طبقہ وہ تھا جو اپنے دین کو دنیا کے ہاتھوں فروخت کرنے پر تیار نہیں تھا اس لیے اس طبقہ کے ذریعہ تفسیر، حدیث اور فقہ کے علوم کی اشاعت ہو سکتی تھی۔ امام نے اس موخر الذکر طبقہ کو مضبوط بنا دینے پر پوری توجہ کی اور اس کو منتشر ہونے سے بچا لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی علوم کی بربادی کا جو خدشہ پیدا ہو گیا تھا وہ دور ہو گیا۔

امام حسن علیہ السلام کے دستر خوان کی وسعت بہت مشہور ہے لیکن بہت کم آدمیوں نے اس پر غور کیا ہے کہ امام حسنؑ کے سے زہد پرور امام کو اس وسیع دستر خوان کی کیا ضرورت تھی؟ اگر اسے محض فیاضی قرار دیا جائے تو دوسرے ائمہ نے اس قسم کی فیاضی کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا؟ امیر المومنینؑ نے اپنا دستر خوان کیوں وسیع نہ رکھا؟ اور آل رسولؐ میں صرف امام حسن علیہ اسلام نے اس قسم کی فیاضی کا کیوں مظاہرہ فرمایا؟

بات دراصل یہ ہے کہ امامؑ کو غریب مگر ایماندار صحابہ رسولؐ کی پرورش مقصود تھی تاکہ یہ لوگ مدینہ چھوڑنے پر مجبور نہ ہو جائیں اور ان کی مدد سے رسول اللہؐ کے پیغام کی اشاعت ہوتی رہے۔ امام حسن علیہ السلام اپنی اس تدبیر میں کامیاب رہے اور آپ نے مرکز حکومت و دولت دمشق منتقل ہو جانے کے باوجود مدینہ کو اجڑنے نہیں دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علوم اسلامی کا ذخیرہ بڑی حد تک محفوظ رہا اور دستر خوان کی وسعت نے ان غریب صحابہ کے قدم مدینہ میں جمائے رکھے جنہوں نے دین کی تعلیم لسان فیض ترجمان رسالت سے حاصل کی تھی۔

دنیا مانے یا نہ مانے' لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں دمشق سے بدعتوں کے سوتے پھوٹ رہے تھے اور بنی امیہ کے زر خرید بندگان دنیا جھوٹی حدیثوں اور جھوٹے فتاوے کے انبار لگا رہے تھے وہیں حسنؑ کی صلح کے نتیجہ میں اسلامی دنیا میں ایک طبقہ ایسا بھی موجود تھا جو رسول اللہؐ کی سچی تعلیمات کو اپنے کلیجہ سے لگائے اسلام کو بنی امیہ کی تاخت سے محفوظ رکھنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف تھا۔ اور آج یہ اسی طبقہ کا جسے امام حسنؑ نے روزی کی جانب سے مطمئن کر رکھا تھا' طفیل ہے کہ ہمارے پاس احادیث صحیح کا وہ گنج گراں مایہ موجود ہے جسے بنی امیہ تباہ کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔

ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ یہ زمانہ وہ تھا جب آل رسولؐ سے براہ راست حدیث حاصل کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس لیے آل رسولؐ کو "قدرتا" اس کی ضرورت تھی کہ ایسے ایماندار لوگوں کی ایک جماعت مدینہ میں باقی رکھی جائے جو پیغام رسالت کی تبلیغ کرتے رہیں ان میں وہ صحابہ بھی تھے جو پوری دیانتداری سے لوگوں کو وہ چیزیں سنا دیا کرتے تھے جو انہوں نے خود رسول اللہ سے سنی تھیں اور وہ تابعین بھی تھے جو حدیث لیتے تو آل رسولؐ سے تھے لیکن مصلحت وقت کے پیش نظر اسے کسی دوسرے شخص سے منسوب کر کے امت تک پہنچا دیتے تھے اور اس طرح حق دنیا پر آشکار ہوتا رہتا تھا حسن بصری نے اس راز کو یہ کہہ کر ہم پر آشکار کیا ہے کہ "میں نے جو احادیث حضرت علیؑ سے سنی ہیں ان کو میں براہ راست رسول اللہؐ سے نقل کر دیتا ہوں" حسن بصری کا یہ انکشاف ہمیں نہ صرف یہ کہ اس زمانہ کی اصل حالت سے باخبر کرتا ہے بلکہ امام حسن علیہ السلام کے دستر خوان کی وسعت کا راز بھی ہم پر ظاہر کر دیتا ہے اور ہمیں بتلاتا ہے کہ کس طرح اس پر آشوب دور میں آل رسولؐ صحابہ و تابعین کے

غریب مگر ایماندار افراد کے ذریعے دنیا تک پیغام حق پہنچاتی رہی ہے۔ کون جانے کہ حسن بصری کی طرح کتنوں نے آل رسولؐ سے احادیث اور احکام فقہ حاصل کیے ہوں گے اور اپنے نام سے دنیا تک پہنچائے ہوں گے۔

امام حسن علیہ السلام کو اپنے نام کی ضرورت نہیں تھی، حق کی اشاعت کی ضرورت تھی اور اگر یہ مقصد اس طرح پورا ہوتا تھا کہ حسنؑ کا نام آئے بغیر رسول اللہؐ کی احادیث اور آپ کے احکام امت تک پہنچ جائیں تو اس سے زیادہ بے لوث تبلیغ اور کیا ہو سکتی تھی۔

دسترخوان کی وسعت سے ایک دوسرا فائدہ یہ تھا کہ ممالک اسلامیہ سے جو زائرین مدینہ آتے تھے وہ امامؑ کے مہمان ہوتے تھے اور ان پر دین کے حقائق پیش کیے جاتے تھے اور پھر ان کے ذریعے سے دور دراز علاقوں تک حق کی آواز پہنچائی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس تبلیغی مہم کو منظم کرنے کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی اور یہ سرمایہ فراہم کرنے کی اس سے بہتر صورت اور کیا ہو سکتی تھی کہ معاویہ سے روپیہ لے کر اسی روپے سے اموی نفاق کی بنیادیں کھوکھلی اور اسلام کی دیواریں مضبوط کر دی جائیں۔

معاہدہ کی ایک شرط یہ تھی کہ امیر المومنینؑ پر سب و شتم نہیں کیا جائے گا۔ اس شرط کے دو پہلو تھے۔ ایک سلبی اور دوسرا ایجابی اور دونوں پہلو امام حسن علیہ السلام کے لیے مفید تھے اور بنی امیہ کے لیے تباہ کن۔

اگر امیر معاویہ اور بنی امیہ کے دوسرے سلاطین معاہدہ کی اس شرط کی پابندی کرتے تو وہ قرآن اور حدیث کے فرمان سے مجبور ہو کر نہ سہی ایک سیاسی معاہدہ سے ہی مجبور ہو کر آل رسولؐ کا احترام کرتے اور اس طرح دین کے ایک اہم رکن کو مان لیتے۔ یہ آل رسولؐ اور اسلام کی ایک اہم اصولی فتح ہوتی اور بنی

امیہ اس دین کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہوتے جسے وہ مٹا دینا چاہتے تھے۔ آل رسولؐ کے خلاف انکا معاندانہ پروپیگنڈا بند ہو جاتا اور آل رسولؐ کو اس کا موقع مل جاتا کہ وہ فراغت اور اطمینان کے ساتھ دین مبین کی اشاعت کر سکیں۔ یہ معاملہ کا ایجابی رخ تھا کیونکہ دراصل معاہدہ کے روپ میں معاویہ کے سامنے دین پیش کیا جا رہا تھا جو آل رسولؐ کی حکمت آفرین تبلیغ کا ایک شاہکار تھا لیکن اس ایجابی رخ کے ساتھ معاملہ کا ایک سلبی پہلو بھی تھا اور وہ یہ کہ اگر معاویہ نے اس شرط پر عمل نہ کیا تو:۔

۱۔ آل رسولؐ پر سب و شتم کرنے کے نتیجے میں جہاں ان پر دین سے خارج ہو جانے کا الزام عائد ہو گا وہیں معاہدہ کی خلاف ورزی ان کی اخلاقی پستی اور ان کے کردار کی دیانت کو عالم آشکار کر دے گی۔

۲۔ مسلمانوں کے چوتھے مسلم الثبوت خلیفہ پر سب و شتم کرنے والے بنی امیہ اور ان کے حامی مسلمانوں کے اس زمرہ میں بھی شامل نہیں کیے جا سکیں گے جو حضرت علیؑ کو چوتھا خلیفہ تسلیم کرتا ہے۔

۳۔ حضرت علیؑ کو چوتھا خلیفہ ماننے والے مسلمانوں کے لیے اصولاً یہ جائز یا ممکن نہیں رہے گا کہ وہ معاویہ اور بنی امیہ کے دوسرے سلاطین کو خلیفہ مفترض الطاعة مانیں اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو یہ ایک ایسی بے اصولی ہو گی جسے وہ عقل و منطق کے کسی اصول سے جائز قرار نہیں دے سکیں گے۔

۴۔ جو صحابہ ' تابعین اور تبع تابعین اس فعل قبیح میں شریک ہوں گے یا اس پر خاموش رہیں گے ان کی "عدالت" کا پول دنیا پر کھل جائے گا اور ارباب بصیرت پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ یہ لوگ یا تو حرص دنیا میں اتنے اندھے ہو چکے تھے کہ محض بنی امیہ کی خوشنودی خاطر کے لیے

رسول اسلامؐ کے گھرانے کی توہین و تذلیل کرنے پر تیار تھے یا پھر اتنے بزدل تھے کہ امویوں کے خوف سے اس گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے تھے اور یا پھر خود ان کے دلوں میں خانوادہ رسولؐ کے خلاف اتنا زہر بھرا ہوا تھا کہ جیسے ہی ان کو موقع ملا وہ آل رسولؐ پر سب و شتم کے لیے تیار ہو گئے۔ ان تینوں صورتوں میں نہ صرف یہ کہ ان کی عدالت تشریف لے جاتی ہے بلکہ صحابہ پر بلا تمیز نیک و بد ایمان رکھنے کا اصول بھی ختم ہو جاتا ہے۔

۵۔ امام حسن علیہ السلام یہ جانتے تھے کہ مستقبل میں امیر معاویہ کو خلیفہ برحق سے جنگ کے جرم سے بچانے کے لیے ان کے چہرہ پر "خطائے اجتہادی" کی نقاب ڈال دی جائے گی اور اس طرح ان کو بے خطا ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی' لیکن معاہدہ کی اس شرط نے اس نقاب کو تار تار کر ڈالا اس لیے کہ اگر امیر المومنینؑ پر معاویہ کا خروج خطائے اجتہادی مان بھی لیا جائے تب بھی معاہدہ کے بعد امیر المومنینؑ پر سب و شتم کیا جانا خطائے اجتہادی یا نادانی کی غلطی نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس عظیم عہد شکنی کے بعد معاویہ کو "مجتہد" قرار دینا ہی ناممکن ہو جاتا ہے کیونکہ عہد شکنی کا گناہ کبیرہ ان کی "عدالت" کا خاتمہ کر دیتا ہے اور جو شخص "عادل" نہ ہو اسے کسی حالت میں مجتہد نہیں کہا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ جب معاویہ مجتہد ہی نہیں تھے تو ان کو "خطائے اجتہادی" کے دامن میں پناہ نہیں دی جا سکتی اور امام حسن علیہ اسلام نے معاہدہ میں یہ شرط داخل کر کے حامیان بنی امیہ سے ان کی آخری آڑ یا سپر بھی چھین لی اور معاویہ کے گناہوں پر اجتہاد کا جو پردہ ڈالا جانے والا تھا اسے تار تار کر کے پھینک دیا۔

۶۔ بنی امیہ کو چونکہ اس معاہدہ کی بنیاد پر حکومت حاصل ہوئی تھی اس لیے معاہدہ کی پابندی نہ کرنے کی حالت میں اصولاً" اور قانوناً" ان کو حکومت کرنے کا حق باقی نہیں رہا۔ ان کی حکومت غیر قانونی ہو گئی۔ اس لیے اس حکومت سے عدم تعاون یا اسے ختم کر دینے کی ہر کوشش جائز ہو گئی اور اس حکومت سے تعاون یا اس کی بیعت حرام ہو گئی۔

معاہدہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ جن لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام کا ساتھ دیا تھا ان سے نہ کوئی مواخذہ کیا جائے گا اور نہ ان کو سزا دی جائے گی امیر معاویہ نے اس شرط کی بھی پابندی نہیں کی اور حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کے قتل سے اپنے ہاتھ رنگین کر لیے۔ ان کے علاوہ دوسرے موالیان امیرالمومنینؑ پر طرح طرح کے مظالم کیے گئے جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ معاویہ پر ظلم و خونریزی کا الزام عائد ہوا بلکہ یہ جرم اس اعتبار سے اور زیادہ گھناؤنا اور قابل مواخذہ ہو گیا کہ یہ سب مظالم ایک اہم دستاویزی معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کیے گئے تھے اور اس اعتبار سے معاویہ کا کردار تاریخ میں اتنا پست ہو گیا کہ آنے والی نسلیں معاویہ اور ان کے بعد والے بنی امیہ کی "تبعیت خلافت" کرنے کے باوجود یہ ہمت نہ کر سکیں کہ ان کو "علیٰ منہاج النبوۃ" والی خلافت میں شامل کر سکیں اور بنی امیہ کی حدیث سازی کے باوجود امت کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ "خلافت راشدہ" حسنؑ پر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد جو "خلافت" وجود میں آئی وہ "ملک عضوض" کی بادشاہت تھی!

امام حسن علیہ السلام اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ معاویہ معاہدہ کی پابندی نہیں کریں گے۔ آپ معاویہ کی سیرت اور ان کے کردار سے بخوبی واقف تھے اور آپ نے کوئی دھوکا نہیں کھایا' آپ نے جو کچھ کیا خوب سوچ سمجھ

کے کیا اور ایک ایسا معاہدہ ترتیب دیا جس کی ہر دفعہ آپ کی سیاسی بصیرت اور کامرانی کا ثبوت تھی اس معاہدہ کی ہر شرط معاویہ اور بنی امیہ کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں ان کے چہروں پر پڑی ہوئی ساری نقابیں الٹ گئیں۔ بنی امیہ امت اور تاریخ کے دربار میں پابہ زنجیر قیدیوں کی حیثیت سے کھڑے ہونے پر مجبور ہو گئے ان کے عقائد و افکار سے دنیا روشناس ہو گئی۔ ان کی سیرت کے جو نقوش اب تک دھندلے تھے وہ روشن ہو کر امت کے سامنے آ گئے' اور آل رسولؐ نے محض ایک ایسی تحریر سے' ایک ایسی دستاویز سے جس پر کوئی عمل نہیں کیا گیا۔ اپنی حقانیت اور اپنے مخالفین کی باطل نوازی کے ایسے انمٹ نقوش دنیا کے سامنے پیش کر دیے جن سے ارباب بصیرت کو ہمیشہ کے لیے حق کی تلاش آسان ہو گئی اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہمیشہ کے لیے واضح ہو گیا۔

بعض کم فہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امام حسن علیہ السلام نے دھوکا کھایا اور ایک ایسا معاہدہ کی بنیاد پر حکومت چھوڑ دی جس پر عمل نہیں کیا گیا۔ ان کے خیال میں معاویہ نے امامؑ کو سیاسی طور پر زک دے دی اس لیے کہ اس نے حکومت بھی لے لی اور معاہدہ پر عمل بھی نہیں کیا اور اس اعتبار سے معاویہ امامؑ کے مقابلے میں زیادہ صاحب عقل اور زیادہ بڑا سیاست داں ثابت ہوا۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس معاہدہ نے الٹا یہ ثابت کر دیا کہ معاویہ کی عقل و سیاست کے سارے افسانے غلط ہیں۔ اس میں نہ عقل تھی نہ سیاست بلکہ صرف وہ معمولی درجے کا سیاستدان تھا جسے سیاست کے اعلیٰ ایوان میں جگہ دینا خود لفظ سیاست کی توہین کرنا ہے۔

معاویہ کی عقلی اور سیاسی بے بصیرتی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا

ہے کہ:۔

۱۔ جب جنگ میں اس کی فتح یقینی ہو چکی تھی تو اس نے صلح کر لی۔

۲۔ جنگ جاری رکھ کے وہ خانوادہ نبوت کا خاتمہ کر سکتا تھا جو اس کا مقصد اصلی تھا لیکن صلح سے اس کا یہ مقصد فوت ہو گیا۔ آل رسولؐ باقی رہی اور صرف باقی ہی نہیں رہی بلکہ دنیائے اسلام پر اس کا اثر اس حد تک قائم رہا کہ آج بھی دنیا کا ہر مسلمان مودت اہل بیتؑ کو جزو ایمان تسلیم کرتا ہے۔

۳۔ اس نے صلح کے نتیجے میں وہ حکومت حاصل کی جسے خود حامیان بنی امیہ بھی خلافت راشدہ میں شامل نہیں کرتے بلکہ اسے آغاز ملوکیت سے تعبیر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

۴۔ اس پر اسلام میں نسلی بادشاہت قائم کرنے کا الزام عائد ہوا جس کے لیے مسلمان اسے کبھی معاف نہیں کر سکتے۔

۵۔ اس پر عہد شکنی، ظلم اور خونریزی کے وہ الزامات عائد ہوئے جو قیامت تک دور نہیں ہو سکتے اور جن کے نتیجہ میں پوری تاریخ بنی امیہ اتنی داغ دار ہو گئی ہے کہ دنیا کا کوئی سنجیدہ مسلمان اس پر اظہار نفرت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

۶۔ اس نے عملاً" تیسرے خلیفہ کی بیعت کو ناجائز تسلیم کیا اور درپردہ ابتدائی تینوں خلافتوں کا چہرہ داغدار بنا دیا۔

۷۔ اس نے اپنے لیے دائمی بدنامی کا وہ لبادہ خرید لیا جس پر جھوٹی حدیثوں کا انبار بھی پردہ نہیں ڈال سکا۔

۸۔ اس نے ہر مسلمان کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ اس سے اظہار برات کرے کیونکہ جو مسلمان ایسا نہیں کرتا وہ اسلام کے چوتھے خلیفہ پر سب و

شتم جائز قرار دے کر خود دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

۹۔ معاہدہ کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں خود اس کی اور تمام بنی امیہ کی حکومت غیر قانونی اور غیر اصولی ہو گئی۔ جس کی بیعت کرنا بھی مسلمانوں کے لیے غلط ہو گیا۔"

۱۰۔ ایک غیر قانونی، غیر اسلامی اور ناجائز حکومت کے مقابلہ میں امام حسین علیہ السلام کا جہاد قطعاً" جائز ہو گیا اور بنی امیہ اپنے پروپیگنڈہ کی ساری قوتوں کے باوجود اسے "خلیفہ پر خروج" قرار دینے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

۱۱۔ مسئلہ خلافت کے باب میں امیر المومنین علیہ اسلام کا موقف بالکل صحیح ثابت ہو گیا۔

۱۲۔ آل رسولؐ کو تبلیغ اسلام کا پورا موقع ہاتھ آگیا اور اسلام کو مٹا دینے کی تمنائیں دل کی دل ہی میں رہ گئیں۔

۱۳۔ عام مسلمانوں کو بنی امیہ کی حکومت سے یہ احساس پیدا ہو گیا کہ خلافت کے باب میں ان کے وضع کردہ سارے اصول غلط ثابت ہوئے۔

۱۴۔ صحابہ پرستی کا طلسم پاش پاش ہو گیا اس لیے کہ بنی امیہ اور ان کے حامی صحابہ و تابعین کے کردار نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ بلا تمیز نیک و بد ہر صحابی کو حامل عدالت قرار دینا غلط ہے۔

امیر معاویہ اگر واقعی اتنے ہی عقلمند اور سیاستدان ہوتے جتنے کہ مشہور کیے جاتے ہیں تو وہ ہرگز یہ معاہدہ کر کے ان نقصانات کا شکار نہ ہوتے۔ ان کا امام حسنؑ سے معاہدہ کر لینا ان کے سیاسی دیوالیہ پن کا ثبوت ہے اور دنیا کا ہر غیر جانبدار شخص جو تعصب اور اسلاف پرستی کا شکار نہ ہو یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ امیر معاویہ صلح سیاست اور دفاع کی جنگ بڑی طرح ہار گئے اس لیے

ان کو اس معاہدہ کے نتیجے میں سوا اس کے اور کچھ حاصل نہیں ہوا کہ چند روزہ حکومت حاصل ہو گئی اور اس حکومت کی قیمت ان کو ایک ایسی دائمی بدنامی کی شکل میں ادا کرنا پڑی جس پر ہر شریف النفس انسان شرم محسوس کرنے پر مجبور ہے۔

امام حسن علیہ السلام نے امیر معاویہ سے جنگ بند کر دینے کے بعد مدینہ کو اپنا مستقر قرار دیا اور تبلیغ و اشاعت دین کی مہم میں مصروف ہو گئے ملت اسلامیہ کی یہ انتہائی بد نصیبی ہے کہ امامؑ کی زندگی کے اس انتہائی اہم دور کے حالات تاریخوں میں بہت کم ملتے ہیں اور شیعہ روایات نے بھی ان حالات کو جمع کرنے پر بہت کم توجہ دی ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ اول تو یہ کہ امام حسن علیہ السلام کی یہ زندگی رسول اللہؐ کی مکی زندگی کے مانند سیاسی اعتبار سے بہت خاموش گزری ہے دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی تاریخیں صرف سلاطین کی داستانیں ہیں جن میں امام حسن علیہ السلام کے خاموش تبلیغی مجاہدات کی کوئی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی۔ تیسرے یہ کہ مورخین میں چونکہ خود ہی سیاسی بصیرت بہت کم تھی' اس لیے وہ اس معاہدہ کو امام حسن علیہ السلام کی مکمل شکست کا مظہر سمجھے اور انہوں نے یہ یقین کر لیا کہ معاہدہ کے بعد امامؑ نے باقی زندگی ایک ناکام و نامراد انسان کی حیثیت سے حسرت و اندوہ میں گزار دی ہو گی۔ اس لیے ان کو اس عہد کی تفصیلات معلوم کرنے کی بھی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ رہے شیعہ رواۃ' تو ان کی دلچسپی کا مرکز زیادہ تر وہ روایات رہیں جن سے تفسیر' فقہ یا مناظرہ میں مدد ملتی تھی اور امام حسن علیہ السلام کی زندگی میں چونکہ ان کو ایسی چیزیں بہت کم ملتی تھیں اس لیے انہوں نے بھی امام کے حالات جمع کرنے کی پوری کوشش نہیں کی۔ واقعہ یہ ہے کہ امام حسن علیہ السلام' رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی

کی زندگی کے وارث دار تھے اور اس اعتبار سے آپ کی ساری توجہ دین کے ان اہم اصولوں کی تبلیغ و اشاعت پر مرکوز تھی جن کے فنا ہو جانے کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ وقت فقہ کے جزئی مسائل بیان کرنے کا نہیں تھا بلکہ اصول اسلام کو بنی امیہ کی تاخت سے محفوظ رکھنے کا تھا۔ اس عظیم جنگ کی تیاریوں کا تھا جو کربلا کے میدان میں لڑی جانے والی تھی' مسلمانوں کو اس "حق" سے آشنا کرنے کا تھا جس پر باطل نے گہرے غلاف ڈال دیئے تھے اور اس پُر آشوب دور میں اسلام کو محفوظ رکھنے کا تھا۔ جب ایک طرف تو بنی امیہ کے خوف سے مسلمان آل رسولؐ کے قریب آتے گھبراتے تھے اور دوسری طرف اموی پروپیگنڈہ ان کو جہالت اور گمراہیوں کی ہولناک ظلمت میں دھکیل دینے پر تلا ہوا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ انتہائی خاموشی اور راز داری سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ جب ایک ذرا سی غلطی آل رسولؐ کی موت اور اسلام کی فنا کا سبب بن سکتی تھی۔ جب ایک ذرا سا بہانہ شامی عیسائیوں اور اموی دشمنان اسلام کو مکہ اور مدینہ پر حملہ کرنے کی دعوت دے سکتا تھا اور جب اسلام کے لیے شاید اس سے بھی زیادہ کٹھن وقت تھا جس کا مقابلہ پیغمبر اسلامؐ کو مکی زندگی میں کرنا پڑا تھا' اس لیے کہ رسولؐ کے مقابلہ میں تو محض شیوخ قریش تھے جو اسلام کو ایک نوخیز اور معمولی سی تحریک تصور کرتے ہوئے اس کے مقابلہ میں اپنی پوری قوتیں صرف نہیں کرتے تھے' لیکن اب مقابلہ ایک منظم اور طاقتور حکومت سے تھا اور یہ حکومت بھی ان لوگوں کی تھی جو اسلام کی توانائیوں کا منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے' اس لیے اگر یہ لوگ یہ محسوس کر لیتے کہ مدینہ کو اسلام کی حیات نو کا گہوارہ بنایا جا رہا ہے اور حسنؑ کی تحریک ان کو پھر ایک بار وہی روز بد دکھائے گی جس کا تجربہ وہ رسولؐ کی مدنی زندگی میں کر چکے تھے تو یہ لوگ حکومت کی ساری قوتیں امام حسنؑ

اور ان کے رفقائے کار کے خلاف استعمال میں لے آتے اور اس کے نتیجہ میں اسلام کا خاتمہ ہو جاتا۔ ایسی حالت میں امام حسن علیہ السلام کو تلوار کی دھار پر رہتے ہوئے تبلیغ کا کام انجام دینا تھا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ نے یہ فریضہ اس خوبصورتی سے انجام دیا کہ دشمن کو آپ کے خلاف اقدام کرنے کا بہانہ بھی نہیں ملا اور اس اسلام حقیقی کی تبلیغ بھی ہوتی رہی جسے بنی امیہ مٹا دینا چاہتے تھے۔

ہم یہ بات کسی حسن عقیدت کے نتیجہ میں عرض نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس کا سب سے بڑا ثبوت معاویہ کی جانب سے امام حسن علیہ السلام کو زہر دلا دیا جانا ہے۔

زہر خورانی کا یہ واقعہ معاہدہ کے دس سال بعد وجود میں آیا جبکہ اس دس سال کے دوران میں امام حسنؑ کی جانب سے بظاہر کوئی ایسی حرکت ظہور میں نہیں آئی جس سے امیر معاویہ کو کوئی شکایت ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ پھر امیر معاویہ کو اس کی کیا وجہ تھی کہ وہ امام حسن علیہ السلام کو زہر دلوا دیتے؟

امیر معاویہ پاگل نہیں تھے کہ بلا وجہ اتنا بڑا اقدام کر کے اپنے سر دائمی بدنامی لے لیتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ خانوادہ رسالت کی دشمنی کے نتیجے میں وہ اس فعل کے مرتکب ہوئے تو دس سال تک وہ کیوں خاموش رہے؟ اور پھر صرف امام حسن علیہ السلام کو زہر کیوں دلوایا گیا؟ بنی ہاشم کے دوسرے افراد کو کیوں چھوڑ دیا گیا؟ امام حسین علیہ السلام اس واقعہ کے دس سال بعد تک زندہ رہے۔ آپ پر معاویہ نے حملہ کیوں نہیں کیا؟

ظاہر ہے کہ دس سال کی خاموشی کے بعد امیر معاویہ کا امام حسن علیہ السلام کے درپے آزار ہو جانا محض خاندانی دشمنی کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر

صرف خاندانی دشمنی اس کی محرک ہوتی تو دس سال کے انتظار کی کوئی وجہ نہیں تھی اور صرف امام حسن علیہ السلام کو شہید کر دینے سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ امیر معاویہ کے اس اقدام کی وجہ کچھ اور تھی۔

امیر معاویہ کو حکومت حاصل ہو جانے کے بعد امام حسن علیہ السلام سے تنازعہ کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی تھی اور چونکہ امام علیہ السلام کسی سیاسی معاملہ میں حصہ نہیں لے رہے تھے۔ اموی حکومت کے خلاف کوئی اقدام نہیں کر رہے تھے۔ بنی امیہ کے حکومتی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں فرماتے تھے۔ اس لیے امیر معاویہ اپنی جگہ مطمئن ہو گئے تھے۔ امیر معاویہ دنیا دار آدمی تھے اور آل رسولؐ کو بھی عام دنیا دار انسانوں کی طرح سمجھتے تھے' انہوں نے جب یہ دیکھ لیا کہ آل رسولؐ ان کے سیاسی معاملات میں مداخلت نہیں کر رہی ہے تو یہ سمجھ بیٹھے کہ خانوادہ رسالتؐ کی ہمت ٹوٹ چکی ہے۔ اس کا عزم شکستہ ہو گیا ہے اور اب اس کی جانب سے بنی امیہ کے اقتدار کے لیے کوئی خطرہ باقی نہیں ہے رہا مذہبی معاملہ تو امیر معاویہ اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جس کے نزدیک اسلام کی تحریک صرف حصول حکومت کا ایک بہانہ تھی۔ چنانچہ آپ کے والد کا حضرت حمزہؓ کی قبر پر ٹھوکر مار کر یہ فرمانا کہ:۔

"کیوں اے بنی ہاشم! تم نے اسی حکومت کے لیے ہم سے تنازعہ کیا تھا۔ اب دیکھ کہ امیہ کے فرزند اس سے کس طرح کھیل رہے ہیں"۔

یا آپ کے فرزند یزید کا سر امام حسین علیہ السلام دیکھ کر یہ ارشاد کیا:۔

کہ "نہ کوئی وحی آئی نہ کوئی پیغام اترا' یہ تو ایک ڈھونگ

تھا جو بنی ہاشم نے حکومت حاصل کرنے کے لیے رچایا تھا"۔

اس امر کا ثبوت ہے کہ امیر معاویہ اور آپ کے رفقاء کی نظر میں اسلام محض حصول حکومت کا ایک بہانہ تھا" اور یہ ایک کھیل تھا جو "معاذ اللہ خاتم بدھن رسولؐ نے کھیلا تھا تاکہ اس ترکیب سے ان کو اور ان کے افراد خاندان کو عرب کی تاجداری حاصل ہو جائے۔ امام حسن علیہ السلام کی ظاہری خاموشی اور سیاسی مسائل سے آپ کی بے تعلقی دیکھ کر امیر معاویہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اب آل رسولؐ نے "تمنائے حکومت" ترک کر دی ہے اور چونکہ اسلام اسی "تمنائے حکومت" کا دوسرا نام تھا۔ اس لیے اسلام بھی لب گور ہے۔ اس مہمل اور احمقانہ تصور نے امیر معاویہ کو امام حسن علیہ السلام کی جانب سے مطمئن کر دیا تھا لیکن چند ہی سال میں انہوں نے دیکھا کہ حسنؑ اسلام کو زندہ کرنے اور اس کے کمزور جسم میں زندگی کا لہو دوڑانے میں مصروف ہیں۔ آل رسولؐ کی تبلیغی مہم رفتہ رفتہ کامیاب ہوتی جا رہی ہے۔ حدیث سازی، منبروں پر سب و شتم اور اسی قسم کی تدابیر کے باوجود عوام کے ذہن اور ان کے قلب آل رسولؐ کی جانب مڑتے جا رہے ہیں ۔مسلمانوں کو یہ معلوم ہوتا جا رہا ہے کہ عربی یا اموی ملوکیت کا نام اسلام نہیں ہے بلکہ اسلام نام ہے اللہ کی زمین پر اللہ کی بادشاہی کا ـــــــ تو امیر معاویہ گھبرا گئے اور ان کو امام حسن علیہ السلام کے قتل کی سازش کرنا پڑی تاکہ اسلام کی وہ تحریک ختم ہو جائے جو اس عظیم امام کی انتہائی بلند مرتبہ قیادت میں اس خوبصورتی سے جاری تھی کہ حکومت کو ظاہر بظاہر حرف گیری اور اعتراض کا بھی کوئی موقع نہیں ملتا تھا اور تحریک بھی طاقتور ہوتی جا رہی تھی۔

امام حسن علیہ السلام کی تبلیغی مہم کے سلسلہ میں تاریخیں بڑی حد تک خاموش ہیں لیکن آپ کی دو بڑی حسین تدابیر کا ذکر ہر تاریخ میں موجود ہے یہ اور

بات ہے کہ مورخین نے جو تبلیغ کی نزاکت اور ایک پر آشوب دور میں تبلیغ کے پر خطر مگر موثر اور خاموش انداز سے قطعا ناواقف تھے ان دونوں تدابیر کا ذکر موقف اعتراض میں کیا ہے اور آل رسولؐ کی حکمت و بصیرت سے نا آشنا مسلمانوں نے بھی ان اہم تبلیغی تدابیر کو مورخین بنی امیہ کی غلط اندیشیوں کی روشنی میں نہ صرف یہ کہ غلط سمجھا بلکہ اپنی کوتاہی فکر کے نتیجہ میں اس پر اعتراض کی بھی جسارت کی ہے۔

تبلیغ کی ایک اہم خوبصورت اور پر تاثیر تدبیر "دستر خوان کی وسعت" تھی جس کے نتیجے میں ایک طرف تو غریب صحابہ کے قدم مدینہ میں جم گئے اور دوسری طرف مدینہ آنے والے دور دراز کے مسافر امام علیہ السلام کے بیت الشرف میں جمع ہوتے رہے اور غذائے جسمانی کے ساتھ غذائی روحانی حاصل کرتے رہے۔ ان مہمانوں میں ہر ملک کے لوگ ہوتے تھے جو امامؑ سے دین کی تعلیم حاصل کر کے اپنے اپنے ملکوں کو واپس جاتے تھے اور وہاں لوگوں کو اس دین حقیقی سے آگاہ کرتے تھے جس پر اموی حکومت پردے ڈال دینا چاہتی تھی۔ یہ تبلیغ اتنی موثر ثابت ہوئی کہ بنی امیہ کی وضعی احادیث کی قوت اور سب و شتم کا زور بھی اس کے سامنے بے حقیقت ثابت ہوا اور جیسے ہی معرکہ کرب و بلا میں امام حسین علیہ السلام کی شہادت نے مسلمانوں کو جھنجھوڑا' ان کے قلب و دماغ پر ضرب عائد کی اور ان کے مردہ ضمیر بیدار کیے۔ ویسے ہی اس تبلیغ کے اثرات اس شدت سے ظاہر ہوئے کہ بنی امیہ کا ایوان اقتدار زمین بوس ہونے لگا۔ جگہ جگہ بغاوتیں شروع ہو گئیں اور ہر سمت سے کھلم کھلا آل رسولؐ کی حمایت میں مظاہرے عام ہو گئے۔

تبلیغ کی دوسری خوبصورت' خاموش اور موثر تدبیر وہ تھی جو امام علیہ السلام

نے اپنے نانا جان سے سیکھی تھی، جس پر ناسمجھ مسلمان جو تبلیغ کی حکمتوں اور نزاکتوں سے ناآشنا ہیں تعریض کی نگاہیں ڈالا کرتے ہیں!

وہ تدبیر تھی نکاح! ——— امام علیہ السلام نے بالکل اسی طرح جس طرح آپ کے نانا جانؐ نے کئی نکاح فرمائے تھے مختلف قبائل عرب میں بہت سی شادیاں فرمائیں اور جس طرح سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد ان شادیوں سے یہ مختلف قبیلوں کی حمایت حاصل کی جائے یا ان قبائل میں تبلیغ کی راہ ہموار کرلی جائے۔ اسی طرح امام علیہ السلام نے بھی کثرت ازدواج کے ذریعے عرب کے مختلف قبائل کو آل رسولؐ کا ہمنوا بنا دیا اور ان سے ایسے دوستانہ روابط قائم کرلیے جن کے نتیجہ میں ان پر تبلیغ آسان ہوگئی۔

شادی بیاہ کے ان تعلقات کے نتیجہ میں عرب کے زیادہ سے زیادہ قبائل کو آل رسولؐ سے قریب تر آنے اور ان کی سیرت و کردار کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور پھر اس میل جول کے نتیجہ میں لازمی طور پر دین کے متعلق آل رسولؐ کے افکار ان تک پہنچے جس سے ان میں حق و باطل کی تمیز کا جذبہ ابھرا۔ انہوں نے ایک طرف بنی امیہ کے کردار اور ان کے افکار کا مطالعہ اور دوسری طرف آل رسولؐ کے تصور دین اور ان ذوات مقدسہ کے کردار و عمل کا جائزہ لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق پر باطل کے جو غلاف ڈال دیے گئے تھے منبروں سے باطل کا جو شور برپا تھا اور جھوٹی حدیثوں کی مدد سے مسلمانوں کے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کی جو تدبیریں کی جا رہی تھیں ان کا سارا اثر ختم ہوگیا۔ باطل کے شور بے ہنگام کے باوجود حقیقت برابر لوگوں کے سامنے آتی رہی حق کی آواز عمل کی شکل میں برابر ابھرتی رہی اور ازدواجی تعلقات کی مدد سے مسلمانوں کا دوسرا امام اموی پروپیگنڈہ کے اثرات کو اس خوبصورتی سے مٹاتا چلا گیا کہ حکومت وقت کو

اعتراض کا موقع بھی نہیں ملا اور جس حق کو دبانے پر حکومت کی ساری قوتیں مرکوز تھیں وہ نہ صرف یہ کہ دب یا مٹ نہ سکا بلکہ مختلف قبائل میں اس خوبصورتی سے عام ہو گیا کہ حکومت کا جبر اور پروپیگنڈہ کی قوتیں بھی اسے دبانے یا مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

ظاہر ہے کہ حکومت وقت اس کی اجازت ہرگز نہ دیتی کہ امام حسن علیہ السلام بھری مسجدوں میں تقریریں کرتے یا ساری مملکت اسلامی میں دورہ کر کے جگہ جگہ آل رسولؐ کی حقانیت کا اعلان کرتے ہر قبیلہ میں جا کر لوگوں کو تحریک اسلامی کی دعوت دیتے۔ بنی امیہ کی اسلام دشمن حرکتوں کو علانیہ بیان فرماتے اور ان کے مقابلہ میں خلافت الٰہیہ کے اصولوں کو واضح کرتے ـــــ ایسا کرنا بلاوجہ موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا اور حسنؑ کی موت اسلام کی موت ثابت ہوتی اس لیے کہ بنی امیہ اسلام کی کھلم کھلا تبلیغ پر لازماً چراغ پا ہوتے۔ آل رسولؐ کے سارے افراد اسی طرح تہ تیغ کر دیئے جاتے جس طرح ان کی حمایت کے جرم میں حجر اور ان کے ساتھی تہ تیغ کر ڈالے گئے اور عام مسلمان بھی اس قربانی کا کوئی اثر نہ لیتے اس لیے کہ ابھی بنی امیہ اور آل رسولؐ کے افکار و اعمال کا فرق عام مسلمانوں پر واضح نہیں ہوا تھا اور اس ٹکراؤ کو محض دو طلبگاران شاہی کا ٹکراؤ قرار دے کر نظر انداز کر دیا جاتا۔ قربانیوں کا اثر تبھی ہوتا ہے جب عوام ان مقاصد کے ہم نوا ہو جاتے ہیں جن کے لئے قربانی پیش کی جاتی ہے اس لیے قربانی پیش کرنے سے قبل مقاصد کی اشاعت اور ان کی صحت کا ثبوت فراہم کرنا ضروری ہوا کرتا ہے۔ حجر اور ان کے ساتھی قتل ہو گئے لیکن چونکہ ابھی تک عوام آل رسولؐ اور بنی امیہ کے افکار و عمل کا فرق صحیح طور پر نہیں جانتے تھے اس لیے ان قربانیوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا بلکہ الٹا اثر یہ ہوا کہ عوام دہشت

زدہ ہو کر اور زیادہ بنی امیہ کے مطیع ہو گئے۔ اس کے برعکس بیس سال کی تبلیغ کے نتیجہ میں امام حسنؑ اور امام حسین علیہم السلام نے اسلامی دنیا کو اپنے مقاصد کی صحت و عظمت کا اس حد تک معترف بنا دیا کہ معرکہ کربلا کے بعد یزید کے لیے تخت حکومت کانٹوں کا بستر بن گیا اور اس قربانی کے نتیجہ میں آل ابو سفیان نہ صرف یہ کہ حکومت سے محروم ہو گئی بلکہ دنیا سے اس کا نام و نشان تک محو ہو گیا یہ تھی وہ صورت جو تحریک اسلامی کے دوسرے قائد کے سامنے تھی اس لیے وہ ایک فضول اور بے نتیجہ ٹکراؤ کو دعوت دے کر نہ تو اپنی عظیم قربانی کو رائیگاں جانے دے سکتے تھے اور نہ بنی امیہ کو عتاب میں لا کر اسلام کو مہلکہ میں مبتلا کر سکتے تھے امام حسن علیہ السلام ایسا کرتے تو یہ چیز قوموں کی نفسیات سے لاعلمی اور قیادت کی غلطی سے تعبیر کی جاتی۔ یہ وقت ٹکراؤ کا تھا ہی نہیں بلکہ اسی طرح جس طرح مکی زندگی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ٹکراؤ کا موقع نہیں تھی اس لیے امام حسن علیہ السلام نے دستر خوان کی وسعت اور ازواج کی کثرت کی وہ عجیب و غریب تبلیغی تدابیر اختیار کیں جن سے تبلیغ کا کام بھی جاری رہا اور حکومت بھی آپ پر کوئی شبہ نہیں کر سکی۔ آل رسولؐ کی مہم جاری رہی تحریک اسلامی پروان چڑھتی رہی اور دشمن غافل رہا۔ دس سال میں امام حسن علیہ السلام نے اسلام کے اکھڑے ہوئے قدم پھر سے جما دیے اور بنی امیہ کے پروپیگنڈہ کو اتنا بے اثر کر ڈالا کہ اب حکمران طبقہ کو اپنی ناکامی کا احساس ہونے لگا وہ یہ سمجھ گیا کہ دستر خوان پر محض روٹیاں تقسیم نہیں ہوتیں اموی ملوکیت کے مقابلہ میں خلافت ربانی کی نعمتیں تقسیم ہوا کرتی ہیں اور حسنؑ کے نکاح و طلاق کا مقصد نہ عیش ہے نہ جمود بلکہ اس تدبیر سے مختلف قبائل عرب کو قریب تر لا کر ان کو دعوت اسلامی سے ہمکنار کیا جا رہا ہے لیکن چونکہ یہ سب کچھ اس خاموشی سے

ہو رہا تھا کہ حکومت امام حسن علیہ السلام کے خلاف کوئی ثبوت فراہم کرنے سے قاصر تھی اور ان پر کھلم کھلا حکومت کی مخالفت کا الزام عائد کرنا ناممکن تھا۔ دوسرے امام حسنؑ کے مقابلہ میں تلوار اٹھانے یا ان کو قید کرنے میں ان قبائل سے ٹکراؤ کا خطرہ تھا جن سے امامؑ رشتہ داریاں کر چکے تھے اس لیے امیر معاویہ اس پر مجبور ہو گئے کہ ایک بزدل سازشی کا کردار انجام دیتے ہوئے امام حسن علیہ السلام کو زہر دلوا دیں اور اس طرح تحریک اسلامی کی دعوت کے اس عجیب و غریب نظام کو ختم کر دیں جسے اس عظیم المرتبت اور عرش پیما عقل و فہم رکھنے والے قائدین و امام عصر نے منظم فرمایا تھا۔ لیکن امیر معاویہ اپنی کوتاہی فہم کے نتیجہ میں پھر ایک بار دھوکا کھا گئے۔ حسنؑ تحریک کو اتنا مضبوط بنا چکے تھے کہ اب ان کی مظلومانہ شہادت اس تحریک کو ختم کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی تحریک اسلامی نے دلوں میں اتنی جگہ نہیں پکڑی تھی کہ امام حسنؑ کی شہادت پر مسلمان اسی طرح غضبناک ہو کر شمشیر بکف ہو جاتے جس طرح امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر ہوا لیکن پھر بھی یہ تحریک دماغوں پر اتنا اثر ضرور ڈال چکی تھی کہ اب لبوں پر بنی امیہ کی شکایتیں آنے لگیں۔ لوگ امیر معاویہ سے مرعوب ہونے کے بجائے ان پر اعتراض کرنے لگے۔ زبانوں پر چڑھے ہوئے قفل کھل گئے۔ چنانچہ یزید کی ولیعہدی کے سلسلہ میں امیر معاویہ کو جن اختلافات کا سامنا کرنا پڑا وہ اس کا کھلا ہوا ثبوت ہیں کہ امیر معاویہ کے اقتدار کا محل لرز چکا تھا اور بنی امیہ کی وحشت اور ہیبت دلوں سے رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ مسلمانوں میں جرائت کردار پیدا ہونے لگی تھی اور وہ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ انہوں نے بنی امیہ کو حکمرانی عطا کر کے ایک بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔

امام حسن علیہ السلام کی زہر خورانی کے سلسلہ میں دو بڑی اہم چیزیں

ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ امامؑ کو جس عورت نے زہر دیا وہ حضرت ابوبکر کی بھانجی، حضرت عائشہ کی پھوپھی زاد بہن اور حضرت ابوبکر کے نواسے عبداللہ بن زبیر کی خالہ تھی جس سے حضرت ابوبکر کے خاندان اور آل رسولؐ کے تعلقات پر کافی سے زیادہ روشنی پڑتی ہے اور دوسرے امام حسنؑ علیہ السلام کے اسوہ حسنہ میں سیرت رسولؐ کا رنگ کتنا گہرا تھا۔ اس کا ہمیں بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے امام کو زہر دینے والی عورت جعدہ بنت اشعث بن قیس کندی کی بیٹی تھی جو فرقہ خوارج کا بانی تھا اور جس کے مقابلہ میں امیر المومنینؑ کو جنگ نہروان لڑنا پڑی تھی اعتراض یہ کیا جا سکتا ہے کہ امام حسن علیہ السلام نے ایسی عورت سے شادی کیوں کی؟ ——— اور اس دشمنی کے پیش نظر جو اشعث بن قیس کندی کو آپ کے خانوادہ مبارکہ سے تھی۔ اس کی بیٹی سے عقد کیوں فرمایا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ امام حسن علیہ السلام کے سامنے بھی وہی مصالح تھے جو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھے اور جن کے نتیجے میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سب سے بڑے دشمن ابوسفیان کی بیٹی سے عقد کیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ رسولؐ و آل رسولؐ کے افعال پر خود اپنے کردار و عمل کی روشنی میں غور کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہم سے اگر کوئی شخص دشمنی برتے تو ہم اس سے شادی بیاہ کے تعلقات ہرگز قائم نہیں کریں گے لیکن رسولؐ و آل رسولؐ کی صورت بالکل دوسری تھی۔ ان کی دوستی اور دشمنی، ان کے روابط و تعلقات، ان کے شادی بیاہ کے معاملات، ان کا میل جول، سب اللہ اور اسلام کے لیے ہوتا تھا۔ ان کے کسی عمل میں نفسانیت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا تھا سرکار دو عالمؐ نے مختلف قبائل اور خاندانوں میں شادیاں کیں۔ تاکہ ان کو اسلام سے

قریب تر کر دیں یا کم از کم وہ اسلام کی مخالفت ترک کر دیں۔ بالکل یہی صورت حال امام حسن علیہ اسلام کی تھی۔ اشعث بن قیس کی امیرالمومنینؑ سے جنگ کے نتیجہ میں قبیلہ بنی کندہ آل رسول کا مخالف ہو گیا تھا اور اس طرح اسلام حقیقی سے دور ہوتا جا رہا تھا امام حسن علیہ السلام نے اس قبیلہ کی ایک عورت سے عقد فرما کر اس دیوار کو منہدم کر دیا جسے اشعث نے اپنی منافقت، کور باطنی اور اسلام دشمنی کے نتیجہ میں آل رسولؐ اور بنی کندہ کے درمیان میں کھڑا کر دیا تھا اور اس طرح اپنی جان کو ملکہ میں ڈال کر آپ نے عرب کے قبیلہ کو جو اسلام اور آل رسولؐ سے دور ہوتا جا رہا تھا اسلام سے قریب تر رہنے پر مجبور کر دیا۔ بالکل یہی صورت آپ نے بعض اور قبائل کے سلسلہ میں بھی برتی۔ چنانچہ آپ کی ازواج میں کئی عورتیں ایسی ملتی ہیں جو ان قبائل سے تعلق رکھتی تھیں جو آل رسولؐ کے دشمن خیال کیے جاتے تھے۔ ان میں سے بعض عورتیں ایسی بھی نکلیں جو آپ کی ہلاکت کا سبب بن سکتی تھیں لیکن آپ نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور ان عورتوں سے عقد کر کے ان قبائل اور خاندانوں تک آل رسولؐ کا پیغام پہنچایا جن تک اسلام کی آواز اور آل رسولؐ کی تحریک پہنچانے کا کوئی دوسرا وسیلہ اس دور میں موجود نہیں تھا۔

امام حسن علیہ السلام جعدہ کو بھی جانتے تھے اور ان دوسری عورتوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ان کے قبائل اور ان کے خاندانوں کا سارا کردار آپ کے سامنے تھا۔ آپ بخوبی سمجھتے تھے کہ ان عورتوں سے شادی آپ کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی ان قبائل اور خاندانوں کو آل رسولؐ کی تحریک سے روشناس کرانے اور ان کو اسلام و پیغمبر اسلامؐ سے قریب تر کر دینے کے لیے آپ نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا اور اس طرح اسلام کی تبلیغ کا وہ عظیم الشان

فریضہ انجام دیا جو صرف سید شباب اہل الجنتہ ہی انجام دے سکتا ہے۔

امام حسن علیہ السلام ملت اسلامیہ کے مامور من اللہ قائد کی حیثیت سے اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں ایک کامیاب انسان نظر آتے ہیں۔ آپ نے امیر معاویہ کو حکومت کا کھلونا دے کر بنی امیہ کو نہ صرف یہ کہ اسلام کی بیخ کنی میں مصروف رہنے سے روک دیا بلکہ وہی قوتیں جو اسلام کو مٹانے پر صرف ہوتیں، حدود سلطنت اسلامی کی مدافعت اور مملکت اسلامی کی توسیع پر صرف ہونے لگیں۔ اسلام کے دشمن بنی امیہ اسلام کے لیے ممالک فتح کرنے لگے اور چونکہ ان کو حکومت کے اندرون ملک میں خانہ جنگی اور انتشار پھیلانے سے روک دیا گیا تھا۔ اس لیے امام حسنؑ اور امام حسین علیہم السلام کو یہ موقع مل گیا کہ وہ دوبارہ عربوں میں صحیح اور سچے اسلام کی تبلیغ کر کے شیطان کی وہ بازی الٹ دیں جو وہ بنی امیہ کی مدد سے کھیلنا چاہتا تھا۔ چنانچہ حسنؑ نے اپنے نانا کی مکی زندگی کی خاموشی اختیار کر کے اور حسینؑ نے نانا کی مدنی زندگی کا جہاد اختیار فرما کر دوبارہ وہی کام انجام دیا جو پیغمبر اسلامؐ نے انجام دیا تھا اور آج یہ انہیں دونوں عظیم قائدین نسل انسانی کا کارنامہ ہے کہ دنیا میں وہ الٰہی پیغام زندہ اور موجود ہے جس پر انسانیت کی فوز و فلاح کا انحصار ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر امام حسن علیہ السلام نے بنی امیہ کو بادشاہت سپرد کر کے ان کے چہروں سے نفاق کی نقابیں نہ الٹ دی ہوتیں اور حکومت الہیہ اور انسانی حاکمیت کے فرق کو عملاً واضح نہ کر دیا ہوتا تو امام حسین علیہ السلام کو وہ کامیابی ہرگز نصیب نہ ہوتی جو آپ کو حاصل ہوئی۔ امام حسن علیہ السلام نے معاویہ سے تلوار کی جنگ بند کرنے کا جو معاہدہ فرمایا تھا وہ دراصل معرکہ کربلا کی تمہید تھی کربلا کے فیصلہ کن مجاہدہ کا آغاز تھا' یہاں سے آل رسولؐ کو یہ موقع ملا

تھا کہ وہ اسلامی دنیا کو اسلام کے صحیح تصورات سے آگاہ کرے۔ پھر جن لوگوں میں اسلام کی سچی لگن پیدا ہو جائے ان کو منظم کرے اور اس جمعیت کو کربلا کے میدان میں اتار کر اپنی لافانی قربانیوں سے اسلام کو حیات جاوداں عطا کر دے۔

امام حسن علیہ السلام جنگ بندی کا معاہدہ نہ کرتے تو بنی امیہ حدود مملکت اسلامی میں ویسا ہی غدر مچائے رہتے جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام کے زمانہ میں انہوں نے برپا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ صحابہ و تابعین کی وہ مختصر سی جماعت جو احادیث رسولؐ کی امین اور شریعت اسلامی کی خزینہ دار تھی یا تو اموی تلواروں کے گھاٹ اتر جاتی اور یا پھر منتشر ہو کر بے اثر اور تباہ ہو جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ عرب میں دوبارہ دور جاہلیت پلٹ آتا۔ اسلام کی تعلیم دینے والے ختم ہو جاتے۔ فقہ اسلامی کے جاننے والے معدوم ہو جاتے۔ اور اللہ کا آخری پیغام امٹ جاتا۔

امام حسن علیہ السلام نے جنگ بند کر کے اس خطرہ کو دور کر دیا۔ آپ کے اس اقدام کے نتیجہ میں بنی امیہ اسلام کی بیخ کنی کے بجائے انتظام مملکت میں مصروف ہو گئے۔ ان کی توجہ اسلام دشمنی سے ہٹا کر سیاست ملکی پر مرکوز کر دی گئی اور ادھر آل رسولؐ اور ان کے ساتھیوں کو سکون کی فضا میں اسلام کی تبلیغ کا موقع ہاتھ آگیا۔ امام حسن علیہ السلام نے تبلیغ کا موقع فراہم کیا امام حسین علیہ السلام نے اس تبلیغ کے اثرات کو اپنی قربانی سے ناپائیدار بنا دیا اس طرح ان دونوں بھائیوں نے جو قدرت کی جانب سے نسل انسانی کی ہدایت پر مامور تھے۔ اپنی بے پناہ قائدانہ صلاحیتوں سے اسلام کو اموی فتنہ سے بچالیا اور وہ کام جو بدر واحد میں رسول اللہ نے شروع فرمایا تھا مدینہ اور کربلا کی مقدس زمینوں پر رسول

محمد صلی اللہ علیہ [illegible] آج دنیا کے
ایک بڑے حصہ پر اسلام کا پھریرا لہرا رہا ہے۔

یہاں ہم امام حسن علیہ السلام کے بے پناہ تدبر و بصیرت کے ایک اور اہم مظاہرہ کی جانب ناظرین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ آپ نے معاویہ سے معاہدہ کر کے جہاں امام حسین علیہ السلام کو مناسب وقت پر ایک عظیم قربانی پیش کرنے اور اس طرح اسلام کو حیات نو عطا کرنے کا موقع عنایت کر دیا وہیں مستقبل میں اس قربانی کی یادگار کو محفوظ رکھنے کا بھی سامان کر گئے۔ امام کی دوربین نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ بنی امیہ امام حسین علیہ السلام کو شہید کر دینے کے بعد جہاں جبر و قدر کا مسئلہ ایجاد کر کے قتل حسینؑ کی ذمہ داری خدا پر ڈالیں گے۔ یا قتل الحسین بسیف جدہ کا نعرہ بلند کر کے قتل حسینؑ کا الزام رسول پاکؐ کی ذات پر لگائیں گے وہیں کوفہ والوں کی "شیعیت" کا شور برپا کر کے اپنا جرم شیعوں کے سر تھوپنے کی کوشش بھی کریں گے اور بنی امیہ کے ہوا خواہ اس الزام کو ہمیشہ شد و مد سے دہراتے ہوئے حسینؑ کی عزاداری کی مخالفت کریں گے۔ امام نے معاویہ سے معاہدہ کر کے شیعوں کو اس الزام سے قطعاً" بری الذمہ کر دیا اس لیے کہ معاہدہ پر دستخط ہوتے ہی کوفہ والوں نے امیر معاویہ کی بیعت کر لی اور اموی خلافت پر ایمان لے آئے ان کے اس اقدام نے یہ ثابت کر دیا کہ کوفہ والے ہرگز شیعہ نہیں تھے اس لیے کہ شیعہ امامت کے لیے عصمت اور منصوص من اللہ ہونا ضروری تصور کرتے ہیں اور امیر معاویہ نہ معصوم تھے نہ مامور من اللہ۔ ایسی حالت میں کوئی شیعہ نہ تو ان کی بیعت کر سکتا ہے اور نہ ان کو خلیفہ مان سکتا ہے۔ کوفہ والوں نے امیر معاویہ کی بیعت کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ "انسانی حاکمیت" کے اصول پر ایمان رکھتے تھے اور یہ وہی لوگ تھے جو حضرت علی

[illegible]

ٹکراؤ کی تیاریاں

امام حسنؑ کی شہادت کے بعد اسلامی تحریک کی قیادت امام حسینؑ کے ہاتھوں میں آئی۔ وقت بڑا پر آشوب تھا۔ بنی امیہ یہ سمجھ چکے تھے کہ آل رسولؐ کے قائدین ان کی بساط کفر و نفاق کو الٹ ڈالنے پر تلے ہوئے ہیں اور ان کی صلح دراصل ایک بڑی جنگ کا پیش خیمہ ہے۔ اس سکون کے پردے میں ایک بڑا طوفان پرورش پا رہا ہے اور حسنؑ کی خاموشی درحقیقت ایک فیصلہ کن اور عظیم ٹکراؤ پر منتج ہونے والی ہے۔ اسی لیے انہوں نے امام حسن علیہ السلام کو زہر دلا دیا تاکہ آل رسولؐ مشتعل ہو کر ایک ایسے وقت میں ٹکراؤ پر مجبور ہو جائے جبکہ اس کی تیاریاں مکمل نہیں ہیں اور معاویہ کو "صحابیت" کی وہ آڑ حاصل ہے جس کے پردے میں وہ گلشن اسلام کو تاراج کر ڈالنے کے باوجود اپنے چہرے پر بے گناہی اور معصومیت کی نقاب ڈالے رہ سکتا ہے لیکن بنی امیہ کا اندازہ بالکل غلط نکلا۔ آل رسول کے افراد حکمت ربانی کے امین تھے اور وہ کسی وقتی اشتعال پر اپنے دائمی مقاصد کو قربان نہیں کر سکتے تھے۔ بنی امیہ اور ان کے ہمنواؤں کی تمام اشتعال انگیزیوں پر صبر کا ٹھنڈا پانی چھڑک دیا گیا حسنؑ کی نعش حجرہ رسولؐ میں دفن کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ حضرت عائشہ خچر پر سوار ہو مخالفت کرنے والوں کے پیش پیش تھیں۔ مروان اور اس کے ساتھیوں نے سبط اکبر کے تابوت پر تیر اندازی شروع کر دی۔ غرض اشتعال انگیزی کا ہر حربہ استعمال کیا گیا لیکن تحریک اسلامی کے تیسرے قائد کی جبین صبر پر کوئی شکن نمودار نہ ہو سکی حسینؑ جانتے

تھے کہ ابھی ان کے لیے ٹکراؤ کا کوئی موقعہ نہیں ہے۔ اس وقت ٹکراؤ کے معنی یہ ہوں گے کہ ام المومنین حضرت عائشہ اور خال المومنین امیر معاویہ دونوں "صحابیت" اور "خطائے اجتہادی" کی رداؤں میں منہ چھپا کے تاریخ کی نگاہوں میں بے گناہ بننے کی کوشش کریں گے اور "آل رسولؐ کو ختم کر دینے" کی سازش کامیاب ہو جائے گی۔ قربانی رائیگاں جائے گی جمل اور صفین کے پٹے ہوئے مہرے جیت جائیں گے اور بنی امیہ دنیا کو یہ فریب دینے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ حسنؑ کے مرتے ہی حسینؑ نے "حصول حکومت" کی جنگ چھیڑ دی تھی جس میں وہ مارے گئے۔ پھر مدینہ کا ماحول بھی کسی قربانی کے لیے سازگار نہیں تھا اس لیے کہ جس مدینہ میں سبط اکبرؑ کی نعش مطہر پر تیروں کی بارش ہو اور لوگ اس واقعہ کو محض تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہیں وہاں اگر سبط اصغرؑ بھی ذبح ہو جاتا تو دلوں پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ مدینہ والوں کے دل مردہ اور ضمیر افسردہ ہو چکے تھے۔ اس لیے وہاں کسی قربانی سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسی حالت میں تحریک اسلامی کے قائد کی حیثیت سے امام حسین علیہ السلام نے یہی مناسب جانا کہ خانوادہ رسالت پر جو ظلم ہو رہا ہے اسے انگیز کر لیا جائے اور اسلام کو تاراجی سے بچا لیا جائے۔ حسنؑ کی نعش حجرہ رسولؐ میں دفن نہیں ہو سکتی تو نہ ہو لیکن بنی امیہ کو اسلام کی تدفین کا موقع نہ ملنے دیا جائے معاویہ اور مروان کی سازش کو ناکام بنا دیا جائے اور اس شجر اسلام کی بیخ کنی نہ ہونے دی جائے جسے حسنؑ کی موت سے فائدہ اٹھا کے بنی امیہ ہمیشہ کے لیے کاٹ دینا چاہتے تھے۔

ٹکراؤ کے لیے یہ وقت اس اعتبار سے بھی مناسب نہیں تھا کہ ابھی بنی امیہ کی بہت سی بد اعمالیاں منظر عام پر نہیں آئی تھیں اور عوام امیر معاویہ کو صحابی تصور کرتے ہوئے "فریب عدالت" میں مبتلا تھے اس لیے یہ ضروری تھا کہ

ابھی انتظار کی روش قائم رکھی جائے اور جب نفاق کے چہرے پر پڑے ہوئے سب پردے الٹ جائیں تو میدان میں قدم رکھا جائے تاکہ ٹکراؤ میں کامیابی یقینی ہو جائے چنانچہ امام حسین علیہ السلام نے دشمن کی شدید اشتعال انگیزیوں پر بھی در گزر سے کام لیا اور اپنے بھائی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان عظیم تیاریوں میں مصروف رہے جو معرکہ کرب و بلا کے لیے درکار تھیں۔

مروان اور حضرت عائشہ مدینہ میں جنگ چھیڑ کر شامی مسیحی لشکر کو "بغاوت فرو کرنے" کے بہانے مدینہ پر لشکر کشی کی دعوت دے سکتے تھے۔ ان کو اس سے کوئی بحث نہیں تھی کہ مدینہ کی تاراجی اور اصحاب رسولؐ کا قتل عام تفسیر حدیث اور فقہ کے خزانوں کی پامالی پر منتج ہو گا اور دنیائے اسلام مٹ جائے گا ان کو بس فکر تھی تو اتنی کہ اس طرح امیر معاویہ کے دربار میں محترم ہو جائیں گے اور آل رسول کی فنا کے انعام میں امیر معاویہ ان کو سونے چاندی میں تول دیں گے لیکن امام حسین علیہ السلام اتنے پست اور ذلیل مقصد کی خاطر مدینہ کو خونریزی کا شکار نہیں ہونے دے سکتے تھے۔ آپ نے صبر سے کام لے کر مدینہ اور علوم اسلامی دونوں کو تباہی سے بچا لیا اور ایک چپ سے وہ بلا ٹال دی جو اسلام کے سر پر منڈلا رہی تھی۔

• وقت گزرتا گیا اور بنی امیہ آل رسولؐ کو خاموش دیکھ کر اپنی حرکتوں پر شیر ہوتے چلے گئے۔ ظلم و عدوان عام ہو گئے' بیت المال اسلامی شاہی خزانہ بن گیا۔ فسق و فجور کی گرم بازاری ہو گئی' اور اب ملت اسلامیہ کی آنکھیں کھلنا شروع ہوئیں۔ مسلمانوں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ قیصریت شام کے راستے عربستان میں داخل ہو گئی ہے۔ قیصرو کسریٰ کی روح دمشق میں رقص کناں ہے۔ وہ آزادی جو اسلام نے انسان کو عطا کی تھی

سلب ہو رہی ہے اور انسان پر انسان کی ملوکیت یا حکومت کے جس طلسم کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے توڑ ڈالا تھا وہ آمریت کی شکل میں دوبارہ مسلمانوں پر نافذ ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کے اس احساس کا اظہار قریش کے ایک بہت بڑے ستون سعد بن ابی وقاص نے معاویہ کے بھرے دربار میں اس طرح کیا کہ آپ نے

"اسلام علیکم اے بادشاہ"

کہہ کر معاویہ کو سلام کیا اور جب معاویہ نے اس معنی خیز جملہ کا اثر کو کم کرنے کے لیے کہا کہ

"اے سعد اگر تم اسلام علیکم اے امیرالمومنین کہتے تو کیا حرج تھا"۔

تو سعد نے پوری سنجیدگی کے ساتھ اس جملہ کا یہ جواب دیا کہ

"معاویہ خود اپنے دل سے پوچھو کہ میں نے تم کو جس لقب سے پکارا ہے وہ تمہارے دل کو کتنا محبوب ہے؟"

یہ تھی وہ کیفیت جو معاویہ کے دور سلطنت کے آخری ایام میں پیدا ہو چکی تھی لیکن ابھی حسینؑ کو کچھ اور وقت درکار تھا۔ ابھی مسلمانوں کے قلب و ذہن پر ایک چوٹ لگنا باقی تھی اور تحریک اسلامی کا بالغ نظر قائد اسی چوٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ وقت نے یہ کسر بھی پوری کر دی امیر معاویہ نے یزید کی جانشینی کا فیصلہ کر دیا اور یہ فیصلہ اتنا مہیب، اتنا تباہ کن اور اتنا خوفناک تھا کہ عبدالرحمان بن ابی بکر، عبداللہ بن زبیر، اور عبداللہ بن عمر کے سے عیان قریش بھی اس فیصلہ پر تلملا اٹھے مسلمانوں میں ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی اور عوام ملوکیت کا یہ ننگا ناچ دیکھ کر بے چین ہو گئے یہ پہلا موقع تھا جب امام حسین علیہ السلام نے سیاسی مطلع پر ظہور فرمایا اور آپ نے کھلم کھلا نسلی بادشاہت کے قیام پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر فرمائی۔ لیکن یہ احتجاج محض زبانی تھا اس لیے کہ ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ جب

تحریک اسلامی کا قائد امویت پر فیصلہ کن ضرب عائد کرتا۔ ابھی نظام اسلامی کی پیہم مخالفتوں کے باوجود اموی حکمرانوں کے چہرہ پر صحابیت کی نقاب پڑی ہوئی تھی اور مسلمان آسانی سے مبتلائے فریب ہو سکتے تھے اس لیے امام نے خاموشی ہی مناسب جانی اور صرف احتجاج پر اکتفا فرمائی[۱۹] لیکن امیر معاویہ سمجھ گئے کہ یہ احتجاج ایک ٹکراؤ کا پیش خیمہ ہے انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ آل رسولؐ کے متعلق ان کے سارے اندازے غلط تھے ان کا تصور مہمل تھا کہ آل رسولؐ کی ہمت ٹوٹ چکی ہے دل بیٹھ چکے ہیں۔ عزم شکستہ ہو چکا ہے اور اب وہ بنی امیہ کی قہرانی قوتوں کو چیلنج نہیں کرے گی چند سال قبل ان کو یہ احساس پیدا ہوا ہوتا تو وہ حسینؑ بن علیؑ کا بھی وہی حشر کر ڈالتے جو انھوں نے حجر بن عدی اور رشید ہجری کا کیا تھا۔ لیکن اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اسلامی دنیا میں حسینؑ کی پوزیشن بہت مضبوط ہو چکی ہے مسلم عوام میں فرزند رسولؐ کا وقار کافی بلند ہو چکا ہے۔ بنی امیہ کے افعال ناشائستہ کے نتیجہ میں عوام یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ان کو دھوکا دیا گیا ہے اور اموی خلافت کے نام سے ان پر قیصری ملوکیت نافذ کر دی گئی ہے۔ عوام میں اب یہ احساس بھی ابھرنے لگا ہے کہ آل رسولؐ کا موقف صحیح تھا آل رسولؐ اپنی ذاتی یا خاندانی بادشاہت کے لیے نہیں لڑ رہی تھی بلکہ ایک ایسے اصول کے لیے رزم آرا ہو رہی تھی جس میں خود مسلمانوں کا فائدہ تھا اور اس احساس کے نتیجہ میں عوام کی نگاہیں اپنی قیادت کے لیے حسینؑ کی جانب اٹھنے لگی تھیں۔ ایسی حالت میں امیر معاویہ کے لیے حسینؑ پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں رہا تھا اور وہی شخص جو چار سال تک امیر المومنینؑ کے مقابلہ میں تیغ بکف رہ چکا تھا جس نے حسنؑ کو زہر دغا کا نشانہ بنا دیا تھا جس کے ہاتھ سینکڑوں بیگناہوں کے خون سے رنگین ہو چکے تھے اور جو قتل و خونریزی کو ایک کھیل

تحریک اسلامی کا قائد امویت پر فیصلہ کن ضرب عائد کرتا۔ ابھی نظام اسلامی کی پیہم مخالفتوں کے باوجود اموی حکمرانوں کے چہرہ پر صحابیت کی نقاب پڑی ہوئی تھی اور مسلمان آسانی سے مبتلائے فریب ہو سکتے تھے اس لیے امامؑ نے خاموشی ہی مناسب جانی اور صرف احتجاج پر اکتفا فرمائی[۱۹]' لیکن امیر معاویہ سمجھ گئے کہ یہ احتجاج ایک ٹکراؤ کا پیش خیمہ ہے انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ آل رسولؐ کے متعلق ان کے سارے اندازے غلط تھے ان کا تصور مہمل تھا کہ آل رسولؐ کی ہمت ٹوٹ چکی ہے دل بیٹھ چکے ہیں۔ عزم شکستہ ہو چکا ہے اور اب وہ بنی امیہ کی قہرانی قوتوں کو چیلنج نہیں کرے گی چند سال قبل ان کو یہ احساس پیدا ہوا ہوتا تو وہ حسینؑ بن علیؑ کا بھی وہی حشر کر ڈالتے جو انہوں نے حجر بن عدی اور رشید ہجری کا کیا تھا۔ لیکن اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اسلامی دنیا میں حسینؑ کی پوزیشن بہت مضبوط ہو چکی ہے مسلم عوام میں فرزند رسولؐ کا وقار کافی بلند ہو چکا ہے۔ بنی امیہ کے افعال ناشائستہ کے نتیجہ میں عوام یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ان کو دھوکا دیا گیا ہے اور اموی خلافت کے نام سے ان پر قیصری ملوکیت نافذ کر دی گئی ہے۔ عوام میں اب یہ احساس بھی ابھرنے لگا ہے کہ آل رسولؐ کا موقف صحیح تھا آل رسولؐ اپنی ذاتی یا خاندانی بادشاہت کے لیے نہیں لڑ رہی تھی بلکہ ایک ایسے اصول کے لیے رزم آرا ہو رہی تھی جس میں خود مسلمانوں کا فائدہ تھا اور اس احساس کے نتیجہ میں عوام کی نگاہیں اپنی قیادت کے لیے حسینؑ کی جانب اٹھنے لگی تھیں۔ ایسی حالت میں امیر معاویہ کے لیے حسینؑ پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں رہا تھا اور وہی شخص جو چار سال تک امیرالمومنینؑ کے مقابلہ میں تیغ بکف رہ چکا تھا جس نے حسنؑ کو زہر دغا کا نشانہ بنا دیا تھا جس کے ہاتھ سینکڑوں بیگناہوں کے خون سے رنگین ہو چکے تھے اور جو قتل و خونریزی کو ایک کھیل

سے زیادہ وقعت نہیں دیتا تھا۔ حسینؑ کے باب میں کانپتا نظر آ رہا ہے۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ علیؑ کے فرزند کو دعوت مبارزت دے سکے یا یزیدؔ کی جانشینی سے انکار کے سوال پر حسینؑ کے قتل کا حکم جاری کر سکے ـــــــ کیوں؟ ـــــــ صرف اس لیے کہ اب زمانہ بدل چکا تھا۔ معرکۂ صفین کو بیس سال بیت چکے تھے۔ اس بیس سال میں مسلمانوں کو کافی تجربے ہو چکے تھے۔ اموینت پر اسلام کے جو پردے ڈال رکھے گئے تھے وہ سب اٹھ چکے تھے حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ چکی تھی فریب کاروں کا طلسم ٹوٹ چکا تھا اور دنیا یہ سمجھ چکی تھی کہ ـــــــ بنی امیہ کیا چاہتے ہیں؟

اور

آلِ رسولؐ کیا چاہتی ہے؟

آل رسولؐ کے مقاصد کی ترویج و اشاعت کی جنگ جیتی جا چکی تھی اور جن حقیقتوں پر قریش اور بنی امیہ نے اپنی مفاد پرستی کی خاطر پردے ڈال رکھے تھے۔ وہ اس بیس سال کے عرصہ میں پورے طور پر عوام کے سامنے آ چکی تھیں۔ معاویہ کو اس چیز کا پورا احساس تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ خود امام حسین علیہ السلام سے ٹکرا لینا مناسب نہیں سمجھا بلکہ یزیدؔ کو بھی مشورہ دیا کہ حتی الوسع حسینؑ سے جنگ نہ کرنا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مسلم عوام کے دل آل رسولؐ کے ساتھ ہو چکے ہیں۔ اور ایسی حالت میں اگر جنگ ہوئی تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہو گا کہ اسلام دشمن قوتوں کا خاتمہ ہو جائے اور وہ اسلام پھر سے سربلند ہو جائے جسے مٹانے کی خاطر بنی امیہ کو اپنے کفر پر اسلام کا ملمع چڑھانا پڑا تھا۔

معاویہ کی جانب سے خوف اور کمزوری کا یہ مظاہرہ تحریک اسلامی کے

تیسرے قائد کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔

زمانہ نے ایک اور ورق الٹا۔ معاویہ کا انتقال ہو گیا یزید کو دمشق کا تخت و تاج حاصل ہو گیا افغانستان سے لے کر تیونس تک اور قسطنطنیہ سے لے کر یمن تک پھیلی ہوئی عظیم اسلامی سلطنت یزید کے ہاتھوں میں آ گئی لیکن یزید نے تخت پر بیٹھتے ہی یہ سمجھ لیا کہ اس کی سلطنت محکم نہیں ہے۔ اس کی بادشاہت کے قدم لرزاں ہیں اس کا قصر حکومت کانپ رہا ہے اس لیے کہ مدینہ کے ایک گوشہ میں آل رسولؐ کا جو بوریا نشین قائد موجود ہے اسے نسلی بادشاہت کا یہ فتنہ سخت ناپسند ہے یزید اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے باپ دادا کا مقصد اسلام کو فنا کر دینا تھا لیکن وہ اپنے اس مقصد میں محض اس لیے کامیاب نہیں ہو سکا کہ آل رسولؐ ان کی راہ میں مزاحم تھی۔ اور ان میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ آل رسولؐ کو ختم کر کے دنیا سے اسلام کے نقوش کو فنا کر ڈالتے۔ یزید جو ان تھا اور جوانی کے نشہ کو طاقت، سلطنت اور دولت کے نشہ نے دو آتشہ کر دیا تھا۔ شراب اور عیاشی نے عقل و خرد پر کچھ اور پردے ڈال دیے تھے۔ اس نے زمام حکومت سنبھالتے ہی یہ حکم صادر کر دیا کہ۔

"حسینؑ سے بیعت لی جائے اور اگر وہ بیعت نہ کریں تو ان کا سر گردن سے جدا کر دیا جائے"۔

یزید دمشق کے ایوان حکومت میں پلا بڑھا اور جوان ہوا تھا اسے آل رسولؐ کی طاقت یا ان کے کردار کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اسے صرف قیصری انداز کا علم تھا، امامت کے طریق کار کا کوئی علم نہیں تھا چنانچہ اس نے وہ کیا جو ایک قیصر کو کرنا چاہیے تھا۔ حسینؑ سمجھ گئے کہ وہ جس موقع کے منتظر تھے وہ آ گیا ہے چنانچہ انہوں نے قیصریت کے مقابلہ میں اسلامیت کے حربے سنبھال لئے اور اس

عظیم ٹکراؤ پر آمادہ ہو گئے جس پر اسلام کی حیاتِ نو کا انحصار تھا۔

جنگ کا آغاز مدینہ کی سرزمین سے ہوا۔

یزید لعین کے عامل ولید بن عقبہ نے امام سے بیعت کا مطالبہ کیا اور مروان بن حکم نے صاف صاف کہہ دیا کہ حسینؑ بیعت نہ کریں تو ان کا سر کاٹ لیا جائے"۔

یہ پہلا ٹکراؤ تھا جو حسینؑ اور یزید لعین کے مابین ہوا۔ حسینؑ جانتے تھے کہ مدینہ میں تلوار سنبھال لینے کا نتیجہ قبر رسولؐ کی اہانت اور علوم اسلامی کے خزانہ داروں کی موت کی شکل میں برآمد ہو گا' اس لیے آپ نے تلوار کی جنگ سے گریز کیا اور مدینہ سے رخت سفر باندھ لیا۔ یزید لعین کا عامل نہ آپ کو قتل کر سکا اور نہ گرفتار کر سکا یہ یزید لعین کی پہلی شکست تھی اور حسینؑ کی ایک عظیم کامیابی۔

یزید لعین نے جنگ کے لیے مدینہ کا انتخاب کیا تھا اس لیے کہ مدینہ میں قتل حسینؑ کے ساتھ ساتھ اسلام کا نقش آخریں فنا کر دینے کا بھی موقع تھا لیکن حسینؑ نے دشمن کو یہ موقع نہیں دیا بلکہ اسے مجبور کر دیا کہ وہ اس مقام پر حسینؑ سے جنگ کرے جو حسینؑ کے لیے بہتر ہے جو حسینؑ کے مقاصد کے لیے مفید ہے اور جس سرزمین پر جنگ کا نتیجہ یزیدیت کی موت' اموئیت کی شکست اور جزیرہ نمائے عرب میں کفرو نفاق کی قوتوں کی مکمل بربادی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

یزید لعین کے لیے جنگ کا بہترین میدان مدینہ تھا اور حسینؑ کے لیے ٹکراؤ کی بہترین جگہ کربلا' مدینہ وہ سرزمین تھی جہاں

۱۔ حضرت علی علیہ السلام کے مخالف مہاجرین قریش کی باقیات کافی تعداد میں موجود تھی جسے ظاہر ہے کہ امام حسین علیہ السلام سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔

۲۔ عوام اپنا کردار اور حرارت ایمانی اس درجہ کھو چکے تھے کہ واقعہ حرہ میں قبر رسولؐ کی اہانت کے بعد لوگوں نے یزید کی غلامی تک پر بیعت کرلی۔

۳۔ حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کے باوجود مدینہ والوں نے جنگ جمل اور جنگ صفین میں حضرت علیؑ کی بہت کم مدد کی تھی۔

۴۔ مدینہ میں امام حسین علیہ السلام قتل ہو جاتے تو مدینہ میں توابین یا مختارؒ کی سی کوئی تحریک شروع نہ ہوتی اور مدینہ والے اس شہادت پر بھی اسی طرح بے حسی کا مظاہرہ کرتے جس طرح امام حسن علیہ السلام کی شہادت پر کیا تھا۔

اس کے مقابلے میں عراق وہ سرزمین تھی جہاں

۱۔ آل رسولؐ کے موقف کو سمجھنے والے موجود تھے۔ چنانچہ شہدائے کربلا میں کوفہ کے حضرات کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔

۲۔ عراقیوں نے جمل اور صفین میں بڑے پر جوش طریقہ سے آل رسولؐ کا ساتھ دیا تھا۔

۳۔ عراقیوں میں حرارت ایمانی اور زندگی کے جوہر موجود تھے چنانچہ امامؑ کی قربانی کا جیسا اثر عراقیوں نے لیا ویسا کہیں نہیں لیا گیا۔ توابین اور مختار اسی سرزمین سے اٹھے اور بنی امیہ کا خاتمہ کرنے میں عراقیوں نے پُرجوش حصہ لیا۔

۴۔ عراق میں قربانی دینے میں یہ مصلحت بھی تھی کہ عراق اس وقت کے اسلامی عالم کے عین قلب میں واقع تھا اور یہاں سے واقعہ شہادت کی خبریں تمام اسلامی دنیا میں جلد پہنچ جانا یقینی تھیں۔

امام علیہ السلام نے مدینہ میں جنگ نہ کر کے اموی سیاست کو ایک بڑی

ذک دی جس کے اثرات عالم میں آشکار ہیں۔

امامؑ مدینہ سے نکل کر مکہ چلے گئے اور اس زمانہ میں گئے جب مکہ میں اطراف و اکناف عالم کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ دنیا بھر میں اپنے مقاصد کی اشاعت کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا؟ امامؑ نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور حجاج کے ذریعے عالم اسلام کو آنے والے واقعات سے باخبر کرنا شروع کر دیا یہاں بھی یزید لعین نے یہ چاہا کہ ٹکراؤ ہو جائے اور اموی لشکروں کو حرمت کعبہ برباد کرنے کا سبب قرار دے سکے چنانچہ تیس آدمی زائرین کعبہ کی صورت حج کے پردہ میں مکہ بھیجے گئے تاکہ وہ حسین علیہ السلام کا کام تمام کر دے۔

یزید لعین جانتا تھا کہ اس وقت حسینؑ کے ساتھ کئی ہزار آدمی موجود ہیں اس لیے اگر حسینؑ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تو مکہ میں غدر برپا ہو جائے گا اور یزیدی لشکر کو "بقائے امن" یا "بغاوت فرو کرنے" کے نام پر کعبہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا موقع مل جائے گا لیکن یہ اس کی بھول تھی کوئی اچھا جرنیل ایسی جگہ نہیں لڑتا جہاں اس کے مقاصد کو شکست ہو سکے۔ تحریک اسلامی کا قائد اعظم بھی ایسی غلطی کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔ حسینؑ کو جنگ کا دفاع کرنا تھا اسلام کے لیے اس لیے وہ ایک ایسی جنگ نہیں کر سکتے تھے جہاں جنگ کا نتیجہ اسلام کی بربادی کی شکل میں برآمد ہو سکتا تھا اس لیے امام نے حج کو عمرہ سے بدل کر مکہ کو چھوڑ دیا۔ حج کے لیے جمع ہونے والے لاکھوں مسلمان فرزند رسولؐ کو اس طرح مکہ چھوڑتے دیکھ کر حیران رہ گئے ہوں گے اور یقیناً ان کے دلوں اور دماغوں پر ایک ضرب سی لگی ہو گی انہوں نے سوچا ہو گا کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ اور جب ان کو یہ معلوم ہوا ہو گا کہ اموی خلافت حرم محترم کی عزت و عظمت لوٹنے پر آمادہ تھی تو ان کے دلوں میں جو جذبات پیدا ہوئے ہوں گے ان کا اندازہ کرنا مشکل

نہیں ہے۔

امیر معاویہ کا انتقال ۲۲ رجب کو ہوا تھا اور امامؑ نے ۲۸ رجب کو مدینہ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ امامؑ نے شعبان، رمضان، شوال اور ذیقعدہ کے پورے چار مہینے اور ذی الحجہ کا ایک ہفتہ مکہ میں گزارا۔ اس میں بظاہر مصلحت یہ تھی کہ یزید لعین کا کردار اسلامی دنیا پر پوری طرح روشن ہو جائے اور مسلمان اپنے حکمران کی جانب سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں چنانچہ یہ مقصد بھی پورا ہوا۔ یزید لعین کے حالات عام ہو گئے مسلمانوں میں بے چینی بڑھنے لگی اور عراقی مسلمانوں نے اپنی بے چینی کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں ہزاروں خطوط پہنچنا شروع ہو گئے جن میں یزید لعین سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے یہ درخواست کی جا رہی تھی کہ آپ عراق تشریف لا کر مسلمانوں کو اس غلامی سے نجات دلائیں جس میں وہ بنی امیہ کی بدولت مبتلا ہو گئے تھے۔

یزید لعین کے خلاف یہ بے چینی صرف عراق تک محدود نہیں تھی بلکہ بعد کے حالات یہ ثابت کرتے ہیں کہ پوری دنیائے اسلام میں اموی اقتدار کے خلاف بے چینی پیدا ہو گئی تھی جس سے سیاسی فائدہ اٹھاتے ہوئے عبداللہ بن زبیر نے ایک وسیع سلطنت قائم کر لی تھی۔

مکہ چھوڑ کر امام نے عراق کا رخ کیا تاکہ ایسے مقام پر یزید لعین سے ٹکراؤ ہو جو اس وقت کی مملکت اسلامی کے عین قلب میں واقع تھا اور افریقہ اور ایشیا کے مابین قافلوں کی سب سے بڑی گزرگاہ شمار کیا جاتا تھا عراق میں حسینی قربانی کا مقصد یہ تھا کہ یزید لعین اور اس کے ساتھی واقعات پر پردہ نہ ڈال سکیں بلکہ ایران، شام، فلسطین اور عرب کے گوشہ گوشہ میں حسینؑ کے مقاصد عام ہو جائیں یہ سرزمین

آل رسولؑ کے مقاصد جنگ کے اعتبار سے بہت اچھی اور مناسب تھی اور امویوں کے لئے جنگی اعتبار سے قطعاً تباہ کن یزید علیہ اس رمز کو نہیں سمجھ سکا اور وہ ایک ایسے علاقہ میں حسینؑ کا خون بہانے پر آمادہ ہو گیا جہاں اس جرم پر پردہ ڈالنا محال تھا جہاں سے حسینی قربانی کی اطلاع جنگل کی آگ کی طرح پھیل جانا یقینی تھی اور جہاں سے وہ شرارے بلند ہونے والے تھے جو اموی بادشاہت کے ساتھ ہی ساتھ اموی اصولوں کو بھی جلا کر خاکستر کر دینے والے تھے۔

امامؑ نے عراق کا رخ کرنے سے پہلے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کر دیا تھا تاکہ وہ عراقیوں کو امامؑ کی آمد امامؑ کے مقاصد اور آل رسولؑ کی تحریک سے پوری طرح باخبر کر دیں۔ کوفہ میں اٹھارہ ہزار مسلمانوں نے مسلم کی بیعت کی جو اس کا ثبوت ہے کہ مسلم عوام اموی حکومت سے زچ آ چکے تھے اور وہ ان کے دماغوں میں یہ خیال گردش کرنے لگا کہ اموی حکومت اس خلافت الٰہیہ سے بالکل الگ ایک چیز ہے جس کے قیام کا اسلام داعی ہے یہ صحیح ہے کہ بعد میں عبیداللہ بن زیاد کے خوف اور طمع دنیا میں مبتلا ہو کر کوفیوں نے مسلم کی بیعت توڑ دی اور ان کو ذبح کر ڈالا گیا لیکن یہ واقعہ کہ کوفیوں نے مسلم کی بیعت کی اس امر کا ثبوت ہے کہ آل رسولؑ کی تحریک دلوں میں گھر کر چکی تھی پیغام عام ہو چکا تھا اور اب ضرورت صرف اس امر کی رہ گئی تھی کہ ایک بڑی قربانی پیش کر کے اس احساس کو اعتقاد میں اور اعتقاد کو عمل میں تبدیل کر دیا جائے۔

کوفہ میں حسینؑ کے قاصد اور ابن زیاد کے مابین جو ٹکراؤ ہوا وہ بھی حق پرستی کی تاریخ میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے یہ صحیح ہے کہ مسلم شہید

ہو گئے لیکن ان کی گرفتاری کے لئے پے در پے تین دستوں کا روانہ کیا جانا اور ہر دستہ کا شکست کھانا شجاعت کی تاریخ کا ایک محیر العقول باب ہے۔

بہرحال اس جنگ کا ایک اہم نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ سارے عراق میں امام حسین علیہ السلام کی آمد اور آپ کے مقاصد کی اشاعت ہو گئی اور یزیدؔ کے لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ حسینی قربانی پر پردہ ڈال دے۔ اموی سیاست کے طریق کار کا اندازہ رکھنے والے اصحاب فہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ یزیدؔ کی کتنی بڑی شکست تھی۔

مسلم کی شہادت سے امامؑ کو دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ کوفہ کے سچے مسلمانوں کے دل لرز اٹھے اور ان کے خفتہ ضمیر بیدار ہو گئے چنانچہ میدان کربلا میں امامؑ کے ساتھیوں کی فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شہداء میں بڑی اکثریت کوفہ والوں کی تھی۔ بریرؓ بن خضیر، مسلم بن عوسجہ، حبیب بن مظاہرؓ سعید ابن عبداللہ، زہیر بن قین، حر بن یزید، عابس بن شبیب، غرض سید الشہداءؑ کے ممتاز ساتھیوں کی اکثریت کوفہ والوں پر مشتمل تھی۔

لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ امامؑ نے مکہ اور مدینہ پر کوفہ کو کیوں ترجیح دی؟ لیکن وہ یہ بھولتے ہیں کہ حسنؑ کی شہادت پر مکہ یا مدینہ میں ایک شخص بھی ایسا نہ نکلا جو اموی حکومت کے خلاف محض زبانی احتجاج بھی کر دیتا لیکن کوفہ وہ جگہ تھی جہاں مسلم کی شہادت نے یہ اثر کیا کہ امامؑ پر جان قربان کرنے کے لئے تقریباً پچاس آدمی میدان کرب و بلا میں پہنچ گئے اور پھر حسینؑ کی شہادت نے کوفہ پر یہ اثر کیا کہ "یا لثارات الحسینؑ" کی آوازیں اس وقت تک نہ دب سکیں جب تک کہ نہ صرف اموی حکومت کا بلکہ بنی امیہ کی نسل تک کا نام و نشان دنیا سے نہ مٹا دیا گیا تحریک اسلامی کے تیسرے قائد کی یہ انتہائی بالغ نظری تھی کہ وہ

یہ سمجھ رہا تھا کہ کوفہ ان مقاصد کے اعتبار سے بہترین جگہ ہے اور وہاں کے رہنے والوں میں اب بھی اتنی جرات اور زندگی موجود ہے کہ اگر ایک قربانی کے سہارے ان کی رگ دل میں نشتر چبھو دیا گیا تو وہ امویت کا خاتمہ کر دیں گے اس کے برعکس مکہ اور مدینہ کے لوگ اتنے مردہ ہو چکے ہیں کہ کعبہ کا پردہ جل اٹھے گا حرم محترم پر آتشباری ہو جائے گی قبر رسولؐ پر گھوڑے بندھ جائیں گے انصار کی عورتوں کی حرمت لٹ جائے گی لیکن مکہ اور مدینہ کے لوگ پھر بھی غیرت و حمیت کی چنگاریوں کو اپنے دلوں سے دور رکھیں گے اور ہر قسم کی ذلت برداشت کرنے کے باوجود اسلام کو دشمنوں کے پنجہ سے رہا کرانے کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کریں گے حضرت عائشہ کے چہیتے بھانجے حضرت ابوبکر کے حقیقی نواسے اور قرشی مفادات کے بہت بڑے علمبردار عبداللہ بن زبیر کا خود مکہ میں قتل بھی ان کے دلوں میں کوئی حرارت نہیں پیدا کر سکے گا ایسی حالت میں حسینؑ کو ان لوگوں سے کیا امید ہو سکتی تھی؟ جو قریش و انصار اس عبداللہ بن زبیر کے نہ ہوئے جو ان کو دوبارہ سلطنت اور دولت کا مالک بنا دینے کا دعوی کر رہا تھا وہ بیچارے حسینؑ کا ساتھ کیسے دیتے جو حکومت کو اللہ کے لئے اور دولت کو مساویانہ تقسیم کی شے قرار دیا کرتا تھا ایسی حالت میں یقیناً کوفہ امامؑ کے مقاصد کے اعتبار سے بہتر تھا اور یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنی قربانی کے لئے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں اس قربانی کا زبردست اثر ہونا اور اس اثر کے نتیجہ میں اموی اقتدار کے خاتمہ کی داغ بیل پڑ جانا یقینی تھا۔

امامؑ عراق کی سرحد میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے یزیدی فوجوں نے حر کی قیادت میں آپ کا راستہ روکا لیکن حر نہ تو آپ کو گرفتار کر سکا اور نہ ایک ایسی غیر معروف منزل پر آپ سے جنگ کر سکا جہاں جنگ کا مطلب آپ کے لئے

گمنامی کی موت ہو سکتا تھا مقصدی اعتبار سے یہ بھی یزیدؔ کی ایک بڑی شکست تھی اور اس ٹکراؤ میں بھی امامؑ کو فتح مبین حاصل ہوئی اس لئے کہ امامؑ برابر اپنی منزل کی جانب بڑھتے چلے گئے اور یزیدی لشکر آپ کو کوفہ سے قریب تر پہنچ جانے سے نہ روک سکا۔

اس سلسلہ میں امام کو ایک اور بڑی کامیابی یہ نصیب ہوئی کہ حر اور اس کے ساتھیوں کو امام کے کردار اور آپ کے بلند مقاصد کے مطالعہ کا پورا موقع حاصل ہوا اور جس کے نتیجے میں حر اتنا متاثر ہوا کہ جب وہ روز عاشور آپ پر قربان ہو گیا تو کم از کم اس کے لشکری اتنے متاثر ضرور ہوئے ہوں گے کہ بعد شہادت ان کے لبوں پر مہر لگانا حکومت کے لئے ناممکن ہو گیا ہو گا اور یہ دشمن کے سپاہی حسینی مقاصد کی اشاعت کا ایک بڑا ذریعہ بن گئے ہوں گے۔

امامؑ کربلا پہنچے تو آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ یہ سرزمین ساٹھ ہزار درہم میں خرید لی اب امامؑ سرزمین کربلا کے مالک تھے۔ شرعاً اور قانوناً اس سرزمین پر یزیدی فوجوں کی آمد ایک جارحانہ دراندازی کے علاوہ اور کچھ نہیں قرار دی جا سکتی اور یزیدؔ کی پوزیشن صاف صاف ایک ایسے حملہ آور کی ہو جاتی ہے جو ایک شخص کی زمین پر بحر تسلی رہے ہیں سے قبل وتمادت تمہیدت روبھیہ قانونی، اخلاقی اور شرعی ہر اعتبار سے اس سرزمین پر یزیدی فوجوں کا داخلہ ناجائز ہو جاتا ہے اور یزید کی حیثیت ایک مجرم کی ہو جاتی ہے وہ ایک ایسا غیر عادل انصاف ناشناس اور قانون شکن بادشاہ ثابت ہو جاتا ہے جسے خلیفہ کا لقب دینا خود لفظ خلافت کی تحقیر و توہین کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

امامؑ چاہتے تو عشرہ محرم کی ابتدائی تاریخوں میں ہی یزید سے جنگ کر سکتے تھے لیکن آپ جنگ کو ٹالتے رہے تاکہ یزیدی فوجوں کا زیادہ سے زیادہ اجتماع ہو

جائے چنانچہ نویں محرم تک کربلا کے میدان میں ۳۵ ہزار آدمیوں کا اجتماع ہو گیا۔ سیاسی اعتبار سے یہ چیز یزیدؔ کے لئے انتہائی مہلک ثابت ہوئی اس لئے کہ جس واقعہ کو ۳۵ ہزار آدمیوں نے دیکھا ہو اس پر پردہ ڈالنا یا آلِ رسول کو "ترک و دیلم کے باغی" قرار دینا اب قطعاً" ناممکن ہو گیا اور بنی امیہ کی یہ تدبیر ناکام ہو گئی کہ خاموشی سے آلِ رسولؐ کا خاتمہ کر دیا جائے۔

یزیدی لشکر نے نویں محرم کی شام کو جنگ چھیڑنا چاہی لیکن امامؑ نے عبادت کے لئے ایک رات کی مہلت لے لی۔ اس طرح گویا لشکرِ یزیدؔ کو اس پر مجبور کر دیا گیا کہ وہ حسینؑ اور یزیدؔ کے کردار دونوں کے مقاصد جنگ اور دونوں کے موقف پر غور کرے۔ جنگی نقطہ نظر سے یہ ایک بہت ہی اہم ضرب تھی جو یزیدؔ پر عائد کی گئی اس لئے کہ جس لشکر کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ حق کی خاطر نہیں لڑ رہا ہے اور ایسے لوگوں کے مقابلہ میں نبرد آزما ہے جو سرتا سر حق پر ہیں اس لشکر کا "نظم لاذما" بگڑ جاتا ہے اس کے سپاہیوں کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور اس میں کمزوری کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں یزیدی لشکر میں زیادہ تر کوفہ کے لوگ تھے جو حسینؑ کی شخصیت سے واقف تھے اور اب وہ اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے [illegible]

یہ کہ موت کو لبیک کہہ رہا ہے بلکہ موت پر اتنا مطمئن بھی ہے کہ اپنی تمنائے عبادت پوری کرنے کے لئے ایک رات کی مہلت طلب کر رہا ہے اس واقعہ نے یزیدی سپاہیوں پر جو اثر ڈالا ہو گا اور رات بھر خیام حسینی سے اٹھتی ہوئی تسبیح و تہلیل کی آوازوں نے دشمن سپاہیوں کے قلب پر جو تاثرات پیدا کئے ہوں گے ان کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے اور اس کے نتیجہ میں ان کے عزم و حرب پر جتنے خراب اثرات مرتب ہوئے ہوں گے نفسیاتی طور پر ان کے دلوں میں جو کمزوری

پیدا ہوئی ہو گی اس کا اندازہ کرنا بھی ہمارے لئے مشکل نہیں ہے

دسویں کی صبح کو امام نے صفوف لشکر آراستہ کرتے ہی بریر بن خضیر ہمدانی کو لشکر مخالف کی جانب بھیجا کہ وہ اسے سمجھائیں نفسیاتی اعتبار سے یہ بھی ایک کاری ضرب تھی جو یزیدیت پر عائد کی گئی اس لئے کہ بریر کوفہ کے ایک مشہور عالم تھے اور لشکر مخالف میں سینکڑوں ایسے افراد موجود تھے جنہوں نے بریر سے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی تھی۔ کوفہ کے سب سے بڑے عالم اور معلم قرآن کو سامنے دیکھ کر کوفی سپاہیوں کے دلوں کی جو کیفیت ہوئی ہو گی ان میں اپنے طریق کار کی غلطی کا جو احساس ابھرا ہو گا اور ان پر جو ندامت طاری ہوئی ہو گی اور پھر اس کے نتیجہ میں ان کے جذبہ جنگ میں جس حد تک کمی آئی ہو گی ان کے دلوں میں جو کمزوری پیدا ہوئی ہو گی اس کا اندازہ لگانا بھی ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔

صبح عاشور کے اس پہلے ٹکراؤ میں حسینؑ کی کامیابی ناقابل تردید ہے۔ بریر کی واپسی کے بعد خود امامؑ میدان میں برآمد ہوئے اور کوفیوں کو اپنی منزلت سے آگاہ کرنے کے بعد آپ نے ان کے سامنے وہ خطوط پیش فرمائے جو انھوں نے امامؑ کو کوفہ تشریف لانے کے متعلق روانہ کئے تھے۔ نفسیاتی اعتبار سے یہ بھی ایک غضب کا وار تھا اور اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ دشمن ندامت کا شکار ہو کر ہمت چھوڑ دے چنانچہ امامؑ اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے دشمن کا عزم جنگ اس کی جرات اور اس کی جنگ آزمائی کی قوتیں اتنی کمزور ہو گئیں کہ بہتر آدمیوں کی ایک مختصر سی جماعت ۳۵ ہزار کے لشکر کے مقابلہ میں دن بھر جنگ جاری رکھ سکی جب کہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ جنگ زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ میں ختم ہو جاتی اور یزیدی لشکر ایک ہی ریلے میں حسینی

جماعت کا خاتمہ کر دیتا۔

عاشور محرم کی جنگ حق پرستوں کی تاریخ میں ہمیشہ آب زر سے لکھی جائے گی اس لئے کہ تین دن کے بھوکے پیاسے مٹھی بھر انسانوں کا ایک لشکر عظیم سے دن بھر مردانہ وار مقابلہ اور دشمن کے کئی ہزار سپاہیوں کا قتل تاریخ شجاعت کا ایک ایسا محیر العقول کارنامہ ہے جس پر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔

عمر بن حجاج زبیدی کی سرکردگی میں یزید لعین کے دس ہزار سواروں نے امام کے میسرہ پر جو صرف تیس آدمیوں پر مشتمل تھا حملہ کیا۔ کہاں دس ہزار سوار اور کہاں تیس پیادے لیکن حبیب ابن مظاہر نے اس خوبصورتی سے اس ریلے کو روکا کہ دشمن کے سینکڑوں سپاہی مارے گئے اور بالآخر اسے پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ تاریخ اسے "حملہ اولیٰ" کے لقب سے یاد کرتی ہے اور اس میں یزیدی فوج کی شکست کا صاف صاف اعتراف کرتی ہے۔

ظہر کے وقت شمر کی سرکردگی میں یزید علیہم کے دس ہزار سپاہیوں نے پشت کی جانب سے خیام حسینیؑ پر حملہ کیا لیکن یزیدی فوج اس حملہ میں بھی ناکام رہی اور شمر کو کافی جانی نقصان اٹھانے کے بعد پسپائی کا رخ اختیار کرنا پڑا۔

نہر کے چار ہزار پاسبانوں کی حضرت عباسؑ کے مقابلے میں شکست تاریخ کی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔

حضرت علی اصغرؑ کی شہادت یزیدی فوج کی وہ اخلاقی ابدی شکست ہے جس پر پردہ ڈالا جانا قطعاً محال ہے۔ عمر سعد کے لشکر کا بے شیر کی تشنگی پر رو دینا اس امر کا ثبوت ہے کہ اس حسینی حربہ نے وحشیوں کے دلوں میں بھی سوئی ہوئی انسانیت کو تھوڑی دیر کے لئے جگا دیا تھا اور یزیدی لشکر کو ایک مرتبہ یہ احساس پیدا کرا دیا تھا کہ اس کی روش حق دشمنی اور انسانیت دشمنی پر مشتمل ہے۔

حضرت علی اصغرؑ کی شہادت کے بعد خود امام حسین علیہ السلام نے جنگ فرمائی اور اس قیامت کی جنگ فرمائی کہ لشکر یزیدی میں بھگدڑ مچ گئی مورخین اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ لشکر یزیدی کا نظم اس درجہ بگڑ چکا تھا کہ اس میں ایک یکہ و تنہا انسان کا مقابلہ کرنے کی قوت باقی نہیں رہی تھی اور امام نے اپنی مختصر سی جنگ میں تقریباً" دو ہزار یزیدی سپاہیوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ اس جنگ سے امامؑ کا مقصد محض یہ تھا کہ جہاد کا فریضہ پورا کر لیا جائے اور یہ ظاہر کر دیا جائے کہ حق پرست مردانہ وار جنگ سے کبھی منہ نہیں پھیرتے۔

چنانچہ یہ مقصد پورا ہو گیا تو آپ نے تلوار نیام میں رکھ لی جنگ بند کر دی اور اس مقصد عظیم کی تکمیل پر آمادہ ہو گئے جو یزیدیت کی شہ رگ کو ہمیشہ کے لئے کاٹ دینے والا تھا یعنی شہادت عظمیٰ!

امام علیہ السلام شہید ہو گئے لیکن یہ خیال کرنا غلط ہے کہ امامؑ کی شہادت کے ساتھ جنگ کا خاتمہ ہو گیا جنگ اب بھی جاری رہی بالکل اسی طرح جس طرح حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد جاری رہی یہ اور بات ہے کہ حق پرستوں کے لشکر کا سردار بدل گیا۔ حسینؑ بن علیؑ کی جگہ علیؑ ابن الحسینؑ سالار لشکر ہو گئے۔ یا جس طرح امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد امام حسن علیہ السلام نے جنگ کا انداز بدل دیا تھا اسی طرح امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد امام زین العابدین علیہ السلام نے انداز جنگ بدل دیا تیغ و سنان کی جگہ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں نے لے لی اور حبیب و زہیر و علی اکبرؑ کے بجائے زینبؑ و ام کلثوم و فاطمہ کبریٰ نے مورچے سنبھال لئے بہرحال انداز جنگ بدلا۔ جنگ ختم نہیں ہوئی اور اسی حقیقت کو نہ سمجھنے کے نتیجہ میں بعض کوتاہ فہم لوگ یہ فیصلہ دے دیا کرتے ہیں کہ معرکہ کربلا میں آل رسولؐ کو ظاہری طور پر شکست ہو

گئی واقعہ یہ ہے کہ ایک جنگ عظیم میں درجنوں چھوٹے بڑے معرکے ہوتے رہتے ہیں جن میں کبھی ایک فریق کا پلہ بھاری ہوتا ہے اور کبھی دوسرے فریق کا لیکن ان چھوٹے چھوٹے معرکوں کی اساس پر شکست یا فتح کا فیصلہ نہیں کیا جاتا شکست و فتح کا فیصلہ دراصل اختتام جنگ پر ہوتا ہے اگر عاشورہ کے روز جنگ ختم ہو گئی ہوتی تو ہم لازماً" یہ کہہ سکتے تھے کہ آل رسولؐ کو ظاہری شکست ہوئی لیکن چونکہ جنگ ختم نہیں ہوئی اس لئے امامؑ کی ظاہری شکست کا فیصلہ کر دینا حقیقت سے بعید اور کوتاہ فہمی کا مظاہرہ ہے معرکہ کرب و بلا دراصل مجاہدہ حق و باطل کا ایک معرکہ تھا جس میں بظاہر پلہ یزید کی جانب جھکا نظر آتا ہے لیکن محض اس معرکہ کو اصل جنگ تصور کر لینا غلط ہے ابھی جنگ جاری تھی اور میدان جہاد میں نہ سہی قید خانہ کی دیواروں میں لڑی جا رہی تھی اس لئے امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر فتح و شکست کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا اس فیصلہ کے لئے ہمیں اختتام جنگ کا انتظار کرنا پڑے گا۔

امام علیہ السلام کی شہادت کے بعد لشکر یزید لعین نے خانوادہ رسالت کی خواتین کو گرفتار کر لیا اور یہیں سے بنی امیہ کی شکست کا آغاز ہو گیا یہ لٹا ہوا قافلہ کوفہ پہنچا۔ ہم دربار کوفہ کے تفصیلی واقعات بیان نہیں کرنا چاہتے بلکہ صرف اس حقیقت کو سامنے لانا چاہتے ہیں کہ محض تین دن کے اندر اندر کوفہ کے حالات ایسے بدلے کہ عبید اللہ بن زیاد اہل حرم کو کوفہ سے دمشق روانہ کرنے پر مجبور ہو گیا اس لئے کہ اس نے یہ سمجھ لیا کہ اگر خانوادہ عصمت کی خواتین چند روز اور کوفہ میں رہ گئیں تو عراق میں زبردست بغاوت ہو جائے گی اور یہ بغاوت ایسی ہو گی جس پر قابو حاصل کرنا اموی حکومت کے لئے ناممکن ہو جائے گا عبید اللہ بن زیاد کے اس اقدام کو بظاہر ایک بڑی سیاسی دوربینی قرار دیا جائے گا لیکن

درحقیقت یہ اس کی انتہائی خوفناک غلطی تھی اس لئے کہ اس کے اس اقدام کے نتیجہ میں آل رسولؐ کو پہلی بار شام کی سرزمین پر قدم رکھنے اور شامیوں کے سامنے حقیقت اسلام اجاگر کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ امام حسین علیہ السلام اپنے ساتھ خواتین کو جس غرض سے لے گئے تھے وہ پوری ہو گئی اور شام کے جن دروازوں پر بنی امیہ نے پہرے بٹھا رکھے تھے وہ آل رسولؐ کے لئے پاٹوں پاٹ کھل گئے۔"

مقصدی اعتبار سے یہ بھی اموی سیاست کی ایک ہولناک شکست تھی۔

کوفہ سے دمشق تک کا راستہ ایک دریائے خون تھا جس سے یزیدی لشکر کو گزرنا پڑا۔ راستہ میں انیس مقامات پر یزیدی لشکر کو مقامی آبادیوں سے جنگ کرنا پڑی جس میں صرف ایک مقام پر یزیدی لشکر کامیاب ہوا اور اٹھارہ مقامات پر اسے شکست اور فرار کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ لڑائیاں چھوٹی چھوٹی سہی لیکن ان سے یہ ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ قتل حسینؑ کے نتیجے میں مسلمانوں کے سوتے ہوئے ضمیر بیدار ہو چکے تھے اور بنی امیہ کا طلسم ٹوٹتا جا رہا تھا۔ آل رسولؐ کو سیاسی پسپائی گمنامی اور تباہی کے غاروں میں دھکیل دینے کی سازش ناکام ہو چکی تھی اور اسلامی دنیا رفتہ رفتہ اس حقیقت کو سمجھنے لگی تھی کہ قریش کے مفاد پرستوں اور بنی امیہ کے منافقوں نے اسے سخت دھوکا دیا ہے اور آل رسولؐ یقیناً" اس سلوک کی مستحق نہیں تھی جو اس سے کیا گیا ہے۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ عراق کی یہ لڑائیاں ایک وقتی اشتعال کا نتیجہ تھیں اور ان کو کوئی اصولی حیثیت نہیں دی جا سکتی لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی انکار محال ہے کہ آل رسولؐ کی حمایت میں اس جذباتی مظاہرہ کا صرف ایک ہی نتیجہ ہو سکتا تھا اور وہ یہ کہ مسلم عوام آل رسولؐ کی تحریک اور اس کے

موقف پر غور کریں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ آخر وہ کیا حالات تھے جن میں آل رسولؐ کو اتنی عظیم قربانی پیش کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اسلامی دنیا میں وہ کون سی دور رس اصولی تبدیلیاں وجود میں آ رہی تھیں جن کو روکنے کے لئے کربلا کا ہولناک سانحہ وجود پذیر ہوا؟ رسولؐ کے انتقال کے پچاس سال کے اندر اندر یہ کیسے حالات ہو گئے جن میں رسولؐ زادیاں قید و بند کے مصائب جھیل رہی ہیں؟ یہ یزید کون ہے جس کے ہاتھوں پیغمبر اسلامؐ کی اتنی کھلی ہوئی توہین ظہور میں آ رہی ہے؟ یزیدؑ کے منصب خلافت پر آنے کی وجہ کیا ہو سکتی تھی؟ اگر اسے خلافت محض وراثت پدری کے طور پر حاصل ہوئی ہے تو اسلام میں اس نسلی بادشاہت کا جواز کیسے پیدا کر لیا گیا؟ اگر نسلی بادشاہت کا اسلام میں امکان تھا تو حضرت ابوبکر کے بعد ان کے بیٹے محمد یا عبدالرحمن کیوں خلیفہ نہیں بنائے گئے؟ یا حضرت عمر کے بعد عبداللہ بن عمر کو منصب کیوں نہ حاصل ہوا؟ اگر نسلی بادشاہت کا اسلام میں کوئی وجود نہیں تو امیر معاویہ نے باوجود شرف صحابیت و عدالت یہ بدعت کیوں جاری فرمائی؟ اور پھر ذہن یہیں جا کر نہیں رک سکتے تھے بلکہ دماغوں میں یہ خیالات پیدا ہونا بھی ناگزیر تھے کہ امیر معاویہ کون تھے؟ تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں ان کا کردار کیا تھا؟ بدر و احد کے میدانوں میں وہ کس فریق کے ساتھ تھے؟ ان کے خاندان کی اسلامی خدمات کیا تھیں؟ ان کو خلافت کا استحقاق کس طرح حاصل ہو گیا اگر وہ محض بزور شمشیر بلا کسی حق کے خلیفہ بن بیٹھے تو کیا یہ بات اصولاً صحیح ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس جس کو سازش فریب کاری خونریزی اور قتل و غارت میں ملکہ حاصل ہو وہ نہ صرف یہ کہ خلیفہ رسولؐ بن سکتا ہے بلکہ اس کی خلافت کو دینی جواز بھی حاصل ہو سکتا ہے اور پھر سوال یہ ہی ہے کہ اس قسم کے آدمی کو اتنی طاقت حاصل کر لینے کا موقع کیسے حاصل ہو

گیا اور اگر اسے یہ موقع اس لئے حاصل ہو گیا کہ اسے حضرت خلیفہ ثانی نے مملکت شام سپرد کر دی تھی تو کیا یہ خلافت مآب کی انتہائی تباہ کن غلطی نہیں تھی کہ انہوں نے ایک ایسے شخص کو شام کا گورنر بنا دیا جس نے اول تو خلافت میں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا قانون نافذ کر دیا اور دوسرے[۱۲۳] نسلی بادشاہت کی داغ بیل ڈال دی؟

ممکن ہے کہ بعض آدمیوں نے اس کے بعد یہ بھی سوچا ہو کہ جس صاحب نے امیر معاویہ کے سے آدمی کو اتنی بڑی طاقت کا مالک بننے کا موقع دے دیا وہ خود کس آئین و اصول کے ماتحت خلیفہ بن گئے تھے اگر وہ نامزدگی کے نتیجہ میں خلیفہ مقرر ہوئے تھے تو ایک ایسے شخص کو جس نے معاویہ کے سے سازشی اور قاتل فرزند رسولؐ کو حصول خلافت کا موقع عنایت کر دیا۔ مسند خلافت پر بٹھا دینے کی غلطی کس سے صادر ہوئی تھی؟ اگر یہ غلطی ان کے پیش رو بزرگ سے ہوئی تھی تو ایک ایسے شخص کو دنیائے اسلام کی قیادت کیوں دے دی گئی جو اپنا جانشین مقرر کرنے میں اتنی بڑی غلطی اور ایسی غیر محتاط روش کا مرتکب ہوا؟ اور یہاں سے ذہنوں کا دھارا یقینی طور پر قریش کی سازش کی جانب مڑا ہو گا سقیفہ بنی ساعدہ کے انتخاب اور اس کے اصول معرض بحث میں آئے ہوں گے اور اس طرح لوگوں کے لئے گزشتہ حالات کی تحقیق و تنقید اور اسلامی سیاست کے پس منظر پر بحث و نظر کے دروازے کھل گئے ہوں گے اور یہی آل رسولؐ کی بہت بڑی کامیابی ہے۔

یہ صرف قیاسی بات نہیں ہے بلکہ واقعہ کربلا کے اسباب پر اس وقت سے لے کر آج تک جب بھی بحث کی جاتی ہے تو ذہنوں میں ہمیشہ یہی سوالات ابھرا کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں ہم یہ عرض کرنے میں حق بجانب ہیں کہ کوفہ سے

دمشق تک آلِ رسولؐ کی تشہیر نے لازمی طور پر لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیالات پیدا کئے ہوں گے۔ چنانچہ اس اندازِ فکر ہی کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ عبداللہ بن زبیر کو قریش کی پوری حمایت حاصل ہونے کے باوجود حصولِ حکومت میں ناکامی ہوئی اور آلِ رسولؐ کربلا میں پامالی اور قتل و غارت گری کا شکار ہونے کے باوجود مسلمانوں کے ذہنوں پر اتنی حاوی ہو گئی کہ بنی عباس نے اس کا نام لے کر بنی امیہ کا وجود تک صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور مسلم عوام میں عام طور پر یہ احساس بیدار ہو گیا کہ خلافت آلِ رسولؐ کا حق تھا جس حق سے انہیں سازشوں کے ذریعے محروم کر دیا گیا تھا۔

عبداللہ بن زبیر نے یہ سمجھا تھا کہ لوگوں میں صرف یزیدؔ کی مخالفت عام ہوئی ہے یا زیادہ سے زیادہ مسلم عوام بنی امیہ سے برہم ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ لازماً دوبارہ قریش کے اس مفاد پرست طبقہ کو برسرِ اقتدار لانے میں مدد دیں گے جس کو بنی امیہ نے حصولِ اقتدار کے بعد دودھ کی مکھی کی طرح نکال کے پھینک دیا تھا لیکن یہ ان کی بھول تھی قتلِ حسینؑ سے لوگوں کے دلوں کو جو زبردست دھچکا لگا تھا ان کے دماغوں پر جو شدید جھٹکے پڑے تھے ان کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ لوگ بنی امیہ کے مخالف ہو گئے تھے بلکہ قریش کا طلسمِ سیادت بھی ٹوٹ کر تار تار ہو چکا تھا لوگ یہ سمجھ گئے تھے کہ یزیدؔ کے ہاتھوں فرزندِ رسولؐ کا قتل اور رسولؐ زادیوں کی تشہیر صرف ایک فردِ واحد کی ذاتی غلطی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ نتیجہ ہے گزشتہ پچاس سال کی سیاست کا قریش کی اس حرصِ اقتدار کا جس نے آلِ رسولؐ کو مسلمانوں کی قیادت کے الٰہی حق سے محروم کرا دیا تھا قریش کی اس سیاسی غلطی کا کہ انہوں نے بنی امیہ کو شام کی گورنری تفویض کر دی تھی اور اس غلط سیاسی و معاشی نظام کا جو قریش کے حکمرانوں نے اسلامی دنیا پر نافذ کیا

تھا۔

امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے نتیجہ میں صرف بنی امیہ کے "استحقاق خلافت" کا خاتمہ نہیں ہوا قریش کے "استحقاق حکومت" کا طلسم بھی پاش پاش ہو گیا اور مسلم عوام نے یہ سمجھ لیا کہ مسند خلافت اگر شراب خور یزید کے لئے نہیں تو خانہ کعبہ میں اعتکاف کا ڈھونگ رچانے والے عبداللہ بن زبیر کے لئے بھی نہیں ہے۔

اس مسند کے اہل آل رسولؐ ہیں اور یہ منصب صرف انہیں کو زیب دیتا ہے چنانچہ شہادت حسینؑ کے بعد کوئی مدعی خلافت' صحابیت' تابعیت یا قرشیت کی اساس پر خلافت کا دعوی نہیں کر سکا بلکہ خلافت کا مطالبہ اگر کیا گیا تو یا آل رسولؐ کا نام پر جیسے بنی عباس یا مصر کے بنی فاطمہ کا مطالبہ اور یا پھر "جس کی لاٹھی اور اس کی بھینس" کے اصول کی بنیاد پر جیسا کہ آل عثمان کی خلافت جو سر تا سر

"ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند"

کی اساس پر وجود میں آئی تھی۔

بہر حال راستہ کٹا اور لشکر یزید دمشق میں داخل ہوا یزید خوش تھا کہ اس نے آل رسولؐ کو قتل اور قید کر کے اسلام کے خاتمہ کا بندوبست کر دیا ہے اور تحریک اسلامی کا چوتھا قائد حسینؑ کا جانشین مسرور تھا کہ شامیوں کے دلوں کو مسلمان بنانے کی جو تمنا علیؑ' حسنؑ اور حسینؑ کے دلوں میں مستور رہی وہ اس کے ہاتھوں پوری ہو رہی ہے۔

قافلہ بڑھتا رہا اور اس کے ساتھ ہجوم میں اضافہ ہوتا گیا۔ خلیفہ ثانی کے دور کی نسل جسے جبراً" مسلمان بنا لیا گیا تھا جو بظاہر مسلمان اور بباطن عیسائی تھی۔

چالیس سال بیت جانے کی وجہ سے تقریباً ختم ہو چکی تھی اب اس مجمع میں وہ لوگ تھے جو اپنی پیدائش کے وقت سے یہ سنتے رہے تھے کہ وہ "مسلمان" ہیں لیکن اسلام کیا ہے؟ اس سے قطعاً بے خبر تھے۔ ان کو صرف "معاویہ شاہی اسلام" کی خبر تھی۔ "آل رسولؐ کے اسلام" کا کوئی علم نہیں تھا۔ پیغمبر اسلامؐ کا انھوں نے نام ضرور سنا تھا لیکن آنکھیں کھول کر دیکھا صرف معاویہ اور یزید کو تھا اور انھیں کو وہ اسلام کا مظہر تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اسلام اللہ کی اطاعت اور باری تعالیٰ کی محبت کا نام نہیں تھا۔ یزید اور اس کے خاندان کی اطاعت و محبت اسلام تھی۔ اس مجمع نے پہلی بار ایک ایسے بیمار اور چند ایسی قیدی عورتوں کو دیکھا جن کے متعلق اسے معلوم ہوا کہ یہ پیغمبر اسلامؐ کی ذریت ہیں۔ یہ اس کے لئے انتہائی حیرت انگیز تھی سکتہ میں ڈال دینے والی تھی ایسی چیز تھی جس کا ایسے وہم و گمان بھی نہ تھا لوگوں کے دلوں پر ایک جھٹکا سا لگا وہ ششدر سے رہ گئے۔ ان کے ذہن تھوڑی دیر کے لئے ماؤف ہو گئے ان کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو گئیں ——— آخر یہ کیا؟ جس رسولؐ کا ان کو کلمہ پڑھوایا گیا ان کا فرزند زنجیروں میں جکڑا ہوا ——— اس کی بیٹیاں رسن بستہ اور اس کے جگر پاروں کے سر نوک نیزہ پر! آخر کیوں؟ نسل رسولؐ اور جانشین رسولؐ میں جنگ کیوں؟ خلیفہ وقت کے ہاتھوں خانوادہ رسالت کی تباہی آخر کس لئے؟

اور اگر رسولؐ کے مسند نشین یزید اور رسولؐ کی آل میں ایک خونی ٹکراؤ ظہور میں آیا تو اس میں خطا کس فریق کی ہے؟ کون حق پر ہے اور کون غلط کار؟ کون ظالم ہے اور کون مظلوم؟

ناممکن ہے کہ اس قسم کے خیالات شامیوں کے دلوں میں پیدا نہ ہوئے ہوں اور آل رسولؐ نے اس نفسیاتی صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا اس کے

محترم ارکان نے اس مجمع کو حقیقت حال سے آشنا کیا اور سید سجادؑ سیدہ زینب اور سیدہ ام کلثوم نے اس مجمع کے سامنے وہ دل ہلا دینے والی تقریریں کیں جن سے دمشق کے در و بام کانپ اٹھے یہ صحیح ہے کہ یزیدی سپاہیوں نے ان کو زیادہ بولنے کا موقع نہیں دیا لیکن نفسیات کے ماہرین یہ جانتے ہیں کہ ایسے پرہول مقام پر زیادہ بولنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ ابھرے ہوئے جذبات پر چند موثر الفاظ ہی وہ کام کر دکھاتے ہیں جو دوسرے مقامات پر لمبی لمبی تقریروں سے نہیں لیا جا سکتا آل رسولؐ کے محترم ارکان کی زبانوں سے نکلے ہوئے چند الفاظ نے شامیوں کو سوچ میں ڈال دیا۔ ان کو فکر کی ایک نئی راہ دکھا دی۔ آپس میں بات چیت کا ایک نیا موضوع دے دیا تاکہ جب وہ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوں تو گھروں میں بازاروں میں ہر جگہ صرف اسی موضوع پر بات چیت کریں کہ

"پیغمبرؐ کی اولاد ذبح کر ڈالی گئی" بقیہ
السیف ہمارے شہر میں قیدی کی حیثیت
سے لائی گئی ہے"۔

ظاہر ہے کہ دمشقیوں نے پہلی بار آل رسولؐ کو دیکھا تھا اور بالکل غیر معمولی حالات میں دیکھا تھا اس لئے یہ لازمی چیز ہے کہ دمشق کے گھر گھر میں یہ موضوع زیر بحث آیا ہو گا لوگوں نے یزیدؔ اور حسینؑ کی جنگ کے اسباب پر گفتگو کی ہو گی دونوں کے کردار کا تقابل کیا ہو گا۔ اسلام اور بانی اسلام سے دونوں کے رشتہ و تعلق پر تبادلہ خیال کیا ہو گا آل رسولؐ سے یزیدؔ اور معاویہ کے تعلقات زیر بحث آئے ہوں گے اور ان سب کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا وہ کسی سے پوسیدہ نہیں ہے۔ آل رسولؐ کی جیت ہمیشہ اسی چیز میں رہی ہے کہ لوگوں میں فکر کا جذبہ ابھر آئے اس لئے کہ جب بھی لوگ معاملات کی تحقیق کریں گے چھان بین کریں گے

اور تعصبات سے ہٹ کر آزادانہ فکر کریں گے تو حق کے چہرے پر پڑی ہوئی نقابیں لازما" الٹ جائیں گی آفتاب حقیقت پر چھائی ہوئی بدلیاں یقینی طور پر چھٹ جائیں گی اور اسی میں سچائی کی فتح تھی۔

دارالخلافہ میں یزید لعین کی یہ پہلی شکست تھی۔

دربار میں جو کچھ ہوا وہ تاریخ کے دامن میں آج تک محفوظ ہے یزید لعین نے قیدیوں سے سخت گفتگو کی تاکہ اہلیان دربار پر اس کی شوکت طاقت اور دبدبہ ظاہر ہو۔ لیکن آل رسولؐ کی جانب سے اس کو جو جوابات دیئے گئے وہ ایسے تھے کہ حاضرین پر سناٹا چھا گیا۔ خود یزید لعین کو اپنے پیروں تلے سے زمین کھسکتی معلوم ہوئی۔ طاقت کے ساتھ ہی شراب کا نشہ بھی ہرن ہو گیا اور یزید لعین کو اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لئے آل رسولؐ کو قید خانہ میں بھیج دینا پڑا۔

دربار میں سینکڑوں آدمی موجود تھے اس لئے یہ لازمی امر ہے کہ دربار کے واقعات بھی شہر میں مشہور ہوئے ہوں گے اور مشہور ہونا بھی چاہئے تھے اس لئے کہ یہ قیدی کوئی معمولی لوگ نہیں تھے یہ وہ آل رسولؐ تھی جس کا ذکر دمشقیوں نے ہمیشہ سنا تھا لیکن جسے دیکھنے کا شرف اور پھر قطعا" غیر معمولی اور حیران کن حالات میں دیکھنے کا موقع ان کو زندگی میں پہلی مرتبہ نصیب ہوا تھا ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں یقینا" لوگوں کو فکر اور تشویش ہو گی لوگ واقعہ کا اوئی سے اوئی جزو معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہوں گے۔ دربار سے پلٹنے والوں سے ایک ایک بات مکرر" سہ کرر پوچھی گئی ہو گی اور پھر اس پر آپس میں گفتگو کے سلسلے چھڑے ہوں گے۔ ہماری تاریخیں اس باب میں خاموش ہیں اس لئے کہ تاریخیں صرف سلاطین و ملوک کی داستان بیان کرتی ہیں عوام کی کیفیات جمہور کے افکار اور ۔ یاتی اثرات و عوامل سے بحث نہیں کرتیں تاریخ کی اس کمی کو پورا کرنا ہمارا

فرض ہے اس لئے کہ نفسیاتی عوامل اور عوام کی ذہنی و فکری کیفیات کو سامنے رکھے بغیر تاریخ کی رفتار اور واقعات کی نوعیت کو سمجھنا ناممکن ہوتا ہے دمشق کی جس کیفیت کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ اس قسم کی حالات میں نفسیاتی اعتبار سے بالکل درست ہے اور شامی عوام کے ان افکار اور اس نئے رجحان کا اموی سیاست پر جو اثر پڑنا چاہیے وہ اظہر من الشمس ہے۔

آل رسولؐ کی دربار میں بار بار طلبی یزیدی سیاست کی ایک اور بڑی شکست تھی یزید کا خیال تھا کہ اس طرح عوام پر اس کی سطوت شاہانہ اس کی قوت و جبروت اس کے قہر و اقتدار اور اس کے غلبہ و جلال کا اثر قائم ہو جائے گا لیکن نفسیاتی اور سیاسی نقطہ نظر سے اس کا یہ اقدام اس کے لئے تباہ کن تھا آل رسولؐ کو عوام کی ہمدردیاں حاصل ہوتی جا رہی تھیں عوام میں یزید^{لعنہ} کی غلط کاری کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا اور وہ شام جسے آل رسولؐ سے بے خبر رکھنے پر معاویہ نے اپنی ساری قوتیں مرکوز کر دی تھیں یزید^{لعنہ} کی اس غلطی کے نتیجہ میں آل رسولؐ کے تذکار مبارکہ سے گونجنے لگا تھا دربار اور زندان خانہ کے درمیان جو خاموش معرکہ جاری تھی اس میں روز بروز سید سجادؑ کا پلہ بھاری ہوتا جا رہا تھا۔

امام زین العابدینؑ کو بھی اپنی اس کامیابی کا پورا احساس تھا چنانچہ آپ نے بھی رفتہ رفتہ اپنے انداز میں تبدیلی کرنا شروع کی۔ پہلے آپ دربار میں آتے تھے تو ایک مجبور اور بے بس قیدی کی طرح لیکن جب آپ نے یہ دیکھا لیا کہ اب شامی عوام میں آل رسولؐ کی ہمدردی کا جذبہ بڑھتا جا رہا ہے تو آپ نے یہ انداز تبدیل کرنا شروع کر دیا اور یزید^{لعنہ} پر دباؤ ڈالنے کی روش اختیار کی پہلے آپ کا رخ بالکل دفاعی ہوتا تھا اب آپ نے یزید^{لعنہ} کو دفاعی رخ اختیار کرنے پر مجبور کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ جامع مسجد دمشق میں آپ نے

اشھد ان محمد رسول اللہ

کی آواز پر یزیدؑ سے جو سوالات کیے وہ آپ کے اس بدلے ہوئے انداز کا کھلا ہوا ثبوت ہیں اور اس موقع پر یزیدؑ کی یہ پسپائی اور مجبوری قابل دید ہے کہ وہ اپ کو مسجد جامع میں خطبہ کہنے کی اجازت دے دیتا ہے لیکن جب یہ دیکھتا ہے کہ بازی الٹی جا رہی ہے تو مجبوراً" اقامت کا حکم دے کر اس تقریر کو جو ایک بے بس قیدی کے انداز میں نہیں ایک فاتح کے انداز میں کی جا رہی تھی ختم کرا دیتا ہے اس تقریر کا انداز دیکھئے اس کے تیور دیکھئے اس کی رجز خوانی ملاحظہ فرمایئے اور پھر سوچئے کہ کیا کوئی مجبور اور بے بس قیدی اپنی شان میں ایسی باتیں کہنے کی جرات کر سکتا ہے؟ کیا کسی شکست خوردہ اور پامال انسان کی یہ مجال ہو سکتی ہے کہ وہ فاتحین کی موجودگی میں اس انداز سے اپنی بڑائی بیان کرے؟ اور کیا کوئی مغلوب، مقہور اور مفتوح فریق بھرے مجمع میں وہ الفاظ اپنی زبان پر لا سکتا ہے جو سید سجادؑ کی زبان سے ادا ہو رہے تھے؟ یہ بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ حالات بدل چکے تھے عوام میں آل رسولؐ کی حمایت بڑھتی جا رہی تھی اور یزیدؑ کی عارضی کامیابی شکست میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

زمانے نے ایک اور کروٹ بدلی اور اب دنیا نے دیکھا کہ یزید اپنے منہ پر طمانچے مار رہا ہے اور اس کی زبان سے مالی ولقتل الحسین کے ندامت خیز الفاظ جاری ہو رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ ندامت کس قسم کی تھی؟ کیا یزیدؑ کو قتل حسینؑ کے "مذہبی" جرم کا احساس ہو گیا تھا؟ کیا اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ آل رسولؐ لائق احترام تھی اور اس نے ان کی تذلیل کر کے ایک گناہ کبیرہ انجام دیا ہے؟

نہیں! ———— بالکل نہیں!!

یزید نہ جنت و نار کا قائل تھا نہ نبوت و رسالت کا ماننے والا تھا جس کا ثبوت آج بھی اس کے اقوال سے ملتا ہے ایسی حالت میں اس کو "گناہ" کا احساس پیدا ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا گناہ و ثواب' جزا و سزا' انعام و عتاب کا سوال اس شخص کے لئے پیدا ہوتا ہے جو دین پر ایمان رکھتا ہے' جو رسول اللہ پر ایمان رکھتا ہے جو قرآن پر ایمان رکھتا ہے لیکن جو شخص یہ کہتا ہو کہ

"نہ کوئی وحی آئی نہ کوئی پیغام' بلکہ یہ سب ایک ڈھونگ تھا جو بنی ہاشم نے حصول سلطنت کے لئے رچایا تھا"۔

یا

"پی! اے محبوبہ طناز پی!! اگر مذہب اسلام میں پینا ممنوع ہے تو دین مسیحی پر پی! اس لئے کہ اس دنیا کے بعد کوئی زندگی نہیں' جنت اور دوزخ سب ڈھکوسلہ ہیں"۔

اسے قتل حسینؑ کو "گناہ" تصور کرتے ہوئے اس پر نادم ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی؟

دراصل یزید کو ندامت اپنی "سیاسی شکست" پر تھی اس لئے کہ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ حسینؑ کے قتل اور آل رسولؐ کی گرفتاری سے اس کی جو غرض تھی وہ ناکام ہو چکی ہے وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ جس اسلام کو وہ مٹا دینا چاہتا تھا اس کی جڑیں خود شام میں مضبوط ہوتی جا رہی ہیں اسے یہ احساس پیدا ہو چکا تھا کہ جو شامی پہلے سو فیصدی بنی امیہ کے حامی تھی اب آل رسولؐ کی طرف دار ہوتے جا رہے ہیں اور جس مملکت کے استحکام کے لئے اس نے آل رسولؐ کو قتل کر ڈالا

اس مملکت کی بنیادیں اس قتل کے نتیجہ میں ہل گئی ہیں بادشاہ کی حیثیت سے اسے مملکت کے ہر حصہ کی خبریں پہنچتی تھیں ایسی حالت میں وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ قتل حسینؑ نے عراق کو برہم کر دیا ہے حجاز میں آگ بھڑکا دی ہے ایران اور یمن میں نفرت پھیلا دی ہے اور خود شام میں عوام کے تیور بدل چکے ہیں رعایا میں بغاوت کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ بنی امیہ کا سارا وقار جسے جھوٹی حدیثوں کے سہارے قائم کیا گیا تھا ایک بڑے جھٹکے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ خود اس کا نام لوگوں کے لئے گالی بن گیا ہے نسل ابوسفیان نفرت و حقارت کا مرکز بن گئی ہے اور جس آل رسولؐ کو مٹانے کی مہم میں قریش کے مفاد پرستوں اور بنی امیہ کے منافقوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا وہ عوام کی نگاہوں محبتوں اور عقیدتوں کا مرکز بن گئی ہے اور یہ سب قتل حسینؑ کی بدولت ——— اس لئے یزیدؑ کو حسینؑ کے قتل پر ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ مذہبی اساس پر نہیں خالص سیاسی مصالح کی بنیاد پر

یزیدؑ کو حسینؑ کی مذہبی حیثیت کا احساس ہو جاتا اور وہ اپنے "گناہ" پر نادم ہوتا تو خانہ کعبہ پر آتش بازی نہ کرتا مسجد نبوی میں گھوڑے نہ بندھواتا اور ان مقدس شہروں میں خون کی ندیاں نہ بہائی جاتیں ان واقعات کا ظہور بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ یزیدؑ میں کوئی مذہبی احساس نہیں تھا اور آل رسولؐ کی تاراجی پر اس کا ماتم اس لئے نہیں تھا کہ دوزخ کا خوف ستا رہا تھا' یا رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عتاب کا خوف اس کے دل پر غالب ہو گیا تھا' واقعہ بس اتنا تھا کہ یزیدؑ کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ قتل حسینؑ کے نتیجہ میں اسلام مٹنے کے بجائے اور زیادہ مضبوط ہو گیا ہے آل رسولؐ کے اثرات ختم ہونے کے بجائے ہزاروں گنا بڑھ گئے ہیں اور اموی سیاست معرکہ کربلا کے نتیجہ میں ذلت آمیز

طریقہ پر ناکام ہو گئی ہے۔

آل رسولؐ ایک سال شام میں رہی اور سال بھر میں حالات اتنے بدل گئے کہ یزید لعین کو اپنا تخت حکومت لرزتا نظر آنے لگا اب اس کے سامنے صرف ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ آل رسولؐ سے صلح اور دوستی کا ڈھونگ رچا کر معاملہ کو رفع دفع کر دیا جائے اس کا خیال تھا کہ آل رسولؐ ایک سال کی مسلسل اسیری اور تکالیف کے نتیجے میں اتنی پریشان ہو چکی ہو گی کہ مژدہ رہائی سنتے ہی شاد شاد ہو جائے گی اور یزید لعین سے "صلح" کو غنیمت شمار کرتے ہوئے فیصلہ کن طریقہ پر لڑائی ختم کر دے گی جس طرح میدان صفین میں ختم ہو گئی تھی۔

یزید لعین کی جانب سے رہائی کی پیشکش دراصل ویسی ہی چال تھی جیسی کی میدان صفین میں نیزوں پر قرآن بلند کر کے عمرو عاص نے چلی تھی اور جس کے نتیجے میں امیرالمومنینؑ کی جیتی ہوئی لڑائی غیر فیصلہ کن طریقہ پر ختم ہو گئی تھی ——— لیکن یزید لعین اس حقیقت کو بھول رہا تھا کہ زمانہ بدل چکا ہے اب صفین کا میدان نہیں ہے اور اس مرتبہ آل رسولؐ کے ساتھ وہ ضعیف الاعتقاد لوگ نہیں ہیں جو عمرو عاص کی چال میں پھنس کر امام زمانہ کی مخالفت پر تیار ہو گئے تھے اب آل رسولؐ فیصلہ کن جنگ لڑ رہی ہے اور علیؑ ابن الحسینؑ بظاہر بیمار کمزور اور ستم رسیدہ اتنے کمزور قلب و دماغ کے مالک نہیں ہیں کہ محض رہائی کی خاطر ایک جیتی ہوئی جنگ کو غیر فیصلہ کن نتیجہ پر ختم کر دیں اور بنو امیہ کو یہ موقع دے دیں کہ وہ دوبارہ اپنے اکھڑے ہوئے قدم جما لیں اپنی شکست پر پردہ ڈال دیں اور معاملات پر لیپ پوت کر کے اپنا کھویا ہوا وقار چند دن میں دوبارہ بحال کر لیں یزید لعین نے امام زین العابدین علیہ السلام کے متعلق جو اندازے قائم کئے تھے وہ غلط ثابت ہوئے خون بہا کی پیش کش حقارت کے ساتھ ٹھکرا دی گئی اور

امامؑ نے صاف الفاظ میں یزیدؔ کو مطلع کر دیا کہ اب آل رسولؐ مکمل اور واضح فتح کے حصول سے کم پر راضی نہیں ہو سکتی۔ یزیدؔ نے چاہا تھا کہ خون بہا پر معاملہ ٹل جائے لیکن سید سجادؑ نے یہ مطالبہ کر دیا کہ ہم دمشق میں اپنے شہداء کا ماتم کریں گے جس کا ہمیں موقع دیا جائے۔

بظاہر یہ بڑا معصومانہ اور بے حد مظلومانہ مطالبہ تھا لیکن درحقیقت یہ حکمت ربانی کے چوتھے امین کی سیاست الٰہیہ کا شاہکار تھا یزیدؔ کے شاہی محل میں حسینؑ کا ماتم نہیں ہو رہا تھا آل رسولؐ کی فتح مبین کا اعلان کیا جا رہا تھا اب یزیدؔ کی حیثیت ایک ادنیٰ قیدی کی تھی جو محل کے ایک گوشہ میں بیٹھا اموی سیاست کی ناکامی پر حسرت کے آنسو بہا رہا تھا وہ وہی شامی جو کبھی معاویہ کے جان نثار کہلاتے تھے سید سجادؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر آل رسولؐ کو نذرانہ عقیدت پیش کر رہے تھے۔ شامی عورتیں سیدہ زینبؑ اور سیدہ ام کلثومؑ کے قدم چوم رہی تھیں۔ علیؑ ابن الحسینؑ کی امامت کا آفتاب دمشق میں چمک رہا تھا اور

"واحسیناہ"

کی صداؤں سے بنی امیہ کی باطل پرستی کا اعلان کیا جا رہا تھا معاویہ اور یزیدؔ کے جس محل میں ہمیشہ آل رسولؐ کے خلاف سازشیں ہوتی رہیں اس پر اب آل رسولؐ کا قبضہ تھا جن ایوانوں میں کبھی یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ علیؑ پر سب و شتم کیا جائے انہیں ایوانوں میں آج علیؑ اور آل علیؑ کی تعریفیں ہو رہی تھیں جس راج محل میں قتل حسینؑ کا فیصلہ کیا گیا تھا اسی کے در و دیوار حسینؑ کے نام سے گونج رہے تھے اور جس شام کے لوگ علیؑ حسنؑ اور حسینؑ کی دشمنی کو اپنا ایمان تصور کرتے تھے اسی شام کی آبادی آج آل رسولؐ کے قدموں پر سجدہ ریز تھی آج کوئی شامی یزیدؔ کا حامی نہیں تھا بنی امیہ کا پرستار نہیں تھا آل ابی سفیان کا مدح

خواں نہیں تھا۔ آج سب کی زبانوں پر علیؑ بن الحسینؑ کا نام تھا زینبؑ کا نام تھا ام کلثومؑ کا نام تھا اور اس اعتبار سے اس علیؑ بن ابی طالبؑ کا نام تھا جس سے شامیوں کو برگشتہ رکھنے کے لئے معاویہ نے حدیث سازی قتل و غارت غرض ہر تدبیر استعمال کی تھی بیس سال کے قلیل عرصہ میں زمانہ ایسا بدلا کہ معاویہ کے شاہی محل میں علیؑ کے لال کا ماتم ہونے لگا معاویہ کا جگر بند چوروں کی طرح ایک کمرے میں چھپ کر اشک افشانی پر مجبور ہوا اور علیؑ کے فرزند کے ماتم سے شاہی محل کے در و دیوار ہل گئے یہ فتح مبین کا اعلان تھا اس فتح مبین کا اعلان جس پر کوئی پردہ ڈالا جانا محال ہے۔

یزیدؔ کی جانب سے "خون بہا" کے نام سے جو رقوم حضرت علیؑ بن الحسینؑ کی خدمت میں پیش کی گئی تھیں وہ دراصل وہی تھیں جن کو آج کی اصطلاح میں "تاوان جنگ" کہا جاتا ہے یزیدؔ فاتح ہوتا تو وہ ہرگز تاوان جنگ پیش نہ کرتا بلکہ شاید آل رسولؐ سے تاوان وصول کرتا اس لئے کہ تاوان ہمیشہ مفتوح ادا کرتا ہے فاتح نہیں دیا کرتا' یزیدؔ کا تاوان جنگ پیش کرنا بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی شکست کا اعتراف کر رہا تھا۔

یزیدؔ کے گھر سے آٹھ روز تک مسلسل حسینؑ اور آل رسولؐ کی حقانیت اور کامرانی کا اعلان ہوتا رہا اور جب یہ حقیقت ناقابل انکار حد تک واضح کی جا چکی کہ اس جنگ میں آل رسولؐ کو مکمل اور واضح فتح ہوئی ہے تو تحریک اسلامی کے چوتھے قائد نے یہ فیصلہ کیا کہ اس فتح مبین سے ساری دنیائے اسلام کو آگاہ کر دیا جائے چنانچہ دمشق سے کربلا جانے کا اعلان کیا گیا تاکہ جس عراق کی سرزمین پر آل رسول کو قتل اور قید کیا گیا تھا جہاں اہل بیتؑ کی خواتین گرفتار کی گئی تھیں جہاں عبیداللہ بن زیاد کی ہیبت سے کمزور دل مسلمان اپنے ایمان سے دست کش

ہو جایا کرتے تھے وہاں بھی آلِ رسولؐ کی کامیابی و کامرانی کے پرچم بلند کر دیئے جائیں۔

آلِ رسولؐ کا قافلہ دمشق سے روانہ ہوا اور اس شاہانہ کروفر سے روانہ ہوا کہ آگے آگے پانچ سو آہن پوش محافظ ہاتھوں میں نیزے سنبھالے نگاہیں جھکائے ادب سے رواں ان کی پشت پر زرکار محملوں میں بیبیاں ان کے عقب میں تحریکِ اسلامی کا چوتھا قائد مسلمانوں کا امام رسولؐ کا جانشین علیؑ حسنؑ اور حسینؑ کا دلبند علیؑ ابن الحسینؑ اور آخر میں یزید علیہ اور اس کے ارکانِ سلطنت اپنی شکست اور ناکامی پر ماتم کناں اموی سیاست کی پامالی پر سینہ کوب اسلام کی اس عظیم فتح پر دل ریش۔

یہ کسی گرفتار محن، دل شکستہ مجبور و مقہور شکست خوردہ اور مغلوب انسان کی سواری نہیں تھی۔ یہ ایک فاتح کا جلوس تھا اس فاتح کا جلوس جس نے ایک مجبور قیدی بن کے شام میں زندگی کا ایک سال بسر کیا تھا اور اس قلیل عرصہ میں شام کو ہمیشہ کے لئے "اسلام کا قیدی" بنا دیا تھا۔

ایک ایسے فاتح کا جلوس جو صرف چند بے بس عورتوں اور چند کمزور بچوں کا "لشکر" لے کر اسلام کی لڑائی لڑنے آیا تھا لیکن اس نے ایسا شاندار جہاد کیا کہ ایک عظیم اور ظالم سلطنت اس کے سامنے سربسجود ہو گئی جس نے دنیا کو حق پرستوں کی جنگ کے ایک بالکل نئے انداز کی تعلیم دی۔ تیغ و سناں کے مقابلہ میں اشک و آہ اور ظلم و ستم کے مقابلہ میں مظلومانہ جرأت و استقلال سے کام لینا سکھایا اور جس نے ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے باطل کے شور بے ہنگام کو دبا دینے کے وہ اصول دنیا کو بتلائے جو رہتی دنیا تک انسانیت کے لئے مشعل راہ کا کام دیتے رہیں گے۔

آج نہ وہ شمر تھا جو سید سجادؑ پر کوڑے برساتا تھا نہ وہ خولی تھا جو اپنے نیزے پر سر حسینؑ کی نمائش کرتا تھا نہ وہ عمرو سعد تھا جو سرداری لشکر پر نازاں تھا اور نہ وہ خونخوار سپاہی تھے جو عورتوں پر ستم توڑنے میں پیش پیش تھے۔ یہ سب سرے سے غائب تھے ان میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ سامنے آئیں اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ دنیا ان پر تھوکے گی وہ جنگ بھی ہار چکے تھے اور عزت کی بازی بھی ہار چکے تھے آج وہ ذلیل تھے بدنام تھے حقیر تھے اور دوسرے تو خیر خود یزیدؑ لعین کی نگاہ میں بھی ان کی کوئی وقعت نہیں تھی اس لئے کہ یزید لعین یہ سمجھ رہا تھا کہ بنی امیہ کے مقاصد کی دائمی اور ابدی شکست کو قریب تر لانے کی ذمہ داری میں ان لوگوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے!

قافلہ شاہی محل سے نکل کر بازار میں پہنچا اچانک سید سجادؑ نے قافلہ کو رکنے کا حکم دے دیا اس لئے کہ تحریک اسلامی کے قائد نے چلتے چلتے پھر ایک بار اپنی فتح مبین کا اعلان ضروری سمجھا تھا ہزاروں شامیوں کے مجمع میں سید الساجدینؑ نے تقریر شروع کی وہ تقریر جس میں آپ نے اموی سیاست کو پوری طرح بے نقاب کر ڈالا جس میں آپ نے آل رسولؐ کے مقاصد پوری وضاحت کے ساتھ بیان فرمائے جس میں آپ نے شامیوں کے سابقہ کردار کا تفصیل سے جائزہ لیا اور وہ زلزلہ خیز حقائق بیان فرمائے جنہیں سن کر مجمع میں کہرام مچ گیا ہر آنکھ اشک بار ہو گئی اور ہر گردن ندامت سے جھک گئی ظاہر ہے کہ ایک مجبور قیدی قید زنداں سے چھٹ کر دشمن کے دارالحکومت میں ایسی تقریر کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ سید سجادؑ نے وہ تقریر فرمائی جو ایک ایسا فاتح ہی کر سکتا ہے جس نے دشمن کو اس بری طرح کچل ڈالا ہو کہ اب اسے غنیم کے دوبارہ ابھرنے کا خوف مطلق باقی نہ رہا ہو اور سید سجادؑ ایسا کیوں نہ کرتے؟ ——— اللہ نے ان کے

دست حق پرست پر اسلام کو وہ فتح عظیم عطا فرمائی تھی کہ جو قیامت تک شکست میں تبدیل ہونے والی نہیں تھی آج قریشی مفاد پرست بھی ہار چکے تھے اور منافقین بنی امیہ کی کمر بھی ٹوٹ چکی تھی دین حنیف کے لئے ہر خطرہ ختم ہو چکا تھا۔ خلافت ربانی کے اصول واضح ہو چکے تھے صحابیت کے پردہ میں جو باطل ابھرا تھا اس کا دامن تار تار ہو چکا تھا انسان پر انسان کی حکومت کے جس باطل اصول کو قریش نے صحابیت سے اور بنی امیہ نے تلوار سے نافذ کر دیا تھا آج شکست کیا جا چکا تھا نسلی بادشاہت کو منافی اسلام ثابت کیا جا چکا ہے خلافت کی تقدس اور آبرو بچالی گئی تھی اسلام کے اصول محفوظ کر دیئے گئے تھے۔ ایمان کے آئینہ پر گزشتہ پچاس سال ... میں جو گرد پڑ گئی تھی اسے صاف کیا جا چکا تھا دنیائے اسلام کے بنی امیہ کے اثرات کے ماتحت مرتد یا گمراہ ہو جانے کا خطرہ دور ہو چکا تھا خون حسینؑ اور اشک سجادؑ سے اسلام کی بنیادیں مضبوط ہو چکی تھیں آل رسولؐ سے آئندہ طلب بیعت کا خطرہ ختم ہو چکا تھا قوم کا ضمیر بیدار ہو چکا تھا مظلومیت کی طاقت آشکار ہو چکی تھی انتہائی بے بسی کے عالم میں باطل کی قہرمانی قوتوں کو شکست دینے کے اصول دنیا کو سکھائے جا چکے تھے بنی امیہ نے بادشاہت جاگیرداری اور نسل پرستی کے جو بت تیار کئے تھے وہ پاش پاش کئے جا چکے تھے بادشاہوں کو "الوہیت و ربوبیت" کو ٹھکراتے ہوئے اللہ واحد کی پرستاری کا عملی درس دیا جا چکا تھا تاجوروں کی غلامی کے مقابلہ میں مر جانے اور صرف اللہ کی عبدیت اختیار کرنے کا فرمان سنایا جا چکا تھا۔ صحابیت پر عدالت کے غلاف چڑھا کر اس کی مدد سے باطل کو ابھار دینے کی تدبیریں ناکام بنائی جا چکی تھیں۔ حکومت اور بیت المال کے متعلق اسلام کا نظریہ واضح کیا جا چکا تھا اسلامی قوانین اخلاق کی عملی صورت دنیا کے سامنے پیش کی جا چکی تھیں زیر خنجر نماز ادا کرنے کے آداب

سکھائے جا چکے تھے۔ شریعت اسلامی کی روح کو فنا ہو جانے سے بچا لیا گیا تھا۔ آل رسولؐ کے لئے تعلیم و تبلیغ کی آزادی حاصل کر لی گئی تھی دنیا دار سلاطین کی نام نہاد "خلافت" کے ساتھ مذہب کا تصور وابستہ رہنے کے نتیجہ میں اسلام کی جو بدنامی ہو سکتی تھی اس کا خطرہ دور کر دیا گیا تھا اس لئے کہ اب یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو چکی تھی کہ دنیا داروں کی "خلافت" نری بادشاہت ہے اور اس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اجماع، نامزدگی، شوریٰ اور قہر و غلبہ کے سارے اصول غلط ثابت کر دیئے گئے تھے اس کے لئے جس یزید لعین کی ذات پر اجماع بھی ہوا اور جسے معاویہ کے سے صحابی خلیفہ نے نامزد بھی کیا جس کے لئے اکابر بنی امیہ اور اکابر قریش کا شوریٰ بھی ہوا اور جسے قہر و غلبہ بھی حاصل تھا اس کی "خلافت" جتنی غیر اسلامی تھی وہ قتل حسینؑ اور واقعہ حرہ سے ثابت ہے۔ اجماع، نامزدگی، شوریٰ اور قہر و غلبہ سے بنی ہوئی حکومتوں کی مخالفت جائز، آئینی اور سیرت صحابہ قرار پا گئی تھی اس لئے کہ جہاں ان اصولوں پر قائم شدہ یزیدی حکومت کے خلاف صحابی رسولؐ حسینؑ بن علیؑ نے جنگ کی وہیں مکہ اور مدینہ کے ہزاروں صحابہ و تابعین نے بھی عبداللہ بن زبیر کی سرکردگی میں اس کے خلاف جنگ کر کے یہ واضح کر دیا تھا کہ ان نام نہاد اصولوں کی بنیاد پر بنی ہوئی کسی حکومت کو "مقدس، اسلامی یا الٰہی حکومت" کا درجہ حاصل نہیں ہو جاتا بلکہ یہ اصول تو محض ایک وقتی سیاسی کرشمہ تھے ان کو نہ کوئی دوام حاصل تھا اور نہ تقدس چنانچہ خود صحابہ و تابعین نے ایک ایسی حکومت کو مردود قرار دے دیا جو بیک وقت ان چاروں اصولوں پر قائم تھی یہ آل رسولؐ کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی اور سید سجادؑ کو اس کامیابی کا پورا احساس تھا۔

آج سید سجادؑ اس احساس کامرانی کے ساتھ تقریر کر رہے تھے کہ انہوں

نے شام کو ہمیشہ کے لئے مسلمان بنا لیا ہے اور آل رسولؐ کے لئے وہ ہمہ گیر ہر دلعزیزی اور مرجعیت حاصل کر لی ہے کہ اب آل رسولؐ کو گمنامی کے غار میں پھینک دینے یا مسلمانوں کو اس کی روحانی عظمت کا منکر بنا دینے کی کوئی سازش کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ لوگ آل رسولؐ کے دشمنوں کی "خلافت" بھی مانتے رہیں گے لیکن اس کے باوجود آل رسولؐ کی محبت کو عین ایمان تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے۔ قریشی مفاد پرستوں' بنی امیہ کے منافقوں اور بنی عباس کے عیش پرست سلاطین کو "رضی اللہ عنہ" کا لقب بھی دیتے رہیں گے لیکن پھر بھی آل رسولؐ کی عظمت کے سامنے جھکتے رہیں گے اور فدک کی ضبطی' علیؑ کی خلافت سے علیحدگی' علیؑ و اولاد علیؑ پر سب و شتم' آل رسولؐ کے قتل عام خانوادہ رسالت کی تشہیر' غرض آل رسولؐ کے نام اور ان کی عزت و عظمت کو فنا کر دینے کی جتنی تدابیر اب تک کی گئی تھیں وہ اس بری طرح ناکام ہو چکی ہیں کہ ان کا ذکر تواریخ کی کتابوں میں باقی رہے گا لیکن ان کے اثرات کبھی دیکھنے میں نہیں آئیں گے۔

قافلہ دمشق سے روانہ ہوا اور شام و عراق کی درجنوں بستیوں سے گزرتا ہوا کربلا پہنچا۔ بے شک سید سجادؑ اور خواتین محترم کی یہ خواہش تھی کہ قبر حسینؑ کی زیارت کی جائے لیکن اس عظیم خواہش کے ساتھ ہی عراقیوں کو اور ان کے پڑوس میں ایرانیوں کو آل رسولؐ کی فتح مبین سے باخبر کرنا بھی ضروری تھا۔ آل رسولؐ کا قافلہ کربلا پہنچا۔ سیدانیوں نے اپنے وارثوں کا ماتم کیا اور اس ماتم کے پردے میں بنی امیہ کی ناکامی اور آل رسولؐ کی فتح مبین کا اعلان کیا۔ دنیا نے دیکھا کہ کوفہ میں ابن زیاد بھی موجود ہے۔ قاتلانِ حسینؑ بھی جمع ہیں لیکن آج وہ بے بس ہیں۔ ان پر کھلم کھلا لعنت کی جا رہی ہے۔ ان کے مظالم کا اعلان ہو رہا ہے۔ آل رسولؐ کے سلسلہ میں ان کے گھناؤنے کرتوت عام کئے جا رہے ہیں لیکن آج

نہ ان میں یہ جرات ہے کہ سید سجادؑ کو ٹوک سکیں۔ نہ یہ ہمت ہے کہ سیدانیوں کو دل دوز نوحوں کی شکل میں بنی امیہ پر لعنت برسانے سے روک سکیں اور نہ وہ اس قابل ہیں کہ اسی آل رسولؐ کے سامنے آ سکیں جسے ابھی ایک سال قبل وہ گرفتار کر کے کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام لے گئے تھے۔ عراقیوں نے آل رسولؐ کی قوت و کامرانی کا یہ منظر نہ صرف یہ کہ تعجب کی نگاہوں سے دیکھا بلکہ عبرت کی نگاہوں سے بھی دیکھا۔ اب ان کو معلوم ہوا کہ عبیداللہ بن زیاد اور یزیدؒ، خدا نہیں ہیں جن سے ڈرا جائے یا جن کے ہاتھوں پر غلامی کی بیعت قبول کر لی جائے۔ یہ تو اتنے کمزور ہیں کہ چند بے بس خواتین نے ان کے ایوان اقتدار کو زمین بوس کر دیا اور اس احساس نے ان کے دلوں پر چھائی ہوئی بنی امیہ کی ہیبت ختم کر دی۔ ان کے دبے ہوئے جذبات ابھرنے لگے، ان کی بزدلی کا طلسم ٹوٹ گیا اور وہی کوفہ والے جو عبیداللہ بن زیاد کے ڈر سے مسلم بن عقیل کی بیعت توڑ بیٹھے تھے پہلے توابین کی شکل میں یزیدؒ کے خلاف صف آرا ہوئے اور بعد میں مختار کی قیادت میں انہوں نے اسی عبیداللہ بن زیاد کو کیفرکردار تک پہنچا دیا۔ بزدل عراقی بہادر بن گئے اور وہی لوگ جن کے ضمیر اتنے مردہ ہو چکے تھے کہ ان کی نگاہوں کے سامنے خانوادہ رسالت کی خواتین کی تشہیر ہوئی اور وہ چپ رہے، اتنے جری ہو گئے کہ انہوں نے یزیدؒ اور عبیداللہ بن زیاد کی سیادت و حکمرانی کا خاتمہ کر دیا۔ یہی اثر ایران پر بھی پڑا، تلوار کی طاقت اور فاتحین کے جبر سے مسلمان ہونے والے ایرانی مظلومیت کی اس عظیم فتح اور آل رسولؐ کے حق پرستانہ کردار سے متاثر ہو کر دل سے مسلمان ہو گئے اور جس طرح شام کو دائمی طور پر مسلمان بنا لیا گیا بلکہ آل رسولؐ کا اس شدت سے حامی بنا لیا گیا کہ انہیں ایرانیوں کی شمشیر برقاب نے بنی امیہ کی نسل کو دنیا سے فنا کر دیا اور آج تک ایران آل رسولؐ

کے شیدائیوں سے چھلکتا نظر آ رہا ہے۔

کربلا سے اسلام کا فاتح اعظم اور دین مبین کی تحریک کا چوتھا قائد مدینہ روانہ ہوا۔ اس مدینہ کی جانب جسے حسینؑ کو مجبوراً چھوڑنا پڑا تھا لیکن سید سجادؑ اس شان سے مدینہ میں داخل ہوئے کہ سارے شہر نے استقبال کے لئے آنکھیں بچھا دیں۔ یہ وہی شہر تھا جہاں علیؑ کو آسانی سے خلافت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ جہاں فاطمہؑ کے آنسوؤں کی بھی قدر نہیں کی گئی تھی۔ جہاں قریش کے مفاد پرستوں نے آل رسولؐ کو گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا تھا۔ جہاں سیرت شیخین کے مذاق پر علیؑ کا استحقاق ختم کر دیا گیا جہاں حسنؑ کے جنازے پر تیر برسائے گئے تھے اور جس کی زمین حسینؑ پر تنگ کر دی گئی تھی۔ لیکن آج سارا مدینہ بہتے ہوئے آنسوؤں، دردناک نوحوں، تڑپتے ہوئے کلیجوں اور دل دوز چیخوں سے علیؑ بن الحسینؑ کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ آج نہ یزید کے گورنر میں یہ ہمت تھی کہ وہ حسینؑ کے جگر بند سے بیعت کا مطالبہ کرتا اور نہ مروان میں یہ طاقت تھی کہ وہ حسینؑ کی طرح علیؑ بن الحسینؑ کو قتل کی دھمکی دیتا۔ آل رسولؐ کے دشمن یا تو گھروں میں روپوش تھے اور یا پھر سیاسی مطلع ماحول صاف ہو چکا تھا۔ مدینہ پر علیؑ ابن الحسینؑ کا پرچم فتح لہرا رہا تھا اور وہ مسجد نبویؐ جہاں حسینؑ کے نانا قیصر و کسریٰ کی قسمتوں کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔ حسینؑ حسینؑ کی دردناک آوازوں سے لرز لرز کر دنیا کو آل رسولؐ کی ابدی اور دائمی فتح کا پیغام سنا رہی تھی۔ شاید مسجد کی دیواریں زبان حال سے یہ اعلان کر رہی ہوں کہ "دین کی جنگ ہمیشہ کے لئے جیت لی گئی"۔

انسان پر انسان کی حکومت کے ملعون اور جاہلی تصور کو بے نقاب کر دیا گیا۔

خلافت کے باب میں مسلمانوں کی ساری غلط فہمیوں اور غلط اندیشوں کا

پردہ چاک کر کے اسلام کے صحیح تصور خلافت اور حکومت الٰہیہ کے حقیقی اصولوں کو واضح کر دیا گیا۔

قریش اور بنی امیہ کی سرگرمیوں کے نتیجہ میں دین کے مسخ ہو جانے کا جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا اسے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔

تلوار کی طاقت سے جن علاقوں کو جبراً" مسلمان بنایا گیا تھا ان کو آل رسولؐ کی مظلومیت کا عکس دکھا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے واقعاً" مسلمان بنا لیا گیا۔

مسلمانوں میں یہ تصور عام کر دیا گیا کہ اسلام کی روحانی' مذہبی اور اخلاقی قیادت و سیادت کے حقدار صرف وہ محترم ارکان آل رسولؐ ہیں جو معصوم اور مامور من اللہ ہیں۔

یہ تھی اس عظیم' طویل اور صبر آزما جنگ کی داستان جو رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی شروع ہوئی تھی اور زندان خانہ شام سے اہل بیتؑ کی رہائی پر تمام ہوئی ـــــ جو علیؑ ابن ابی طالبؑ نے شروع کی اور علیؑ ابن الحسینؑ پر ختم ہوئی ـــــ اور جس میں قدم قدم پر آل رسولؐ کو وہ عظیم اور شاندار کامیابیاں نصیب ہوئیں جو ان کے مامور من اللہ قائد اور حکومت ربانی کا امین ہونے کا ایسا شاندار' تابناک اور ناقابل تردید ثبوت ہیں جس پر تاریخ اسلام ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔

معاویہ اور یزید کے پاس دولت تھی۔ بادشاہت تھی' محلات تھے' خزانے تھے' لشکر تھے' دربار کے خوشامدی ٹٹو تھے۔ ظاہری جاہ و جلال تھا' مادری شان و شوکت تھی۔ بیعت کرنے والوں کی اکثریت تھی۔ غرض خالص دنیوی نقطہ نظر سے ان کی طاقت اور قوت ناقابل انکار تھی۔ اس کے مقابلہ میں آل رسولؐ بوریا نشین تھی' مفلس تھی' اس کے پاس نہ خزانے تھے نہ لشکر تھے نہ حمائیتوں کی

کثرت تھی اور نہ دنیوی ساز و سامان لیکن ان دونوں کے ٹکراؤ کا جو نتیجہ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ نتائج کا پتہ چلانے کے لئے دور کیوں جایئے۔ تاریخ کے صفحات کیوں الٹیے' سامنے کی چیزیں دیکھ لیجئے۔ آج دنیا کے لاکھوں مسلمانوں کے ناموں میں علیؑ' حسنؑ اور حسینؑ کا لفظ موجود ہے لیکن کسی مسلمان کا نام معاویہ یا یزید نہیں ہوتا۔ ہر مسلمان کے گھر میں پنج تن پاکؑ کے ناموں کا طغری آویزاں نظر آتا ہے۔ آل ابی سفیان کے نام کوئی دیواروں پر لکھ کر نہیں لگاتا۔ مسلمان جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں تو آل رسولؐ کا واسطہ دیتے ہیں۔ معاویہ اور یزید کے واسطہ سے دعا نہیں مانگتا۔ معاویہ اور یزید کی قبروں کا کوئی نشان نہیں لیکن نجف' کربلا اور البقیع میں ہزاروں زائر دور دور سے جا کر جمع ہوتے ہیں اور ان مشاہد مقدسہ کی زیارت کو اپنے لئے سرمایہ آخرت تصور کرتے ہیں۔

آل رسولؐ کی شان میں عربی' فارسی' ہندی' اردو' ترکی' انگریزی' فرانسیسی غرض دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں میں نظم و نثر کے موتی لٹائے جاتے ہیں اور مسلمان ادباء و شعراء سے قطع نظر غیر مسلم ادیب و شاعر بھی ان کی مدح و توصیف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ لیکن بنی امیہ کے ان سلاطین کا نام آتے ہی ذوق سلیم کی پیشانی پر بل آ جاتے ہیں۔ محرم آتے ہی اسلامی دنیا کے گوشہ گوشہ میں آل رسولؐ کا ذکر چھڑ جاتا ہے اور خوش بیان واعظین آل رسولؐ کی تعریف میں اپنی طاقت لسانی کے جوہر دکھانا شروع کر دیتے ہیں لیکن یزید اور معاویہ کی ولادت اور وفات کی تاریخوں کو یاد رکھنا بھی غیر ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ آل رسولؐ کے ذکر کے لئے دنیا میں ہزاروں عمارتیں امام باڑوں اور عاشور خانوں کے نام سے موجود ہیں لیکن اموی حکمرانوں کے نام سے ایک ٹیلہ بھی موسوم نہیں۔ اردو زبان میں یزید کی شان میں ایک لفظ بھی ملنا محال ہے۔ لیکن اردو کے شعری ادب کا